جلد : ۷، شمارہ : ۱ ، ۲
جنوری - جون : ۲۰۲۰ء

ISSN : 2394-5567
S.No. 19

دبیر

مدیر

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

DABEER January - June 2020 S.No. 19

ISSN : 2394-5567
S.No. 19

Vol.: 7, Issues : 1 & 2
January - June : 2020

DABEER

Editor:-
Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

ISSN:- 2394-5567 S.No. 19

بخوانـدم یکی مرد هندی دبیر سـخن گوی و گوینده و یادگیر (فردوسیؔ)

دبیـــــــــر

(بین الاقوامی پیئر ریویوڈ ریفیر یڈ سہ ماہی ادبی و تحقیقی جریدہ)

شمارہ۔۱،۲ جلد۔۷

جنوری۔جون ۲۰۲۰ء

☆ایڈیٹر☆

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

Mob. no. 09410478973

☆مراسلت کا پتہ☆

دبیر حسن میموریل لائبریری

۱۲۔چودھری محلّہ (جنوبی)، کاکوری، لکھنؤ۔۲۲۶۱۰۱

dabeerpersian@rediffmail.com

☆ریویو کمیٹی☆

پروفیسر آذرمی دخت صفوی، علی گڑھ

پروفیسر شریف حسین قاسمی، دہلی

پروفیسر عبدالقادر جعفری، الہ آباد

پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی، علی گڑھ

پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی، لکھنؤ

پروفیسر طاہرہ وحید عباسی، بھوپال

پروفیسر مظہر آصف، نئی دہلی

☆مجلس ادارت☆

پروفیسر سید حسن عباس، ڈائرکٹر رضا لائبریری، رامپور

پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، ڈائرکٹر آئی پی آر، اے ایم یو علی گڑھ

پروفیسر علیم اشرف خان، صدر شعبۂ فارسی، ڈی یو، دہلی

پروفیسر سید محمد اصغر، صدر شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، صدر شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد

ڈاکٹر محمد عقیل، صدر شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی

ڈاکٹر افتخار احمد، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد کالج، کلکتہ

ڈاکٹر محمد قمر عالم، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ڈاکٹر انجمن بانو صدیقی، شعبہ فارسی، کرامت کالج، لکھنؤ

☆معاون مدیر☆

ڈاکٹر محمد توصیف خان کاکر

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عاطفہ جمال

ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

فہرست مندرجات

	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
۱	اداریہ	ازلان حیدر	۵
۲	دردؔ کاکوروی کی فارسی تاریخ گوئی	ڈاکٹر فرقان علی مخمورؔ کاکوروی	۶
۳	آیۃ اللہ خامنہ ای کی شعری بصیرت	ڈاکٹر سید کلیم اصغر	۱۴
۴	مغل دہلی: تذکرہ وتاریخ کے حوالے سے	ڈاکٹر زرینہ خان	۲۵
۵	فتنہ از دیدگاہ غزلیات حافظؔ	ڈاکٹر یاسر عباس غازی	۳۶
۶	داراشکوہ مذہبی رواداری اور سماجی ہم آہنگی کا نشان امتیاز	ڈاکٹر عبدالواسع	۴۲
۷	غزالیؔ مشہدی: شخصیت وشاعری	ڈاکٹر سعدیہ جعفری	۴۶
۸	فارسی ادب کے سائنسی پہلو: ایک جائزہ	ڈاکٹر ثمینہ امین	۵۶
۹	فارسی ادب پر امام خمینی کے اثرات	یاور عباس میر	۶۰
۱۰	حکیم محمد اکبر ارزانی: حیات وکارنامے	نصرت فاطمہ	۷۱
۱۱	مولانا رومیؔ کی مثنوی معنوی کا عرفانی پہلو	رخسانہ	۸۳
۱۲	شیخ علی حزیںؔ کی ہمہ گیر شخصیت	قمر حیدر	۸۹
۱۳	میر تقی میرؔ کا فارسی دیوان	سید محمد نوید جعفری	۹۷
	شخصیت		
۱۴	سید علی رضا نقوی	پروفیسر ڈاکٹر عارف نوشاہی	۱۱۲
۱۵	انسان دوست: بسمل سعیدیؔ	پروفیسر طاہرہ وحید عباسی	۱۳۳
۱۶	بہار کے فارسی اساتذہ سیریز۔۲		
	فارسی ادب اور اسلامی تاریخ کا حسین امتزاج: ڈاکٹر خواجہ افضل امام	پروفیسر رضوان اللہ آروی	۱۳۸
۱۷	ڈاکٹر زہرہ عرشی اور مثبت انداز فکر	ڈاکٹر مکرم علی	۱۵۰
۱۸	ہونے کو بزم ناز میں سب ہیں ضیاءؔ نہیں	سید محمد ظفر اقبال	۱۵۹
	دکنیات		
۱۹	قطب شاہی سلاطین کے مسکوکات	ڈاکٹر حنا اسحٰق	۱۶۶

میراث خطی

۲۰ ’’بہارستان گلستان‘‘ مصنفہ حکیم وارث علی خان اکبرآبادی۔۔۔ پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی ۱۶۹

چشم بینش

۲۱ شعرالعجم ایک نظر میں پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی ۱۷۴

English Artilces

1	Mirza Muhammad Fakhir Makin Lakhnawi: A Persion Poet Repute	Prof. Abdul Qadir Jafari	3
2	Contribution of Sufi's and development of sufistic thoughts in Indian sub-continent with special reference todeccan India	Dr. Atiqur Rahman	10
3	Sumer Chand's Persian Ramayana	Dr. S. Naqi Abbas (Kaify)	25
4	Early Mughals and the Afghans: Realtionship of twoPowerful forces in India	Sabistan Bano	31
5	Gulbadan Banu Begum: The author of Humayun -Nama	Daud Ibrahim	38
6	Social condition of women during Mughal India	Ms Jinat Rehana	42
7	Allama Shibli Nomani: An Architect of Modern Islamic Education	Syed Hasan Sardar	56
8	Blind Owl of Sadeq Hedayat: A critical study	Nafisa Amin	65
9	History of Aligarh Heritage-2 Muzammil Manzil	Tarique Jameel Ansari	70
10	Majmaul Bahrain: A voice of Hindu Muslim Unity	Bilal Ahmad Sheikh	74

اداریہ

۲۰۲۰ء کے اوائل میں کرونا نام کی وباء نے تقریباً تمام عالم کو اپنی چپیٹ میں لے لیا یہ خاکی جو آسمانوں کے راز جاننے اور نئے جہانوں کی دریافت کرنے کو کوشاں نظر آرہا تھا آن کی آن میں اپنے گھر میں اس طرح محصور ہوا کہ کسی سے مصافحہ کرنا، بات کرنا، گلے ملنا حتیٰ کے تعزیت اور اموات تک میں جانا محال ہوگیا۔ ہزار ہا جانیں چلی گئیں، لاکھوں مریض ہوئے، کاروبار زندگی تقریباً بند ہوگیا، ملکوں کی معاشی حالت ابتر ہوگئی، نچلہ طبقہ کی عوام جس کا کاروبار زندگی اور روزہ مرہ کی ضروریات ہر روز کی کڑی مشقت کے بعد پوری ہوتی تھیں بند ہوگئیں، بھوکمری کی نوبت آ گئی، تمام مدارس، کالج، داشگاہیں بند گئیں اور آخر کار نتیجہ یہی برا آمد ہوا کہ احتیاط سے اس بیماری سے بچا جا سکتا ہے۔ بہرحال دانشگاہوں، کتب خانوں اور ایسی علمی وادبی جگہوں پر قفل لگنے سے ادب کے میدان میں بھی کہیں نہ کہیں کمی ضرور نظر آئی۔ مقالات اور تصانیف کو پایہ تکمیل تک تو پہنچانا پھر بھی آسان تھا مگر اس کی اشاعت ایک اہم مسلہ بن گئی۔

دبیر کے بھی امسال اولین دونوں شمارے (جنوری۔ جون ۲۰۲۰ء) اسی اشاعتی پریشانی کی نظر ہوئے، خداوند کریم کا احسان ہے اب اشاعت عمل میں آئی ہے مگر کبھی کبھی تاخیر میں بہتری کی صورت پیدا ہو جاتی ہے یہ شمارہ اسی بہتری کے ساتھ شائع ہو رہا ہے جس کا بین ثبوت طویل فہرست مقالات میں منفرد تحقیقی مقالات کی شمولیت ہے۔ شمارۂ ہذا میں ۱۱ (گیارہ) مقالات مختلف موضوعات پر شائع ہو رہے ہیں، علاوہ ازیں شخصیات کے باب میں مختلف موضوعات (پروفیسر عارف نوشاہی کا علی رضا نقوی پر، پروفیسر طاہرہ وحید عباسی کا بسمل سعیدی پر، پروفیسر رضوان اللہ آروی کا خواجہ افضل امام پر، ڈاکٹر مکرم علی کا زہرہ عرشی پر اور سید محمد ظفر اقبال کا ضیاء احمد بدایونی) پر مقالات اس شمارے کی اہمیت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اسکے علاوہ دکنیات، میراث خطی اور چشم بینش میں اساتذہ فن نے اپنے مقالات کی شمولیت کا حق دیکر اس گلدستہ کو معطر کر دیا ہے۔ اسی طرح حصۂ انگریزی کے مقالات فاخر مکین، دکن کے صوفیہ کی خدمات، مغل وافغان، مجمع البحرین، مغل دور میں خواتین کا مقام، بوف کور، علامہ شبلی اور مزمل منزل جیسے عناوین پر لکھے ہیں۔ اشاعت میں دیری کے لئے تمام محبان ادب سے معافی کا طلبگار ہوں اور دعاؤں کا بھی خواستگار ہوں کہ پروردگار مجھ سے ادب کے لئے جو خدمات لے رہا ہے اس میں اور تقویت ملے۔

ازلان حیدر

ڈاکٹر فرقان علی مخمورؔ کاکوروی
کاکوری، لکھنؤ

دردؔ کاکوروی کی فارسی تاریخ گوئی

تاریخ گوئی ایک قدیم فن ہے جو فارسی کے ذریعہ اردو میں داخل ہوا، فارسی میں جو سب سے قدیم تاریخ ملتی ہے وہ سامانی عہد کے شاعر ابوشکور بلخی کی درج ذیل تاریخ ہے(۱):

مر ایں داستاں کش بگفت از خیال
ابر سیصد و سی و سہ بود سال

اردو میں تاریخ گوئی کا رواج فارسی کے زیر اثر پیدا ہوا، قدیم اساتذہ نے فن تاریخ گوئی کو بام عروج تک پہنچایا۔ شعرائے اردو نے بڑی تعداد میں فارسی میں بھی تاریخیں نکالی ہیں۔ میر، سودا، غالب، صہبائی اور مومن نے تاریخ گوئی میں اپنی فن کاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس فن کی طرف خصوصی توجہ لکھنؤ میں دی گئی، مصحفی، ناسخ اور ان کے شاگردوں نے اس فن کو بڑی ترقی دی ہے، یہ فن ان کے عہد میں معیاری فن بن چکا تھا۔ مصحفی نے اپنے شاگرد نورالاسلام منتظر کاکوروی کی بھی تاریخ وفات کہی ہے:

سخن سنجی فصیحی منتظر نام
چو در کنج لحد کرد از قضا جائی
ز ہاتف مصحفی پرسید سالش
بگفتہ شاعر شیریں زباں ہائی (۱۲۱۷ھ)

فن تاریخ گوئی کو لکھنؤ میں پروان چڑھنے کے خصوصی مواقع ملے، لکھنؤ میں فن تاریخ گوئی کے عروج اور شعراء کے نزدیک اس کی اہمیت وافادیت کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی رقمطراز ہیں:

''وہ شعراء جن کے سماجی حدود بہت پھیلے ہوئے ہوں اور حلقہ تعارف وسیع ہو اور بالخصوص سوسائٹی پر اثر انداز ہونے والے طبقہ اشراف سے ان کا گہرا رابطہ ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے اہم واقعات کا ان کے لئے تانتا بندھا رہے گا کہ جن میں تاریخ گوئی کے جوہر دکھانے کا برابر اچھا موقع دستیاب ہو۔ کسی کو خلعت ملا، کسی نے انعام پایا، کسی کو مہر عطا ہوئی، کسی کو دربار میں کرسی عنایت ہوگئی، کہیں شادی ہوئی، فرزند تولد ہوا، کوئی بیمار ہوا، کوئی اچھا ہوا، کوئی جاں بحق تسلیم ہوا یا

اگر کہیں کسی بادشاہ کی کی تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی تو یہ اس طرح کے ہزاروں مواقع تاریخ کہنے والوں کے لئے نعمت غیر مترقبہ اور کشادا حوال کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتے تھے(۲)۔''

تاریخ گوئی کا تعلق حروف تہجی کی اس ترتیب سے ہے جو ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ، ضظغ کہلاتی ہے۔حروف تہجی کی اس ترتیب میں اکائی دہائی اور سیکڑے کے حساب سے ہر حرف کے اعداد مقرر ہیں۔خان بہادر مسعود حسین صاحب مولف عندلیب تواریخ نے ان اعداد کو ایک قطعہ میں کس خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے(۳):

ابجد و ہوز و حط تک ہیں اکائی کے حروف
ی سے تا کلمن و سعفص ہیں دہائی کے حروف
قرشت و ثخذ و ضظغ جو بچے اے مسعود
سیکڑوں کے ہیں وہ بے شبہ گنائی کے حروف

تاریخ کہنے والا ان حروف سے بامعنی الفاظ کی تشکیل کرتا ہے، یہ ایک خاص دشوار ریاضیاتی عمل بھی ہے اور اسی کے پہلو بہ پہلو الفاظ کے ذخیرے سے پوری واقفیت اور الفاظ کے برمحل انتخاب کا تقاضا بھی کرتا ہے۔اساتذہ سخن نے اس تکنیک کو کامیابی سے برت کر بہت شاعرانہ تاریخیں بھی کہی ہیں اور کبھی کبھی صرف ضرورت بھر کام چلایا ہے۔تاریخ گوئی کے لئے اشعار کی کوئی تعداد نہیں مقرر ہے۔اکثر ایک شعر یا ایک مصرعے سے بھی مادۂ تاریخ برآمد کیا جاتا ہے۔عام طور پر تاریخی قطعات کم از کم دو شعروں پر مشتمل ہوتے ہیں، دو سے زیادہ اشعار مثلاً پانچ، سات، دس یا اس سے زائد میں بھی قطعہ تاریخ ملتے ہیں۔یہ تاریخ گوئی کا رواج کسی موقع یا کسی واقعہ کو محفوظ کرنے کی غرض سے عام ہوا، عام طور پر مختلف مواقع پر کہے گئے قطعات ملتے ہیں بچہ کی ولادت، تقریب بسم اللہ، یا شادی کے موقع پر تاریخ کہنے کا رواج پڑھے لکھے گھرانوں میں موجود تھا۔

علم وادب کے قدیم مرکز اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ ہونے کی وجہ سے قصبہ کاکوری میں فن تاریخ گوئی کو بڑا فروغ ہوا۔کاکوری کی تاریخی کتابوں اور تذکروں میں کثیر تعداد میں قطعات تاریخ موجود ہیں۔اس زمانہ میں بچوں کا تاریخی نام بھی رکھنے کی رسم تھی، بچہ کی ولادت، تقریب بسم اللہ، رسم کنخدائی کے مواقع پر تاریخی قطعات لکھے جاتے تھے۔عمارتوں، مسجدوں، مندروں، مقبروں، پلوں اور کنوؤں کی تعمیر پر بڑی تعداد میں قطعات تاریخ لکھے گئے ہیں۔اس کے علاوہ کتابوں کی اشاعت پر بھی قطعات تاریخ لکھے جاتے رہے ہیں۔مذکورہ مواقع پر لکھے گئے چند قطعات ملاحظہ فرمائیں۔

مولوی مفتی شہاب الدین ابن حاجی امین الدین کی ولادت ۱۱۹۱ھ میں ہوئی، اس موقع پر قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں ثاقبؔ نے قطعہ تاریخ ولادت کہا(۴):

آں نکو بخت چوں بعرش وجود
جلوہ فرما چوں شہ بہ تخت آمد
سال میلاد آں بلند اقبال
گفت ہاتف سعید بخت آمد (۱۱۹۱ھ)

قطعہ تاریخ تعمیر روضہ شاہ محمد کاظم قلندرؒ از شاہ تراب علی قلندرؒ المتخلص بہ تراب کاکوروی (۵):

خدا بہ لعل محمد جزائی خیر دہد
ز سعی او چو بنا گشت روضۂ پیرش
تراب خوش شد و از بہر یادگاری دہر
بگفت گنبد پرنور سال تعمیرش (۱۲۳۰ھ)

حضرت شاہ کرامت علی قلندر کا روضۂ علامہ محسن کاکوروی نے نہایت خوشنما اور خوبصورت تعمیر کرایا۔ روضہ کے اوپر تعمیر سے متعلق حسب ذیل قطعہ تاریخ کندہ ہے (۶):

مولوی محسن چو بوجہ حسن
ساختہ ایں روضہ پاک ولی
سال بنا گفت سروش از فرید
بارگاہ شاہ کرامت علی (۱۳۰۵ھ)

کاکوری کی بیشتر مساجد کی تعمیر کے وقت قطعات تاریخ شعرا نے کہے، کچھ مسجدوں میں اب بھی کتبے لگے ہیں اور کچھ صرف تذکروں میں محفوظ ہیں۔ قصبہ کاکوری کے چودھری محلّہ میں ساگر تالاب کے کنارے واقع مسجد کو مخدوم شیخ قیام الدین نے تعمیر کرایا تھا اس کو منہدم کر کے ان کے پوتے شیخ عبدالواحد نے ۱۳۱۴ھ میں از سر نو تعمیر کرایا۔ کتبہ مسجد میں لگا ہے (۷):

حامی دیں شیخ عبدالواحد از فضل الہ
مسجد عالی بنا کرد از برائے عابدین
با نیش را در حق تعمیر یا رب ایں ندا
آید از فردوس طبتم فادخلوھا خالدین
گوہر سالش بالماس دعاعا عشق بسفت

یا رب ایں مسجد منور باشد از انوار دین (۱۳۱۴ھ)

کاکوری اور رحمان کھیڑہ کے درمیان بیتا نالے پر راجہ ٹکیت رائے نے پختہ پل تعمیر کرایا تھا۔ پل کے شروع میں کھمبہ ہے ایک قطعہ اس پر کندہ ہے اور کھمبا جو آخر میں ہے قطعہ تاریخ کندہ ہے۔ دونوں کے سن دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پل دو سال کی مدت میں بن کر تیار ہوا۔ دونوں قطعات درج ذیل ہیں (۸):

راجہ ٹکیت رائے فیاض زماں
ساخت بر بیتا پل خوب و قدیم
پیر فکرت از پئے تاریخ گفت
نیک محکم بیں صراۃ مستقیم (۱۲۰۰ھ)

☆ ☆ ☆

ٹکیت رائے مہاراجہ دام دولتہ
چو شد بنا پل ز حسن تدبیرش
شدم زہلہم غیبی چوں سائل تاریخ
بگفت معبر فیض است سال تعمیرش (۱۲۰۲ھ۔ ۱۸۴۵ء)

کاکوری میں تاریخ گوئی کی روایت زمانہ قدیم سے موجود ہے، یہاں کے تقریباً ہر شاعر نے اس فن میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ ان شعراء میں میر نذر علی دردؔ کاکوروی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں درد کاکوروی کا اصل نام محمد مکرم احمد تھا لیکن وہ دنیائے ادب میں میر نذر علی دردؔ کے نام سے مشہور ہوئے۔ میر نذر علی ان کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۱۰ھ برآمد ہوتا ہے (۹)۔ درد کاکوروی کا تعلق کاکوری کے اعلیٰ نسب علوی خاندان سے تھا، ان کو علمی، ادبی اور شعری ذوق وراثت میں ملا تھا ان کے والد حکیم حبیب علی علوی نہ صرف حاذق حکیم، مشہور طبیب اور ماہر وکیل تھے بلکہ ادیب اور شاعر بھی تھے۔ درد صاحب کے چچا حکیم محبّ علی نیرؔ کاکوروی مرزا غالبؔ کے شاگرد تھے۔ خطوط غالب مرتبہ خلیق انجم میں نیرؔ کے نام غالبؔ کے دو خطوط بھی شامل ہیں (۱۰)۔ درد کاکوروی کے دادا حکیم مشتاق علی بھی اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ دردؔ کاکوروی ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں اٹاوہ میں پیدا ہوئے کیونکہ ان کے والد اس زمانہ میں ملازمت کی وجہ سے اٹاوہ میں مقیم تھے۔ دردؔ کاکوری نے ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی حکیم وصی علی وصیؔ سے حاصل کی پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے رامپور چلے گئے، مولانا قاری عبدالستار صاحب کانپوری نے خود بخوشی علم تجوید سے سرفراز کیا (۱۱)۔ اس کے بعد ہردوئی میں مولوی نورالحسن نیر صاحب سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے جس کا ثبوت ان کا

اردو اور فارسی کلام ہے ان کے منظوم ترجمے اور عربی و فارسی الفاظ کا شاعری میں بے ساختہ استعمال بھی ان کی قادرالکلامی کے غماز ہیں، حدیث اور فقہ، منطق اور فلسفہ کا بھی انہیں ماہرانہ علم تھا۔ دردؔ نے ۱۹۲۵ء سے قبل ہی شاعری کا آغاز کر دیا تھا، اس لئے کہ اس سے پہلے کے رسائل میں ان کا کلام شائع ہوا ہے، شروع میں ساغر اور ممتاز تخلص رکھا بعد میں ایک بزرگ کے ارشاد پر دردؔ تخلص اختیار کیا۔ دردؔ کاکوروی نے اپنی زندگی کی آخری سانس بھی اردو شعر و ادب کے لئے وقف کر دی تھی، چونکہ وہ خود صوفی مزاج کے مالک تھے اسی لئے ان کا سارا کلام تصوف کی روشنی میں جھلکتا ہے۔ دردؔ صاحب کو اللہ نے موت بھی آسان دی۔ دردؔ نے ۲۷ جون ۱۹۷۲ کو اپنے تمام کاموں سے فراغت حاصل کی اور عصر کی نماز کے وقت سجدہ کی حالت میں اس دار فانی کو خیر باد کہا۔ دردؔ صاحب کو عزیز آباد کے قبرستان میں دفن کیا گیا (۱۲)۔

دردؔ کاکوروی نے رواج زمانہ کے سے اثر قبول کیا، ان میں غضب کی عالمانہ اور شاعرانہ صلاحتیں موجود تھیں، چونکہ انہوں نے قدیم مشرقی تعلیم کے تمام مرحلے طے کئے تھے اس لئے وہ اصناف سخن کی فنی پہلوؤں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ تاریخ گوئی کے مخصوص فن میں بھی انہوں نے اپنی بھرپور صلاحتیوں کا مظاہرہ کیا ہے اور کثرت سے تاریخی قطعات کہے ہیں، تاریخ گوئی میں ان کے استاد شریف کاکوروی جو یگانہ روزگار تھے انہوں نے اپنے استاد سے بے حد کسب فیض کیا۔ دردؔ نے کثیر تعداد میں تاریخی اشعار کہے ہیں لیکن ان کا ایک بڑا حصہ منظر عام پر نہ آسکا کیونکہ ان کی نگاہ میں یہ کوئی کمال کی بات نہ تھی لیکن اردو میں اب اس فن کے جاننے اور برتنے والوں کی نسل رفتہ رفتہ ختم ہوتی جارہی ہے، دور جدید میں بہت کم شاعر ہیں جو تاریخ گوئی کے دشوار شعری تجربہ کے لائق ہیں۔ دردؔ کاکوروی نے متعدد قطعات تاریخ کہے ہیں جو ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ صرف انہوں نے اپنی کتاب ''بارہ امام'' میں رسول خدا صلعم، حضرت بی بی فاطمہ زہراؑ، خلفائے راشدینؓ اور بارہ اماموں کی تاریخ وفات اپنے ایک ایک شعر میں نظم کی ہے۔ ان کے صرف دو قطعات تاریخ ''جذبات دردؔ'' میں موجود ہیں۔ کچھ قطعات کاکوری اخبار و نیز دوسری کتابوں سے بھی دستیاب ہوگئے ہیں۔ دردؔ نے تقریباً اپنی ہر کتاب کی طباعت کے موقع پر تاریخی قطعات کہے ہیں جو ان کتابوں میں شامل ہیں انہوں نے اردو اور فارسی دونوں میں تاریخ گوئی کی ہے۔ ان کے جو تاریخی قطعات ہیں وہ یا تو کتابوں کی اشاعت کے موقع پر کہے گئے ہیں یا پھر مختلف لوگوں کی وفات کے موقع پر دردؔ کے جو قطعات تاریخ وفات دستیاب ہوئے ہیں وہ حضرت شاہ تقی حیدر قلندرؒ، حضرت شاہ حبیب حیدر قلندرؒ، جناب خسرو کاکوروی، جناب محمد احمد علوی اور جناب اعجاز حسین اعجازؔ کاکوروی کی وفات پر کہے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

قطعہ تاریخ وفات حضرت شاہ حبیب حیدر قلندرؔ (۱۳)

فغاں کہ رحلت نمود ناگہ سلالہ مرشدین اطہر

جناب کاظم، تراب و حیدر تقی و اکبر علی انور
بفکر سال وصال بودم سروش گفتہ بگو مکرم
وصال شاہ حبیب حیدر وصال شاہ حبیب حیدر (۱۳۵۴ھ)

نواب حسین نواز جنگ بہادر منشی معراج الدین خسرؔو کاکوروی اپنے زمانے کے بہترین شاعر تھے، ان کے کلام کا انتخاب چند سال قبل ڈاکٹر مسعود انور علوی نے ''انتخاب کلام خسرو کاکوروی'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ ان کی وفات پر جو قطعہ تاریخ دردؔ کاکوروی نے کہا ہے وہ لوح مزار پر کندہ ہے (۱۴):

حیف آں مرد مخیّر رفتہ
داشت او جملہ صفات خسرو
دردؔ دل گفت ز روئے افسوس
سال تاریخ وفات خسرو (۱۳۵۴ھ)

حضرت مولانا شاہ تقی حیدر قلندرؒ کی وفات پر دردؔ صاحب نے جو قطعہ تاریخ کہا ہے وہ ان کے دوسرے قطعات کے مقابلہ میں خاصا طویل ہے، یہ قطعہ سات اشعار پر مشتمل ہے، ملاحظہ فرمائیں (۱۵):

صد حیف تقی حیدر افسوس مہ انور
از دیدۂ عالمیاں آمد بحجاب اندر
آں پیر طریقت را واللہ جہاں بینم
حیرانم و گریانم ہر لحظہ بخواب اندر
خود رفتہ دراں عالم ہے ہے چہ بتو گویم
بگذاشت دریں عالم مارا بخراب اندر
از شاہ حبیب حق چوں خرقۂ بیعت یافت
فی الجملہ مکمل شد عارف بہ شباب اندر
طغرائے خیال او بیں جذب و کمال او
تاریخ وصال او ہم یافت حساب اندر
مشہود کمال حق شیدائے جمال حق
شاداں بہ وصال حق آمد بہ نقاب اندر

از سال وصال او اے درد سروشے گفت
اکلیل بقا آمد مہرے بہ تراب اندر (۱۳۵۹ھ)

''جذبات درد'' کے مقدمہ میں انہوں نے جن حضرات کا ذکر ضمناً کیا ہے ان میں سے امیر حسن دہلوی، علامہ آزاد بلگرامی اور نورالضیاء الدین نواب ضیا یار جنگ بھی شامل ہیں، ان تینوں کی وفات پر کہے ہوئے قطعات بھی مذکورہ کتاب میں شامل ہوئے ہیں۔ امیر حسن دہلوی پر درد نے ایک مضمون بھی لکھا تھا جو ماہنامہ عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا ہے(۱۶)۔

قطعہ تاریخ امیر حسن دہلوی:

حسن شد او شراب حسن لبریز
چناں شد جان شیریں لذت آمیز
بگفتہ ہاتف غیبی، کہ اے درد
بگو سال، وفات او شکر ریز (۱۲۳۷ھ)

قطعہ تاریخ وفات غلام علی آزاد بلگرامی:

رفت علامۂ زماں افسوس
یعنی حضرت غلام علی آزاد
پس حزیں دور کردہ درد بگفت
گشت از قید عنصری آزاد (۱۲۰۰ھ)

قطعہ تاریخ وفات نورالضیاء الدین نواب ضیاء یار جنگ:

دن تھا منگل کا تو چھبیس محرم کی تھی
ہو گئی رحلت علامہ ضیاء صد افسوس
سال رحلت کے لئے درد یہ رضواں نے کہا
لکھ دو سرمایۂ اوج یرثون الفردوس

دردؔ کاکوروی نے قطعات تاریخ وفات کے علاوہ جو دوسرے تاریخی قطعات کہے ہیں وہ ان کی کتابوں کی طباعت کی تاریخوں پر مشتمل ہیں، درد نے جن کتابوں کی تاریخیں کہی ہیں ان میں شعری مجموعے بھی ہیں اور نثر میں ادبی اور مذہبی کتابیں بھی ہیں۔ انہوں نے ہر کتاب کی طباعت کے موقع پر تاریخی قطعہ کہا ہے۔ تاریخ گوئی میں درد کی مہارت ان

کے علم وفضل کا نتیجہ ہے اور یہ علم وفن قدیم طرز کی تعلیم کا عطیہ ہے جس میں شعروسخن کو بڑے اہتمام سے اس طرح پڑھایا جاتا تھا کہ ان کے تمام فنی محاسن اور لسانی امکانات طالب علم پر روشن ہو جاتے ، یہ تعلیمی نظام اس صدی کی ابتداء تک پوری طرح سلامت رہا اس نے جس نسل کو پیدا کیا تھا وہ بیسویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے بزرگوں کی صف میں داخل ہوگئی تھی اور بیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ تقریباً رخصت ہوگئی۔ دردکاکوروی اسی نسل کے نمائندہ تھے اس لئے تمام اصناف سخن پر ان کو پوری دستگاہ حاصل تھی، تاریخ گوئی بھی ان کے کمالات میں سے ایک کمال تھا، اب برجستہ اور بامعنی تاریخ گوئی کے فن کا رخال خال رہ گئے ہیں ورنہ پہلے تو تمام کتابوں کے تاریخی نام بھی رکھے جاتے تھے۔ اساتذۂ سخن کے دواوین اور کلیات میں خود ان کی یا ان کے شاگردوں کی کہی ہوئی تاریخیں شامل ہوتی تھیں۔ جب چھاپہ خانوں کا رواج ہوا تب بھی کتابوں کی دنیا میں یہ روایت مدتوں برقرار رہی۔ اہم اور غیر اہم کتابوں کے ایسے قدیم ایڈیشن جب دستیاب ہوتے ہیں تو ادب کی تاریخ کو ان سے بڑا فائدہ ہوتا ہے کہ کتاب کا سن اشاعت اور دیگر تفصیلات کا مستند حوالہ مل جاتا ہے اور تحقیق وتنقید میں اس سے بڑی مدد لی جاتی ہے۔

حواشی:

(۱) گلزار، از پروفیسر محمد ولی الحق انصاری، ص۴

(۲) ناسخ، از پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی، ص۲۱۷

(۳) صحیفہ تواریخ، از شاہ کوکب القادری، ص۱۵

(۴) دردکاکوروی حیات اور کارنامے، از ڈاکٹر فرقان علی مخمور کاکوروی، ص۲۴۲

(۵) ایضاً، ص۲۴۲ (۶) ایضاً، ص۲۴۳

(۷) ایضاً، ص۲۴۳ (۸) ایضاً، ۲۴۴

(۹) ایضاً، ص۷۳ (۱۰) ایضاً، ص۷۳

(۱۱) ایضاً، ۹۴ (۱۲) ایضاً، ص۱۲۴

(۱۳) ایضاً، ص۲۴۸

(۱۴) انتخاب کلام خسرو کاکوروی، از ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی، ص۳۳، ۱۹۸۴ء

(۱۵) دردکاکوروی حیات اور کارنامے، از ڈاکٹر فرقان علی مخمور کاکوروی، ص۲۴۹۔۲۵۰

(۱۶) ایضاً، ص۲۵۰۔۲۵۱

(۱۷) ایضاً، ص۲۵۲۔۲۵۳

☆☆☆

ڈاکٹر سید کلیم اصغر
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ فارسی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

آیۃ اللہ خامنہ ای کی شعری بصیرت

آیۃ اللہ خامنہ ای مدظلہ عالی کی شخصیت نہ صرف ایک مجتہد، مرجع وقت، مدبر، مفکر، اور سیاسی شعور تک محدود ہے بلکہ ان تمام خوبیوں اور صفات کے علاوہ وہ ایک عظیم ادیب کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ مختلف مواقع پر آپ کے ادبی محافل ومجالس میں بیانات و خطابات کے درمیان برجستہ اشعار کا پیش کرنا، اور نہ صرف اشعار کا پیش کرنا بلکہ ان پر ناقدانہ نظر ڈالنا خود شعری بصیرت کی دلیل ہے۔ اسی لئے مقالہ کا عنوان ''آیۃ اللہ خامنہ ای کی شعری بصیرت'' انتخاب کیا گیا ہے۔ اس عنوان کے تحت برجستہ اقوال میں زور پیدا کرنے کے لئے موقع کی مناسبت سے شعر کے ذریعہ سامعین کے دلوں میں جوش وولولہ پیدا کرنے کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اشعار کا انتخاب کرنا، قدیمی روایت کے مطابق نثر نگاری میں بھی مضمون کے نچوڑ کو کسی ایک شعر میں بیان کر دینا وغیرہ، اس ذیل میں ان کی تقاریر وتحریر پر ناقدانہ نظر ڈالی جارہی ہے۔

آیۃ اللہ خامنہ ای کو شعر وشاعری کا ذوق بچپن ہی سے تھا اور وہ اس سلسلے میں ادب کے پہلے معلم کی حیثیت سے اپنی مادر گرامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"مادرم خانمی بود بسیار فهمیده، با سواد کتابخوان دارای ذوق شعری وهنری، حافظ شناس، البته نه به معنای علمی، بلکه به معنای مانوس بودن با دیوان حافظ، با قرآن کاملا آشنا بود۔ بعضی از شعرهای حافظ که هنوز یادم هست۔ از شعرهایی است که آن وقت از مادرم شنیدم، از این یک بیت یادم است:

سحر چون خسرو خاور علم در کوهساران زد
به دست مرحمت یارم در امید واران زد(۱)

ترجمہ: میری والدہ گرامی نہایت سمجھدار، پڑھی لکھی، صاحب ذوق اور مطالعہ کرنے والی خاتون تھیں۔ شعر وہنر کا ذوق رکھنے کے علاوہ حافظ شناس بھی تھیں لیکن وہ بہت علمی سطح پر نہیں بلکہ دیوان حافظ سے کافی مانوس تھیں، قرآن کریم سے

پوری طرح آشنا، مجھے آج بھی حافظ کے جوشعر یاد ہیں یہ وہی شعر ہیں جو میں نے اس وقت اپنی مادر گرامی سے سنے تھے۔ ایک بیت یہ ہے:

سحر چون خسرو خاور علم در کوهساران زد
به دست مرحمت یارم در امید واران زد

یہ حقیت ہے کہ اولاد کی تربیت میں سب سے اہم کردار ماں ہی کا ہوتا ہے۔ بچپنے میں جیسی تربیت ماں کے ذریعے کی جاتی ہے وہ آخر تک ذہن و دماغ پر نقش رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیۃ اللہ خامنہ ای کو قرآن فہمی پر مکمل عبور ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کا ذوق ابتدائی زندگی ہی سے رہا ہے۔ انہوں نے بچپن سے ہی ادبی کتابوں کا مطالعہ کرنا اپنا وظیفہ بنالیا تھا۔ لہٰذا ''بررسی سبک ھای ادبی'' کا مطالعہ شروع کیا اور بہت جلد شعر کہنے شروع کر دیئے۔ خامنہ ای نے بچپن میں ایک ڈائری (بیاض) ''سفینۂ غزل'' کے نام سے بھی ترتیب دی تھی جس میں اپنے پسندیدہ اشعار مع تاریخ تحریر کرتے رہتے تھے۔

خامنہ ای کے ذوق شعری کو ''انجمن ادبی فردوسی'' نے کچھ زیادہ پروان چڑھایا۔ یہ ''انجمن ادبی فردوسی'' ۱۳۲۵ش میں مرحوم غلام رضا قدسی کے توسط سے قائم ہوئی۔ مرحوم قدسی اور خامنہ ای آپس میں بہت اچھے دوست تھے۔ دونوں مشہد میں ہونے والی انجمن کے جلسوں میں ایک ساتھ شرکت کرتے۔ خامنہ ای نے انجمن کے توسط سے منعقد ہونے والے جلسوں میں بہت جلد اپنا ایک مقام بنایا جبکہ یہ آپ کا ابتدائی زمانہ تھا۔ یہاں تک کہ اس زمانے کے خراسانی شاعر اس وقت تک شعر نہیں پڑھتے تھے جب تک آقای خامنہ ای کو اپنا کلام دکھا نہ لیں۔ خامنہ ای اوایل عمر ہی سے اشعار کی اصلاح، اس پر ناقدانہ رای دینے لگے تھے۔ شب شعر (مشاعرے) میں پڑھے جانے والے اشعار پر بیساختہ اپنی راے پیش کرتے تھے۔ خامنہ ای کو شعر شناسی اور شعر گویی پر کافی مہارت حاصل تھی ان کو شعر گویی پر پوری طرح دسترس ہونے کے باوجود کسی بھی محفل میں اس وقت تک اپنا کلام پیش نہیں کرتے تھے جب تک خود کو یہ یقین نہ ہو جاتا کہ جو کلام میں پیش کرنے جا رہا ہوں وہ یقیناً گذشتہ کلام سے بہتر ہے۔ یعنی اپنا کلام بھی ناقدانہ نظر ڈالنے کے بعد پیش کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں خود رقمطراز ہیں:

''وقتی کہ شعر خودم را نگاہ می کردم با دید یک نقادی دیدم کہ این شعر مرا راضی نمی کند۔ لذا نمی خواستم آن شعر را بخوانم۔ یعنی اگر شعری بود کہ از شعر آن روز بہتر بود، حتما می خواندم'' (۲)

''انجمن ادبی فردوسی'' کے علاوہ دوسری ادبی انجمن جس سے خامنہ ای کی وابستگی رہی ''انجمن ادبی فرخ'' تھی اس انجمن کے زیر انتظام ہونے والی نشستوں، جلسوں اور مشاعروں میں بھی خامنہ ای مسلسل شریک ہوتے رہے۔ انجمن ادبی

فرخ کے جلسے ہر شب جمعہ مرحوم فرّخ کے گھر پر منعقد ہوتے تھے۔جس کا اعتراف خامنہ ای نیا افغانستان کے صدر حامد کرزای سے ایک ملاقات کے دوران اس طرح کیا ہے:

''درمنزل مرحوم فرخ درمشهد جلسه ای در روز های جمعه تشکیل می شد تا هنگامی که مشهد بودم، روز های جمعه در این انجمن شرکت می کردم۔ در آن مجموعه ادبی یکی دو شاعر برجسته ای افغان، به سبک هندی غزل های بسیار عالی می گفتند۔ این بیت در غزل یکی از آن بود که در منزل فرخ خوانده شد و به یاد من مانده است:

ز بس نازک مزاجم ناز گردون بر نمی دارم
من آن شاخم که نکهت بار سنگینی است بردوشم''(۳)

خامنہ ای سبک ہندی سے کافی حد تک متاثر تھے اور انجمن ادبی فردوسی کے اراکین بھی بیشتر دوستداران سبک ہندی تھے یہی وجہ ہے کہ خامنہ ای کے کلام میں بھی سبک ہندی کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔اور جہاں تک آپ کی شعری بصیرت کا مسئلہ ہے۔جب خامنہ ای اعلیٰ تعلیم کی غرض سے مشہد سے قم تشریف لائے اور یہاں درس میں پوری طرح مشغول ہوگئے۔اس کے باوجود بھی وہ ہفتہ میں ایک دن وقت نکال کر درسی فضا سے نکل کر وادی شعر وشاعری میں غرق ہوجاتے۔قم میں طلبہ کی شعر دوست وشعر فہم جماعت کے ساتھ آقای بہشتی (شفق) وغیرہ کے ساتھ محفل ادبی شعر خوانی برپا کرتے تھے۔یہاں تک کہ جب قید وبند کی زندگی گزار رہے تھے تب بھی زندان میں ہی خامنہ ای نے شب شعر کا انعقاد کیا اور زمستان ۴۱ میں رمضان کے مہینے میں زندان گئے تو وہاں بھی اپنے خوزستانی ساتھیوں کے ہمراہ شعر وشاعری، ادبی سلسلے کو جاری وساری رکھا۔

لیکن جب رژیم پہلوی سے مبارزہ آرایی شروع ہوئی اس وقت آپ ۲۴ سال کے تھے اور اس پندرہ سال یعنی ۴۲ تا ۵۷ کے عرصہ میں مبارزہ آرایی کے علاوہ دوسرا کوئی کام نہیں تھا۔آپ خود لکھتے ہیں:

''وقتی که مبارزه شروع شد، همه چیز زندگی من مبارزه شد واصلا در این ۱۵ سال (۴۲ تا ۵۷) غیر از کار های مبارزاتی کار دیگری نداشتم''(۴)

اس کے بعد ادبی محافل ومجالس میں آپ کی شرکت کم ہوتی گئی۔

محسن مؤمنی شریف، گزارشی کوتاہ از زندگی ادبی حضرت آیۃ اللہ خامنہ ای'' میں آپ کی زندگی کے سلسلے میں اس طرح رقمطراز ہیں:

''از سال ۴۱ به بعد، ابواب بسیار تازه ای در زندگی ما باز شد که قبلا اصلا سابقه نداشت، و

خیلی از کارھای قبلی مان تعطیل شد۔ برای نمونہ من دفتر شعری کہ داشتم و در آن شعری نوشتم، آخرین تاریخش سال ۴۳ است۔ در واقع تا سال ۴۱ ادامہ دارد، بعد کم می شود۔ البتہ با رفقای شاعر ارتباط داشتم۔ ارتباطم با رفقای شاعر منحصر بہ رفقایی مثل مرحوم قدسی و امثال او شد کہ در مقولہ ای ما وارد بودند یعنی بہ کل وضع زندگی ما عوض شد۔'' (۵)

جیسا کہ آپ کی زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے وقت کے ساتھ ساتھ خامنہ ای کو مختلف قسم کی ذمہ داریوں اور مشغولیات نے ادبی زندگی سے دور ہونے پر مجبور کیا۔ خامنہ ای کو سیاسی، دینی، مذہبی نہ جانے کتنی طرح کی ذمہ داریوں نے اپنے جال میں جکڑ لیا۔ اگر ہم موصوف کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں تو کافی وقت درکار ہوگا لیکن اس مختصر مقالہ میں موصوف کے زندگینامہ سے پرہیز کرتے ہوئے ان کی شعری بصیرت پر بحث کی جارہی ہے۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود آج بھی خامنہ ای اہل ادب، سخن شناس اور سخن پرور افراد کی رہنمائی فرما رہے ہیں۔ آج بھی وہ شعراء اور ادباء سے مسلسل رابطہ میں رہتے ہیں۔ دو بار صدر جمہوریہ ایران کے علاوہ اور نہ جانے کتنی ذمہ داریوں کے ہمراہ عرصہ دراز سے رہبر انقلاب اسلامیہ ایران کے پروقار منصب پر فائز ہونے کے باوجود ادبی مطالعہ کے لئے اپنا قیمتی وقت نکال کر اہل ادب کی رہنمائی فرماتے ہیں۔ اتنی مصروف زندگی کے بعد کیا کوئی تصور کرسکتا ہے کہ وہ اپنے ایک شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں سے روزانہ ادبی مطالعہ کے لیے دن کا ایک خاصہ حصہ شعر و ادب، داستان وغیرہ کے مطالعہ کے لیے وقف کرے۔ یہ صرف آیۃ اللہ خامنہ ای کی ذات ہے کہ جنھوں نے نہ صرف فارسی ادب کا مطالعہ کیا بلکہ دنیا کی دیگر زبانوں کے ادب کا مطالعہ کر کے ان کا تطبیقی مطالعہ بھی کیا اور کرتے رہتے ہیں۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا فرد ہو جو اس باوقار عہدے و منصب پر پہنچنے کے بعد اپنی زندگی کا ایک حصہ علم و ادب کی آبیاری میں صرف کرے۔ برسوں سے نیمہ رمضان یعنی امام حسن مجتبیٰؑ کی ولادت کے موقع پر موصوف کے دولت کدہ پر ہونے والی ''شب شعر'' نہایت ہی اہمیت کی حامل ہے۔ اس نورانی محفل میں ایران سے ہزاروں شعراء کے درمیان کچھ شاعروں کا انتخاب عمل میں آتا ہے اور اب تو کئی سال سے بیرون ملک کے شعرا بھی شرکت کرتے ہیں۔ خاکسار کو بھی ۱۰ جون ۲۰۱۷ مطابق ۱۳۵۹/۳/۲۰ اس نورانی محفل میں شرکت کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ نماز مغرب، افطار کے بعد تقریباً چار گھنٹوں تک چلنے والے اس مقاصدے میں خود رہبر معظم انقلاب آیۃ اللہ خامنہ ای نماز مغرب سے اختتام محفل تک حاضر ہی نہیں رہتے ہیں بلکہ شعراء کی اس کثیر تعداد کو کہ جن کو صرف ۲ سے ۵ منٹ تک کا وقت کلام پیش کرنے کے لیے ملتا ہے سنتے ہی نہیں بلکہ ان کے اشعار پر ناقدانہ داد بھی دیتے ہیں۔ فی البدیھہ اصلاح بھی فرماتے ہیں۔ اگر شعر قابل تعریف ہے تو احسنت ھا، آفرین ھا، بارک اللہ وغیرہ الفاظ سے مسکرا کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اور اگر شعر میں کہیں بھی نقص یا وزن وغیرہ کی کمی ہوتی ہے تو فوراً اصلاح کر دیتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں اُن کی

شعری بصیرت کی شاہد ہیں۔اگر نثری دلچسپی پر نظر ڈالیں تو موصوف کی مختلف مواقع پر ادبی تقاریر جو کتابی شکل میں ہم تک پہنچتی ہیں، بہت سودمند ہیں۔خامنہ ای کی تقاریر اپنے موضوع کے دائرے کے اردگرد گھومتی ہیں۔۶ جنوری ۱۹۹۶ کو تہران ایران میں منعقد ہونے والی فارسی اساتذہ کی پہلی انٹرنیشنل کانفرنس کے اختتامیہ کے موقع پر ''زبان فارسی میراث عظیم ما'' کے عنوان سے نہایت عالمانہ اور ادیبانہ گفتگو کرتے ہوئے بہت سے اہم نکات کی طرف اشارہ کیا۔خامنہ ای کی اس تقریر کا ایک اقتباس بطور نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ تقریر خانۂ فرھنگ جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی سے فارسی کے انگلش اردو ترجمہ کے ساتھ سن ۱۹۹۶ء میں شایع ہوئی:

''شعرای بزرگی را میشناسیم کہ بہترین آثارشان را بہ زبان فارسی نہ بہ زبان مادری بیان کردہ اند۔از نظامی گنجوی درطرف غرب وامیرخسرو دھلوی وحسن دھلوی درشبہ قارہ بگیرید تا در دوران بعداز آن درشبہ قارہ شعرایی مثل فیضی دکنی و نیز مثل صائب تبریزی و یا اقبال لاھوری و در این اواخر، مثل مرحوم استاد شھر یار کہ بیشترین و شاید بھترین شعرخود را بہ زبان فارسی سرودہ اند، 'بھترین' را بہ طور قاطع عرض نمی کنیم ؛ بہ خاطر آن کہ بعضی از اشعار زبان ترکی اوفوق العادہ است۔ ھمۂ اینھا نشان دھندۂ جاذبہ ھای فراوان زبان فارسی است۔''(۶)

سیمنار، کانفرس یا مختلف ادبی محافل میں اولین و آخرین خطاب کے عنوان سے ادبی بیانات ہی سیمنار یا ادبی محافل کی کامیابی کے ضمانت ہوتے ہیں۔ اور یہ تقاریر اور بیانات جب کتابی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں تو وہ ایک ادبی دستاویزی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ان تقاریر میں ان نکات کی طرف توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔جس طرف عام قاری کا ذہن جلدی متوجہ نہیں ہوتا اور یہ تمام تقاریر خامنہ ای کو ایک اچھے ادیب کی صف میں لاکر کھڑا کرتی ہیں۔خامنہ ای کا اپنی تقاریر کے دوران موقع کی مناسبت سے اشعار پیش کرنا ان کی بصیرت شعری کے علاوہ ناقدانہ صلاحیتوں کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔

لبنان کے ایک نیوز چینل ''المیادین'' نے ''زہرا دیرانی'' کے حوالہ سے آیۃ اللہ خامنہ ای کی ادبی زندگی سے متعلق بتایا اور لکھا جس کو ایرنا، تہران نے 'المیادین' کے حوالے سے اس طرح بیان کیا:

''درگزارشی پیرامون شخصیت ادبی آیۃ اللہ سید علی خامنہ ای رہبر معظم انقلاب اسلامی نوشت کہ ایشان برخلاف دیگر رہبران سیاسی جہان ادیب، شاعر و ناقد است۔''(۷)

دنیا کہ دیگر سیاسی رہبران جہان کے مقابلے آیۃ اللہ خامنہ ای ادیب شاعر اور ناقد کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔

رضا اسماعیلی جن کا شمار دور حاضر کہ مشہور شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ آیۃ اللہ خامنہ ای کو ایک بہترین ادیب، مستند عالم اور صاحب تالیفات، علمی وفرھنگی سے اس طرح یاد کرتے ہیں:

''برای جامعہ ہنری وادبی ما باعث مباھات وافتخار است کہ رہبر نظام مقدس جمہوری اسلامی شخصیتی عالم، ہنرمند، ادیب وصاحب تالیفات علمی وفرھنگی فراوان است۔شخصیت بی بدیلی کہ بیش ازھر نویسندہ وشاعری برھنر وادبیات احاطہ واشراف دارد وبیش از ہر شاعر ونویسندہ حرفہ ای رمان وداستان شعر خواندہ است۔'' (۸)

رضا اسماعیلی آیۃ اللہ خامنہ ای کو جہاں ایک بہترین ادیب، باعمل عالم سے تعبیر کرتے ہوئے اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہمارا رہبر وہ ہے جو نہ صرف رہبری کے فرائض انجام دیتا ہے بلکہ وہ شاعر، عالم، ادیب ہونے کے ساتھ اس طرح مطالعہ میں غرق رہتا ہے کہ کسی بھی نامور ادیب یا شاعر کا مطالعہ اتنا نہیں ہوگا جتنا کہ رہبر انقلاب کا مطالعہ ہے چاہے وہ شعری میدان ہو یعنی نظم یا نثری یعنی داستان وناول وغیرہ۔

خامنہ ای کی اب تک متعدد کتابیں، دینی، مذہبی، علمی وفرھنگی موضوعات پر شایع ہوچکی ہیں۔ترجمہ کے سلسلے میں بھی موصوف کے گرانقدر آثار موجود ہیں۔ غالبًا ابھی تک مجموعہ شعری زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا، اگر ہوا ہو تو بندہ کے علم میں نہیں، ہاں بعض رسائل وجراید مثلا کیھان فرھنگی وغیرہ میں شعر شایع ہوتے رہے ہیں۔آیۃ اللہ خمینی کا دیوان ان کی وفات کے بعد شایع ہوا جبکہ زندگی میں غالبا ان کے اشعار رسائل وجرائد میں شایع نہیں ہوئے۔لیکن آیۃ اللہ خامنہ ای کے اشعار برابر شایع ہوتے رہے ہیں جیسا کہ تحریر کیا جاچکا ہے۔خامنہ ای سبک ہندی سے بہت متاثر ہیں۔یہی وجہ ہے کہ موصوف کو سبک ہندی سے کافی دلچسپی ہے۔سبک ہندی کی وہ تمام خوبیاں جن کی وجہ سے سبک ہندی مشہور ہے۔خامنہ ای کے کلام میں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ناچیز کو خامنہ ای کی کچھ غزلوں کا مطالعہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔غزلیات کے مطالعہ کے دوران ایک غزل ''غمگساری یاران'' کے عنوان سے دیکھنے کو ملی جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل سبک ہندی کی خصوصیات سے لبریز ہے۔غزل اس طرح ہے۔

ز آہ سینہ سوزان ترانہ میسازم — چونی زمایہ ی جان این فسانہ میسازم
بہ غم گساری یاران چو شمع میسوزم — برای اشک دمادم بہانہ میسازم
پرنسیم بہ خوناب اشک میشویم — پیامی از دل خونین روانہ میسازم
نمی کنم دل از این عرصہ ی شقایق فام — کنار لالہ رخان آشیانہ میسازم
در آستان بہ خون خفتگان وادی عشق — برون ز عالم اسباب خانہ میسازم

چوشمع بر سر ہر کشتہ می گذارم جان ز یک شرارہ ہزاران زبانہ میسازم
ز پارہ ہای دل من شلمچہ رنگین است سخن چو بلبل از آن عاشقانہ میسازم
سر و تن و دل و جان را بہ خاک می فکنم برای قبر تو چندین نشانہ میسازم
کشم بہ لجہ شوریدگی بساط (امین) کنون کہ رخت سفر چون کرانہ میسازم(۹)

اگر ہم اس غزل کے شروع کے دوشعر ہی دیکھیں تو سبک ہندی کی خصوصیات کا اندازہ انہیں دوشعر سے ہو جائے گا۔سبک ہندی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ بات کو گھما پھرا کر پیش کرنا۔مثال کے طور پر''آہ سینہ سوزان''دل سلگنا، یہ دل سلگنا سبک ہندی کی ترکیب ہے۔ یا مایہ جان یہ بھی سبک ہندی کی ترکیب ہے۔''غمگساری یاران'' سبک ہندی میں غمگساری کے معنی ستم کے ظلم ڈھانے کے ہیں۔جبکہ غمگساری کا مطلب کسی کو اپنا بنانا اور دوستی وغیرہ ہیں۔یہاں ظلم وستم کے معنی میں استعمال ہو رہے ہیں۔جو سبک ہندی کی خصوصیت ہے۔اس طرح''اشک دمادم'' وغیرہ۔اگر پوری غزل کا بغور مطالعہ کرینگے تو سبک ہندی کی تمام تراکیب وخصوصیات دیکھنے کو ملیں گی۔

خامنہ ای کی ایک بہت مشہور غزل حضرت آیۃ اللہ خمینی رہبر اول انقلاب اسلامی ایران کے جواب میں تحریر کی گئی ہے۔آیۃ اللہ خمینی، آیۃ اللہ خامنہ ای کے پیشرو اور بانی انقلاب اسلامی ایران تھے، امام خمینی کا مطلع ہے:

من بہ خال لبت ای دوست گرفتار شدم چشم بیمار تو را دیدم و بیمار شدم

خامنہ ای کا مطلع ہے:

تو کہ خود خال لبی از چہ گرفتار شدی تو طبیب ہمہ ای از چہ تو بیمار شدی

اس شعر میں امام خمینیؒ نے ردیف میں واحد متکلم (اول شخص مفرد) کا صیغہ استعمال کیا ہے کیونکہ وہ خود اس منزل پر تھے کہ تمام لوگوں کی نگاہیں انہیں پر مرکوز تھیں اور وہ نجات دہندہ کی شکل میں دیکھے جا رہے تھے۔اور یہ بات صحیح ثابت ہوئی کہ انہوں نے ملت ایران کو نجات دلائی بھی۔لیکن اسی قافیہ ردیف اور بحر میں خامنہ ای نے واحد حاضر (دوم شخص مفرد) کی بات کی ہے:

تو کہ خود خال لبی از چہ گرفتار شدی تو طبیب ہمہ ای از چہ تو بیمار شدی

کیوں کہ اب آزادی مل چکی ہے اور اب آپ امام خمینیؒ کے جانشین کے طور دیکھے جا رہے ہیں اس لئے انہوں نے ''من'' کی جگہ''تو'' کا استعمال کر کے یعنی''خال لبت'' کی جگہ''خال لبی'' گرفتار کے ساتھ جو فعل کا استعمال کیا ہے وہ شدم کی جگہ شدی یعنی اول شخص کو دوم شخص کی شکل میں دیکھا جا رہا ہے۔ جہاں آیۃ اللہ خمینیؒ نے تیری بیمار آنکھ کی بات کی تھی وہیں آیۃ اللہ خامنہ ای ایک کامیاب طبیب کی شکل میں دیکھتے ہوئے بیماری پر حیران رہ جانے کی بات کر رہے ہیں۔کیوں کہ

آج کی آزادی جس دور سے گزر رہی ہے اور استعماری طاقتیں اس کو ختم کرنے کی کوششیں کر رہی ہیں۔اس کے باوجود قوم آزاد ہے۔یہی فرق ہے اس وقت کی بات اور آج کی بات میں جس کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں آیۃ اللہ خمینی اور آیۃ اللہ خامنہ ای دونوں کی غزلیں نذر قارئین کی جا رہی ہیں تا کہ دونوں کا فرق واضح ہو سکے۔

آیۃ اللہ خمینی کی غزل:

من بہ خال لبت ای دوست گرفتار شدم　　چشم بیمار تو را دیدم و بیمار شدم
فارغ از خود شدم و کوس انا الحق بزدم　　ہمچو منصور خریدار سر دار شدم
غم دلدار فکندہ است بہ جانم، شرری　　کہ بہ جان آمدم و شہرہ بازار شدم
درِ میخانہ گشایید بہرویم، شب و روز　　کہ من از مسجد و از مدرسہ، بیزار شدم
جامہ زہد و ریا کندم و بر تن کردم　　خرقہ پیر خراباتی و ہشیار شدم
واعظ شہر کہ از پند خود آزارم داد　　از دم رند میآلودہ مددکار شدم
بگذارید کہ از بتکدہ یادی بکنم　　من کہ با دست بت میکدہ بیدار شدم(۱۰)

آیۃ اللہ خامنہ ای کی غزل:

تو کہ خود خال لبی از چہ گرفتار شدی　　تو طبیب ہمۂ ای از چہ تو بیمار شدی
تو کہ فارغ شدہ بودی ز ہمہ کان و مکان　　دار منصور بریدی ہمہ تندار شدی
عشق معشوق و غم دوست بزد بر تو شرر　　ای کہ در قول و عمل شہرہ بازار شدی
مسجد و مدرسہ را روح و روان بخشیدی　　وہ کہ بر مسجدیان نقطہ پرگار شدی
خرقہ پیر خراباتی ما سیرہ توست　　امت از گفتہ دربار تو ہشیار شدی
واعظ شہر ہمہ عمر بزد لاف منی　　دم عیسی مسیح از تو پدیدار شدی
یادی از ما بنما ای شدہ آسودہ ز غم　　ببریدی ز ہمہ خلق و بہ حق یار شدی(۱۱)

انتظار (ظہور) ایک ایسا موضوع ہے جس پر فارسی ادب میں بیشتر شعراء، خواہ قدیمی ہوں یا جدید، قبل از انقلاب اسلامی ہو یا بعد از انقلاب اسلامی سب نے طبع آزمائی کی۔ حافظ، سعدی، مولوی سے لے کر انقلاب سے پہلے کے شعراء نے کہیں نہ کہیں شعر تحریر کیے۔ انقلاب اسلامی کے بعد کے تقریبا تمام ہی شعراء کے یہاں اس موضوع پر شعر نظر آئینگے۔ آیۃ اللہ خامنہ ای نے اس موضوع پر خاصی توجہ دی۔ انتظار (ظہور) خود آیۃ اللہ خمینی کا بھی اہم موضوع رہا لیکن خامنہ ای اپنے اس موضوع کی بنا پر نمایاں شناخت کے حامل ہیں اور صرف اشعار ہی میں نہیں بلکہ تقاریر میں بھی اس موضوع پر خاص

توجہ دیتے رہے ہیں۔ خامنہ ای نے پندرہ شعبان کی مناسبت سے ۱۷/اگست ۲۰۰۸ء کو اپنے ایک خطاب میں انتظار کے معنی ومفہوم کی طرف کچھ اس طرح اشارہ کیا:

''انتظار حرکت ہے، انتظار آمادگی ہے، اس آمادگی کو ہمیں اپنے وجود اور خود سے متعلق ماحول میں محفوظ رکھنا چاہیے۔ یہ ہے فرج کے انتظار کا مطلب، انتظار فرج یعنی کمر بستہ ہونا، آمادہ ہونا خود کو اس مقصد کے لیے آمادہ کرنا کہ جس مقصد کے لیے امام زمانہ علیہ السلام قیام برپا کریں گے۔ وہ عظیم تاریخی قیام وانقلاب اس مقصد کے حصول کے لیے انجام پائے گا جو عدل وانصاف انسانی زندگی، الٰہی زندگی، خدایی عبودیت کے لیے ہوگا، یہ ہے انتظار فرج کا مطلب۔'' (۱۲)

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ انتظار آیۃ اللہ خامنہ ای کا پسندیدہ موضوع ہے اگر یہ عرض کیا جائے تو شاید غلط نہ ہو شعری دنیا میں آپ کے انتظار کے موضوع پر کہے گئے اشعار کی وجہ سے اس مضمون کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں خامنہ ای کی مشہور غزل جو زبان زد خاص وعام ہے۔ ''یاران خراسانی خویشم'' کے عنوان سے ہے۔ خامنہ ای کی یہ غزل فارسی شعری دنیا میں غیر معمولی شہرت کی حامل ہے۔

سرخوش زسبوی غم پنہانی خویشم — چون زلف تو سرگرم پریشانی خویشم
در بزم وصال تو نگویم زکم وبیش — چون آیینہ خوکردہ بہ حیرانی خویشم
لب باز نکردم بہ خروشی و فغانی — من محرم راز دل طوفانی خویشم
یک چند پشیمان شدم از رندی و مستی — عمریست پشیمان ز پشیمانی خویشم
از شوق شکر خندہ لبش جان نسپردم — شرمندہ جانان زگران جانی خویشم
بشکستہ تر از خویش ندیدم بہ ہمہ عمر — افسردہ دل ازخویشم وزندانی خویشم
ہر چند امین بستہ دنیا نیم اما — دلبستہ یاران خراسانی خویشم (۱۳)

خامنہ ای کی اس غزل کو چند ناقدین ادب نے امام زمانہ کے انتظار کے سلسلے میں نہ بتا کر لفظ 'یاران خراسانی' سے ان کے خراسانی دوستوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ غزل خامنہ ای نے اپنے خراسانی دوستوں کے سلسلے میں لکھی ہے لیکن انہوں نے کوئی سند پیش نہیں کی جبکہ ایسا نہیں بلکہ یہ خامنہ ای کی انتظار (ظہور) کے موضوع پر کہی جانے والی بہترین غزلوں میں سے ایک ہے۔ 'در بزم وصال تو' و 'حیرانی خویشم' کی ضرورت دوستوں کے لیے نہیں ہوتی۔ بلکہ کسی ایسی شخصیت کے لیے ہوتی ہے جس سے ملاقات کی تمنا ہو لیکن وصل ممکن نہ ہو یا نہایت محنت، سماجت اور دعاؤں کے بعد حاصل ہو۔ مقالہ کی طوالت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کے ہر ایک شعر کی الگ الگ تشریح کی جائے۔ مختصر یہ کہ ان

اشعار میں شاعر اپنے غائب معشوق کی یاد میں پریشان نظر آتا ہے۔اور وصال کا طلبگار رہے۔''یاران خراسانی'' کے علاوہ ظہورامام زمانہؑ سے متعلق ایک اور غزل میں خامنہ ای نے دیدارامام زمانؑ میں اپنی تڑپ کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

خورشید من برآی کہ وقت دمیدن است

یہ غزل بھی خامنہ ای کی بہترین غزلوں میں شمار کی جاتی ہے۔

دل را ز بی خودی سر از خود رمیدن است — جان را ہوای از قفس تن پریدن است
از بیم مرگ نیست کہ سردادہ ام فغان — بانگ جرس زشوق بہ منزل رسیدن است
دستم نمی رسد کہ دل از سینہ برکنم — باری علاج شُکر گریبان دریدن است
شامم سیہ تر است ز گیسوی سرکشت — خورشید من برآی کہ وقت دمیدن است
سوی تو ای خلاصہ گلزار زندگی — مرغ نگہ در آرزوی پرکشیدن است
بگرفت آب و رنگ زفیض حضور تو — ہرگل دراین چمن کہ سزاوار دیدن است
با اہل درد شرح غم خود نمی کنم — تقدیر قصہ دل من ناشنیدن است
آن را کہ لب بہ جام ہوس گشت آشنا — روزی ''امین'' سزا لب حسرت گزیدن است(۱۴)

آٹھ اشعار پر مشتمل اس غزل سے خامنہ ای کا ظہورامامؑ کے انتظار کی تڑپ کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔کتنی تڑپ اور حسرت دیدارامام زمانہ کی ہے۔لکھتے ہیں:

دستم نمی رسد کہ دل از سینہ برکنم — آری علاج شکر گریبان دریدن است

میرے ہاتھ نہیں پہنچتا کہ میں اپنے دل کو سینے سے نکال لوں،شکر کا علاج صرف وصرف گریبان چاک کرنا ہے۔ یعنی میں اتنا بے قرار ہوں کہ اگر شکر بھی بجالاوں تو گریبان چاک کرکے۔اسی طرح ذیل کے شعر میں دیدار معشوق میں تڑپ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

شامم سیہ تر است ز گیسوی سرکشت — خورشید من برآی کہ وقت دمیدن است

اسی طرح انتظار سے متعلق اور بھی اشعار ملتے ہیں جس کے مطالعہ سے نزدیکی ظہورامام زمان کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔خامنہ ای نے شروع میں نسیم تخلص اختیار کیا اور بعد میں 'امین' کے نام سے شہرت پائی۔

آخر میں خلاصہ کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ خامنہ ای کو شعرگویی اور شعرفہمی پر یکساں مہارت حاصل ہے۔عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے اگر کوئی شاعر ہے تو ضروری نہیں ہے شعرفہمی میں بھی ملکہ حاصل ہو اور کوئی شعرفہمی میں اچھا ہو تو ضروری نہیں بہترین شاعر ہو۔لیکن خامنہ ای کی یہاں یہ دونوں صفات یعنی شعرگویی اور شعرفہمی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ یہ بات

پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر حالات اور ذمہ داریوں نے خامنہ ای کو اجازت دی ہوتی بلاشبہ وہ فارسی ادب کے آسمان پر بالخصوص انقلاب اسلامیہ اور اس کے بعد کے شعراء کی فہرست میں تابندہ ستارہ کے مانند صف اول میں نظر آتے۔

حواشی و مآخذ:

(۱) www.entekhab.ir

(۲) گفت وشنود وصمیمانہ رہبر انقلاب با گروہ از جوانان ونو جوانان ۱۴/۱۱/۱۳۷۶، نقل از www.entekhab.ir

(۳) بیانات رہبر انقلاب در دیدار حامد کرزائی، رئیس جمہور موقعت افغانستان ۲۸/۰۳/۱۳۸۲ نقل از www.entekhab.ir

(۴) www.entekhab.ir

(۵) گزارشی کوتاہ از زندگی ادبی حضرت آیۃ اللہ خامنہ ای www.entekhab.ir

(۶) زبان فارسی میراث عظیم ما، ص: ۳-۴ متن سخرانی رہبر معظم انقلاب اسلامی حضرت آیۃ اللہ العظمی سید علی خامنہ ای، با ترجمہ اردو و انگلیسی، خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، دھلی نو ۱۳۷۵/ ۱۹۹۶

(۷) www.irna.ir

(۸) www.iranintl.com

(۹) Shamimeyaar.blogfa.com

(۱۰) دیوان امام سرودہ ھای حضرت امام خمینی، ص: ۱۴۳، موسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینیؒ، چاپ ۱۸، پائیز ۱۳۷۷، تھران، ایران

(۱۱) www.tasnimnews.com

(۱۲) کلام رہنما، حضرت آیۃ اللہ العظمی سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی کے بیانات کا مجموعہ، ص: ۲۲۲-۲۲۳، ترتیب حجۃ الاسلام والمسلمین جناب علی خالق پور، ترجمہ حجۃ الاسلام مولانا سید نذر امام نقوی، بار دوم ولایت فاؤنڈیشن، دہلی، ہند، ۲۰۱۶

(۱۳) www.iribnews/khamene.ir

☆☆☆

ڈاکٹر زرینہ خان
اسسٹنٹ پروفیسر (فارسی)
ویمنس کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مغل دہلی: تذکرہ و تاریخ کے حوالے سے

چکیدہ: دہلی کی تاریخی اہمیت ہر زمانے میں مسلم رہی ہے۔ اس کی مرکزی حیثیت دارالحکومت کی رہی ہے۔ مملوک سلاطین کے زمانے میں اور اس سے پہلے بھی اور بعد میں مغلوں کے دور میں یہ شہر ہندوستان کا دل تھا۔ تذکروں اور تاریخوں میں اس شہر کی تاریخ، یہاں کی آب و ہوا، علم و ہنر کے پیشے و صنعتوں اور مشاہیر کا ذکر ملتا ہے۔ یہ شہر ہمیشہ دانشوروں، علماء دین اور اولیاء کرام کا مسکن رہا ہے۔ زیر نظر مقالے میں دہلی کی تاریخی اور ادبی حیثیت کو تذکرہ و تاریخ کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ : قطب الدین ایبک، نظام الدین اولیاء، امیر خسرو، سلطان محمد تغلق، شیخ جمالی، ہمایوں بادشاہ شیخ فیضی

دہلی شہر اپنی آب و ہوا، خوشنما باغ اور دشت کے لئے دیگر ہندوستان کے تمام شہروں سے جداگانہ ہے۔ ہمیشہ یہ شہر عظیم سلاطین کا دارالملک، مرکز دایرۂ اسلام اور نامور علماء و فضلاء کامل اور فصحائے کامل کا مسکن رہا ہے۔ بیت:

حضرت ۱ دہلی کنف ۲ دین و داد جنت عدن ۳ است کہ آباد باد

دورش از آنگاہ کہ برکارشد دایرۂ چرخ زیر کا رشد ۴

ہندوستان میں لکھی گئی تواریخ میں مذکور ہے کہ شہر دہلی ایک زمانے میں بہت آباد تھا۔ لیکن بعد میں ویران ہو گیا اور وحشی جانوروں کا مسکن بن گیا۔

۳۰۴ھ میں دوبارہ آباد ہوا۔ ۵ تقریباً (۳۰۰) تین سو سال تک نہایت کامیاب و کامران رہا نہایت آباد، با رونق اور ترقی یافتہ رہا ہے ۵۸۸ھ میں سلطان قطب الدین ایبک، غلامِ سلطان معز الدین سام جو شہاب الدین غوری کے نام سے مشہور ہوا، نے فتح کیا اور اس زمانے سے آج تک ہندوستان کے لوگوں نے کسی دوسرے کے قبضے میں نہیں دیا۔ ہمیشہ سلاطین اسلام کے تصرف میں رہا۔ قدیم دہلی جو گذشتہ زمانے میں آباد اور با رونق تھی آج ویران اور برباد ہے۔ وہاں کی عمارتوں میں مسجد جو باقی ہے، اس میں ہزار ستون ہیں (یا ہزار ستون پر کھڑی ہے) اس مسجد کی شہرت کا سبب یہ ہے

کہ یہاں تین سو ولی واولیاء اور صاحب ارشاد وہدایت نے اس مسجد میں نماز ادا کی تھی۔ اس مسجد کے باہر ایک منارہ ہے جس کی بلندی اتنی ہے کہ کسی میں قدرت نہیں کہ وہ اس کی اونچائی تک پہونچ سکے۔

اس کی مینار کا رقبہ ایک گروہ کی پیمایش کے مطابق اسّی (۸۰) قدم ہے اور اس کی اونچائی ایک سوتیس (۱۳۰) گز ہے۔

بیت:

شکل منارہ جو ستونی زسنگ　　از پی سقف فلک شیشہ رنگ
تاسرش ازاوج بگردون بتافت　　گنبدبی سنگ فلک سنگ یافت
ماہ نخسپد ھمہ شب تا سحر　　گر سرشختش حلہ دارد ببر ۶

نئ دہلی پرانی دہلی سے تین میل کے فاصلے پر دریائے جمنا کے کنارے واقع ہے۔ ۶۸۸ھ میں سلطان جلال الدین خلجی نے اسکی بنیاد رکھی تھی۔ یہ شہر نہایت خوشگوار آب وہوا اور لطافت وصفائی رکھتا ہے۔ بیت:

گرشنود رقصہ این بوستان　　مکہ شود طایف ہندوستان ۷

اس شہر میں اتنے سرسبز وشاداب باغات جنت نشان، اور عالی شان محل مانند خورنق ۸ (بہرام گور کے لئے نعمان بن منذر کا بنایا ہوا ایک عالیشان محل)، بنے ہوئے ہیں کہ قلم انکی شان وشوکت اور خوبصورتی بیان کرنے سے عاجز وقاصر ہے۔ یہاں جنت آشیانی ہمایوں بادشاہ نے ایک عمارت بنوائی جو اس قدر زیبا او عالی شان ہے کہ اس زمانے میں ایسی عمارت کہیں اور نہیں بنی۔ بیت:

ہر کہ میخواہد کہ بیند شکل فردوس برین　　گو بیا این قصر واین باغِ ہمایوں را بہ بین ۹

جیسا کہ ہم جانتے ہیں دہلی ہمیشہ سے اولیاء واتقیاء کی سرزمین رہی ہے۔ ہر دور میں اسکی عمر طویل رہی اور اختتام وحشت ناک رہا ہے۔ یہ اولیاء اسی خاک کا پیوند ہوئے۔ یہاں کتنی ہی عمارتیں بلند وبالا اور فلک بوس تعمیر ہوئیں ہیں کہ جو تعدادِ شمار سے باہر ہیں یعنی بے شمار ہیں۔ بیت:

ہمہ شہر بستان ہمہ کوی جوی　　بہر برزنی رامش ورنگبوی ۱۰

شہر کے باہر ایک عمارت ہے جو شکارگاہ سلطان فیروز شاہ تغلق کے نام سے موسوم ہے اس عمارت کے درمیان ایک ستون ہے جس کا رقبہ اونچائی میں (۳۰) گز ہے اور تین گز اس کی موٹائی ہے۔ ایک انداز کے مطابق ایسا سمجھنا چاہیے کہ ایک پتھر کا ٹکڑا ہے یہ عمارت اور تین مرتبہ جب تک تین گز گہرا زمین کھود کر اینٹ اور مٹی سے اسکی بھرائی نہیں ہوئی تب تک یہ مضبوط اور پائیدار نہیں ہوا۔ استادوں اور ماہرین فن کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا ایک ایسا ستون کہ جس کی لمبائی ساٹھ (۶۰) گز ہو اس کو

زمین پر نصب کرنا محال ہے۔اسی طرح اس شہر کی اور بھی خصوصیات ہیں۔اگر ان تمام کا ذکر کیا جائے تو ایک علیحدہ نسخہ تصنیف ہوگا۔[۱۱] لہٰذا اس سے درگزر کرتے ہوئے، یہاں کے معزز اشخاس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

محمد بن علی المشہور بہ شیخ نظام الدین اولیاء

حضرت نظام الدین اولیاء مشائخ ہند میں سے ہیں۔اہل ہند انھیں سلطان المشائخ کے لقب سے پکارتے ہیں۔کہتے ہیں کہ انکے دادا خواجہ علی بخاری اور نانا خواجہ عرب تھے۔یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کی رفاقت میں ماوَراالنہر سے ہندوستان تشریف لائے،اور بدایوں میں سکونت پذیر ہوئے۔ شیخ نظام کی ولادت بداون (بدایوں) میں ہوئی۔لیکن دہلی میں نشو ونما پائی۔ان کا نسب بارہ واسطوں سے امام ہمام علی بن موسیٰ رضا سے ملتا تھا۔شیخ نظام ابھی کم سن تھے کہ انکے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔بارہ سال کی عمر میں وہ شیخ فرید (شیخ فریدالدین گنج شکر المعروف بہ داتا گنج بخش) کی محبت دل میں پیدا ہوگئی۔انکی یاد میں بیقرار رہنے لگے اور بیس سال کی عمر میں اجودھن گئے اور مرید ہوگئے۔کچھ عرصے بعد اجازت لیکر دوسروں کی تربیت کی تکمیل اور اصلاح [۱۲] کے لئے دہلی مراجعت کی۔اگرچہ وہ شیخ فریدالدین گنج شکر کے متاخرین مرید میں سے تھے لیکن تمام عالم میں اعلیٰ وارفع تھے۔بیت:

گل باھمہ خرمی کہ دارد از بعد گیا رسد بستان [۱۳]

اعلیٰ حضرت نے ستر سال کی عمر پائی۔انھوں نے اپنی تمام عمر مجاہدہ اور ریاضت میں گزاری۔ ہمیشہ روزے رکھتے تھے اور افطار کے وقت تین لقمے سے زیادہ تناول نہیں فرماتے تھے۔ماہ ربیع الاول کی اٹھارہ (۱۸) تاریخ ۷۲۵ھ میں حضرت نے وفات پائی۔[۱۴] حضرت نظام الدین اولیاء گاہ بگاہ افکار کو اشعار کے قالب میں ڈھالتے تھے۔چنانچہ ایک بار شیخ ضیاء سنانی، جو اس وقت مفتی شہر کے عہدے پر فائز تھے، انھوں نے شیخ نظام الدین کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا تھا۔حضرت کی نظر سے جب یہ فتویٰ گزرا تو آپ نے فی البدیں یہ شعر پڑھا۔بیت:

ضیاء بی ضیا کو کا فرم خواند چراغ کذب رانبو د فروغی
مسلمان خوانمش زیرا کہ نبود مکافات دروغی جز دروغی [۱۵]

دہلی کے دوسرے نیک نام افراد میں مولانا بدرالدین اسحٰق ہیں۔انھون نے اپنی عمر کا ابتدائی حصہ دہلی میں گزارا اور یہیں انھوں نے تعلیم و تربیت حاصل کی جب مرتبۂ کمال کو پہونچے تو چند

مسائل انکے لئے مشکل کا باعث ہوئے اور ہندوستان کے عالموں کے پاس انکے مسائل کا حل نہیں تھا ۔انھوں نے اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے بخارا کا مقصد کیا،لیکن راستے میں انھیں خیال آیا کہ شیخ فرید کے پاس جانا چاہیے،شاید انکے پاس انکے مطلب کا حصول ہوجائے۔آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔(شیخ فرید کے پاس انکے تمام مسائیل کا حل موجود تھا) شیخ فرید نے انھیں اپنا خادم مقرر کیا اور دامادی کا شرف بخشا،اپنی بیٹی انکے نکاح میں دی۔۱۶

تذکرہ سیّد الاولیاء کا مصنف لکھتا ہے (مصنف سید محمد بن مبارک کرمانی،سلسلۂ چشتیہ کی تاریخ اور صوفیہ کا تذکرہ ہے) کہ مولانا بدرالدین (خوفِ خدا سے) ہمہ وقت گریہ وزاری کرتے تھے۔کبھی کسی نے انکی آنکھیں خشک نہیں دیکھیں۔کثرت گریہ وزاری نے انکی دونوں آنکھوں کے درمیان سفیدی ابھر آئی تھی۔لوگوں نے انھیں زیادہ رونے سے منا کیا تو انھوں نے جواب میں بیت پڑھی۔بیت:

از آبِ دیدہ خانۂ چشمم خراب شد پس نامدیم دیدۂ خانہ خرابِ را ۱۷

انکی پسندیدہ خصائل کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے یہاں اس کتاب میں اس سے زیادہ لکھنے کی طاقت نہیں ہے۔

مولانا شمس الدین ایجی :

اپنے زمانے کے علماء وفضلاء اور دانشمندوں میں شمار ہوتے تھے۔اکثر دہلی کے علماء انکے حلقۂ درس میں شامل تھے۔آخری عمر میں شیخ نظام کے دست مبارک پر بیعت کیا اور شیخ کے یہاں ارادتو ریاضت میں ایسے مشغول ہوئے کہ مخلوق سے کنارہ کش ہو گئے اور اپنے آپ کو شیخ کی خدمت میں وقف کر دیا۔انکا ایک خادم فتوح نام کا تھا جو ان سے ملنے آنے والے لوگوں کی رہنمائی کرتا تھا بتاتا تھا کہ یہ کہنا ہے اور یہ نہیں کہنا ہے۔سوائے اس خادم کے کوئی اور انکی خلوت میں داخل نہیں ہوتا تھا۔ ۱۸

فخرالدین زرادی :

بے پناہ علم اور شدت مجاہدہ میں انکا کوئی ثانی نہیں تھا۔شیخ نظام الدین (اولیاء) کے حلقہ مریدین میں سے تھے۔شیخ نظام الدین کی وفات کے بعد فخرالدین نے جنگل وصحرا میں زندگی بسر کی۔ انکے دو رسالے یادگار ہیں جو سماع کے مباح،اصولِ فقہ اور قواعد سے بحث میں تحریر کیے ہیں۔ ۱۹

مولانا علاءالدین نیلی :

مولانا علاء الدین کا شمار علماء وفضلاء میں ہوتا تھا۔قرآن کی تلاوت نہایت خوش لحن سے کرتے تھے۔اگر چہ وہ بھی شیخ نظام الدین کے خلفاء میں سے تھے لیکن ہرگز مرید نہیں بنائے اور خلافت میں انھیں نے کوئی دخل نہیں دیا۔آخری عمر میں حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کو جمع کیا اور 'فوایدالفواد' کے نام سے موسوم کیا ہمیشہ اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ بیت:

مرا نسیم تو باید صبا کجاست کہ نیست کجاست زلف تو مشک خطا کجاست کہ نیست ۲۰

مولانا میرھادالدین:

مولانا میرھادالدین ان معدودے چند شخصیات میں سے تھے جو شمشیر عشق سے زخم خوردہ لوگوں کے دلوں پر مرہم رکھتے تھے،اور درد محبت برداشت کرنے والوں کی غمخواری کرنا،ان کا درمان کرنا ان کا شیوہ تھا۔ انکے ہم عصر انکی صحبت کے شیفتہ تھے اور ان سے فیضیاب ہوتے تھے، بیشتر وقت انکی صحبت میں گزارتے تھے۔ اپنے پیر مرشد سے نہایت اخلاص رکھتے تھے۔ ہرگز پیر ومرشد حضرت نظام الدین کی اقامت گاہ کی جانب پشت نہیں کی (ہمیشہ انکے حضور میں حاضر رہتے تھے) آخری عمر میں دیوگیر چلے گئے اور وہیں فوت ہوئے۔۲۱

امیر خسرو:

۲۲ امیر خسرو بلخ کے شہر ہزارہ کے رہنے والے تھے۔انکے والد امیر لاچین تھے اور ہجرت کرکے ہندوستان آئے اور پٹیالی میں مقیم ہوئے۔امیر خسرو اور انکے دو بھائی ہندوستان میں متولد ہوئے۔جب امیر خسرو پیدا ہوئے تو انکے والد انھیں ایک کپڑے میں لپیٹ کر ایک مجذوب دیوانے کے پاس لے گئے، جو انکے قرب وجوار میں رہتے تھے۔جب مجذوب کی نظر امیر خسرو پر پڑی تو انھوں نے کہا ایسے شخص کو لائے ہو جو بادشاہ سے دو قدم آگے ہے۔جب امیر خسرو چار سال کے ہوگئے تو امیر الاچین ملازمت کی غرض سے پٹیالی سے دہلی آگئے، اور یہیں ان کی وفات ہوئی۔انکے خالو جو امارت کے مرتبے پر فایز تھے انھوں نے خسرو کی تربیت کی ذمہ داری لے لی۔جب سنِ بلوغت کو پہونچے تو خسرو نے سلطان المشایخ شیخ نظام الدین اولیاء سے ملاقات کی اور انکے مرید ہوگئے۔بتدریج شیخ کی صحبت سے انھیں بے انتہا رقبت پیدا ہوگئی کہ نزدیکی اس حد تک بڑھی کہ حضرت کے محرم راز ہوئے۔

ایک روز حضرت سلطان المشایخ کی مدح میں شعر کہا اور مجلس میں سنایا شیخ کو بہت پسند آیا۔ فرمایا کیا صلہ چاہتے ہو۔کہا میں چاہتا ہوں کہ آپکی قبولیت کی برکت کی وجہ سے میری نظم میں شیرینی پیدا ہو جائے، میرے کلام میں عذوبیت پیدا ہو جائے۔سلطان نے فرمایا کہ چار پائی کی نیچے شکر کا

طشت رکھا ہوا ہے اسے اٹھالاؤ۔ اپنے سر میرے نثار کر دو اور تھوڑا خود کھالو۔ امیر خسرو نے حکم کی تعمیل کی ۔تھوڑے ہی دنوں میں اس کی برکت سے ایسا ہوا کہ خسرو کے کلام کی شیرینی نے مشرق اور مغرب کے لوگوں کے لبوں کو شیرین کر دیا۔ بعض کہتے ہیں کہ شیخ نے اپنا آبِ دہن (لعاب دہن) انکے منھ میں ڈالا تھا۔ جیسا کہ مثنوی ''نہ سپہر'' میں آیا ہے۔

خوش آندم کہ من زاعتقاد ضمیر گر فتح بحق دستِ آن دستگیر
بنہ بحر از آن جانیم راہ شد چو کشتی مراد است آن شاہ شد
من ازوی لعاب امان یافتم کزین کوتہ آب دھان یافتم
دو قطرہ کزان دردوان افگنم تطلم در آب حیات افگنم ۲۳

امیر خسرو نے ملازمت اور شاعری کے ساتھ چالیس سال صوم وصلاۃ کی پابندی کے ساتھ گذارے۔ وہ ہر شب میں ایک قرآن ختم کرتے تھے۔ ہر شفقت ومحبت جو شیخ نظام الدین امیر خسرو کے ساتھ کرتے تھے، انھوں نے ان تمام باتوں کو ایک کتاب میں جمع کر دیا۔ اس کتاب کے نسخے میں عبارت نقل کی کہ ایک روز شیخ نے عنایت کی اور شیخ نے فرمایا، میں سب سے مایوس اور تنگ آ گیا ہوں بجز تمہارے۔ پھر اپنی بات کا اعادہ کیا کہ میں سب سے بہت تنگ اور مایوس ہوں اس حد تک کہ اب خود سے بھی مایوس ہوں، لیکن تم سے نہیں۔ اس کتاب میں امیر خسرو نے لکھا ہے کہ ایک روز انکی زبان پر یہ بات آئی کہ آج رات عالم غیب سے یہ خطاب آیا کہ خسرو جن کا نام ہمارے درویشوں میں ہے اس کو نبی اکرم ﷺ اپنا کاسہ لیس کہتے ہیں۔ اس خطاب کی وجہ سے نعمتوں کے امیدوار ہوئے۔ یہ بھی نقل ہے کہ حضرت نظام الدین نے خسرو کو ترک اللہ کے خطاب سے نوازہ تھا۔ یقیناً شیخ کی یہ رباعی امیر خسرو کے حق میں کہی گئی ہے۔ رباعی:

خسرو کہ بنظم و نثر مثلش کم خاست
ملکیت ملک سخن ابن خسرو راست
این خسرو ماست، خسرو ناصر نیست
زیر اکہ خدائے ناصر خسرو ماست ۲۴

امیر خسرو سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانے سے سلطان محمد تغلق شاہ کے زمانے تک زندہ تھے۔ انھوں نے ساتھ بادشاہوں کی خدمت ۔کی جب سلطان محمد بن بلبن کو لاہور اور ملتان کے بیچ تا

تاراور مغلوں کے حملے میں قتل ہوا، اس وقت امیر خسرو جو سلطان محمد بن بلبن کی خدمت میں تھے، انہیں تاتاری قید کر کے بلخ لے گئے ۔ دو سال بعد خراسان سے انھیں رہائی نصیب ہوئی ۔ وہ سلطان بلبن کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ خسرو نے جو مرثیہ سلطان محمد کی شہادت پر لکھا تھا وہ مجلس میں پڑھ کر سنایا۔ ہر طرف نالہ و شیون اور آہ و بکاہ بلند ہونے لگی ۔ چھوٹے بڑے سب زار و قطار رو رہے تھے ۔ سلطان ملین نے تو اس قدر گریہ وزاری کی کہ ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے اور اتنا روئے کہ بیمار ہو گئے اور چند دنوں میں ہی اس دار فانی سے کوچ کر گئے ۔

جب سلطان غیاث الدین تغلق نے لکھنوتی جانب توجہ فرمائی تو تمام تکلیف کے باوجود خسرو کو اپنے ہمراہ لیا۔ جب اس سفر سے خسرو واپس آئے تو سنا کہ حضرت نظام الدین اولیاء رحلت فرما گئے ہیں، خسرو اس قدر آبدیدہ ہوئے اور سر و چہرے پر خاک مل لی اور شیخ کے مزار پر گئے خاک مزار پر لوٹنے اور تڑپنے لگے ۔ مسلسل گریہ وزاری کرتے رہے تقریباً اسی کیفیت میں چھ مہینے بعد مالک حقیقی سے جا ملے ۔ خسرو کی تاریخ وفات ۷۲۵ھ انکے قریبی دوست اور ہمراز خواجہ حسن سے خوب کہی ہے:

میر خسرو خسرو ملک سخن اَن محیط فضل و دریائے کمال
نظم اودلکش تراز ماءِ معین نثر او صافی تراز آب زلال
از برای جُستنِ تاریخ او چون نہاد م سر بزانوی خیال
شد عدیم المثل یک تاریخ او دیگری شد طوطی شیرین مقال ۲۵

دولت شاہ سمرقندی: مصنف تذکرہ الشعراء نے اپنے تذکرہ میں تحریر کیا ہے کہ مرزا بابسنقر بن مرزا شاہرخ نے امیر خسرو کے ایکسو بیس ہزار اشعار جمع کئے تھے ۔ یہ بھی نقل کیا ہے اپنے ایک رسالے میں کہ میرے اشعار کی تعداد پانچ ہزار سے کم اور چار ہزار سے زیادہ ہے ۔ خسرو نے ۹۹ کتابیں لکھیں جو بیشتر نظم میں ہیں ۔ خسرو کی مثنویات جو آج متداول ہیں ۔ خمسہ کی پانچ مثنویاں ہیں اس میں عشقیہ اشعار کی تعداد آٹھ ہزار کے قریب ہے ۔ مثنوی قرآن السعدین میں چار ہزار، نہ سپہر میں چار ہزار ابیات، تغلق نامہ میں تین ہزار ابیات ہیں ۔ انکے چار دیوان ہیں دواوین کو مختلف زمروں میں تقسیم کیا ہے: تحفۃ الصغر انکا جوانی کا کلام ہے ۔ وسط الحیات میں اشعار آغاز سلوک اور ادھیڑ عمر کلام ہے ۔ غرۃ الکمال میں ان کا پختہ کلام ہے ۔ بقیہ بقیہ انکا بڑھاپے کا کلام ہے ۔ انکے اشعار کی تعداد مکمل طور پر معلوم نہیں ہے ۔ ذیل کے اشعار انکے ایک قصیدے کے ہی جو انہوں نے خاقانی شروانی کے تتبع میں کہا

تھا۔ ۲۶

نظم قصیدہ:

دلم طفل است و پیر عشق استاد زبان دانش
سواد الوجہ سبق و مسکنت کنج دبستان
زبان دان پیر عشق آمد کہ ہر کا موخت رمزاو
درونش لوح محفوظ است و خاموشی است بر دھانش ۲۷

یہاں قصیدہ کے اشعار طوالت کے خیال سے حذف کیے جاتے ہیں۔غزل:

وقتیست کین خرابہ بدیوان رہا کنیم پرواز با فرشتہ باوج سما کنیم
عشق است کیمیای ابدای حکیم خیز تا گنج عمر بر سراین کیمیا کنیم ۲۸

قطعہ :

بکوی عاشقی ازعافیت نشان ندہند
دل غمندہ ی ما راز غم امان بدہند
بگفتمش کہ بگش تا بمیرم و برہم
جو اب داد کہ راحت بعا ثقان ندہند ۲۹

خسرو کے کلام کے طویل نمونے امین احمد رازیؔ نے نقل کیے ہیں یہاں ان سے گریز کیا جاتا ہے۔

خواجہ حسن : خواجہ حسن کا لقب نجم الدین تھا۔ضیاءالدین برنی نے کتاب تاریخ فیروز شاہی میں نقل کیا ہے کہ میں نے کسی کو لطافت طبع، جودت ذہن، عقل ودانش، تہذیب واخلاق، قناعت، تجرد وتفرد اور خوش خُلقی میں، مثل، خواجہ نہیں پایا۔نظم:

جون نکتۂ عاشقان خصاحت چون چہرۂ دوست از ملاحت
جان راعوض سرور وشادی دل رابدل نشاط وراحت ۳۰

خواجہ حسن (دھلوی) شیخ نظام االدین اولیاء کے مریدوں میں سے تھے۔ جب شیخ نظام الدین اولیاء کو سماع کی طلب ہوتی تو فرماتے تھے کہ خواجہ حسن کے اشعار کو پڑھو۔خواجہ حسن نے سعدی شیرازی (بزرگ شاعر ایران، نظم ونثر دونوں میں تخلیقات یادگار ہیں مثلاً گلستان وبوستان کے طرز کی پیروی کی اور ہمیشہ ان کی روش کو تلاش کرتے اور سعدی کے لحن و آہنگ کی تقلید کرتے تھے۔ چنانچہ اس دعوے کے ثبوت میں شعر نقل ہے۔ بیت:

حسن گلی زگلستان آن مہ خودروست کہ اہل معنی گلچین از آن گلستانند ۳۱

اہل ہندان کو سعدی ہندوستان کہتے ہیں۔بادشاہ اور شہزادوں کی انکی جانب خاص توجہ تھی۔
آخری عمر میں خواجہ حسن بادشاہِ وقت سلطان محمد تغلق کے حکم پر دیوگیر چلے گئے تھے اور وہیں انکی وفات ہوئی۔انکا دیوان موجود ہے۔اس سے مفید اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔ابیات:

اگر ز جام لبت جُرعہ ٔ زود بشوید از دلم این توبہ گناہ آلود
ہزار آتش سوزان فروشد اندر دل وزین فروشد یک روز برینامد دود۳۲

نظم: مارا بجز تو درھمہ آفاق یار نیست مشفق تر از غم تو دگر غمگسار نیست
گفتی بر بگوی دگر کس قرار گیر درعہد نامہٗ من و تو این قرار نیست
آن نہ زلفست روزگار منست کہ زسر تا بپای پیچیدہ است۳۳

رازی نے حسن دہلوی کے کلام کے نمونے کافی نقل کیے ہیں لیکن راقم نے طوالت کے خیال سے حذف کر دیئے ہیں۔دیوان حسن دہلوی موجود ہے۔

شیخ جمالی : شیخ جمالی نہایت فاضل و دانش مند و دیانت دار تھے۔ابوالغازی سلطان حسین مرزا بایقرا کے زمانے میں خراسان گئے اور آخری عمر تک وہیں مقیم رہے۔۳۴ آخری وقت جب جان مالک حقیقی کے سپرد کرنے کا وقت آیا تو انکے نیک اعمال کا بڑا ذخیرہ جمع تھا جس کا جھنڈا بلند کرتے ہوئے خلد برین کی جانب روان ہوئے۔نظم:

کسی کی عزت عُزلت نیافت ہیچ نیافت کسی کہ روی قناعت ندید ہیچ ندید۳۵

جنت آشیانی ہمایوں بادشاہ کو شیخ جمالی کی صحبت بہت مرغوب تھی۔وہ ہمیشہ انکی صحبت سے مستفید ہوتے تھے اور اکثر ہمایوں بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔اپنے احوال کی پردہ پوشی کے لئے سخن جانب توجہ فرماتے تھے۔انکے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔نظم:

عشق را طی لسانیست کہ صد سالہ سخن دوست بادوست بیک چشم زدن میگوید۳۶
زاہد بطعنہ گفت کہ روی بتان مبین ای بی تمیز دیدہٗ بینا برای چیسیت؟ ۳۷

انکی قبر پرانی دہلی میں ہے اور' خسروِ ہند بودہ' تاریخ وفات ہے۔شیخ جمالی نے تذکرہ سیر العارفین کی تصنیف کی۔

مولانا علی احمد:

مولانا علی احمد، مہر کنی کے فن میں، بے بدل تھے۔شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔انکے چند اشعار نقل ہیں۔بیت:

صورت و معنی نگر دد جمع در ہر پادشاہ پادشاہِ صورت و معنی است، اکبر پادشاہ

آن شہنشاہی کہ می افتد بروز باراو — ازنہیب چوب دربان پادشہ بر پادشاہ

تا کہ باشد مشرق و مغرب دنیا شد غیر او — از کنار باختر تا حد خاور پادشاہ

بیت: مراہر شب چو دزدان خواب گرد چشم تر گردد — دلم را با غمت بیدار بیند باز برگردد ۳۸

مولانا عبدالحق:

مولانا عبدالحق دہلی کے فضلاء اور منتظمین میں سے ہیں۔علم ریاضی اور آگہی میں خوب ماہر ہیں۔کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں۔

بیت : رنگ حناست برکف پای مبارکت — یا خون عاشق است کہ پامال کردۂ ۳۹

شیخ فیضی ۴۰ (عہد اکبری کا زبردست شاعر تھا) نے ایک رباعی انکے لئے کہی تھی۔بیت:

ای پاک بہ بیرون وسیہ کار بدل — اقرار بلب کردہ و انکار بدل

دین از تو دورو یہ شد بمانند قلم — مصحف بزبان داری وزنار بدل ۴۱

اظہری:

اظہری اگرچہ مدصل کے رہنے والے تھے لیکن ان کی ولادت دہلی میں ہوئی۔شعر گوئی کا ذوق رکھتے تھے اور اچھے شعر کہتے تھے۔یہ رباعی حضرت شاہنشاہی اکبر کی مدح میں کہی ہے،رباعی:

فردوسی بہ سلبیل و کوثر نازد

دریا بگہر ، فلک باختر نازد

عاشق بکرشمہ ھای دلبر نازد

کونین بذات شاہ اکبر نازد ۴۲

پاورقی:

۱ بمعنی ہریالی،سبزی،مجمع الغات ص ۴۰۱

۲ گنف = احاطہ کرنا،کنف = تصیلا یا جھولا،کنف = کنارا،طرف،سمت ایضاً ص ۵۔۷

۳ بمعنی بہشت ایضاً ص ۵۹۶

۴ ۵ ایضاً ص ۳۵۳ برای قطب الدین ایبک،شہاب الدین غووری رجوع بہ بزم مملوکیہ ص ۲۰۔۸۰

۶، ۷ ہفت اقلیم ص ۳۵۴ ۸ مجمع اللغات ص ۴۱۷

۹ ۱۰ ۱۱ ہفت اقلیم ص ۵۵۔۳۵۴ ۱۲ بزم صوفیہ ص ۲۰۵ -- ۱۳ ہفت اقلم ص ۳۵۶

۱۴ بزم صوفیہ ص ۲۰۰

۱۵ ۱۶، ۱۷ ، ۱۸ ۱۹ ۲۰ ہفت اقلیم ص ۸۔۳۵۷

۲۱ ہفت اقلیم ص۔۳۵۷، تاریخ ادبیات ایران ص ۳۸۴، بزم مملوکیہ ص ۲۵۰ فرہنگ ادبیات فارسی دری ص ۶۹ ۲۲، ۲۳ ہفت اقلیم ۳۵۹

۲۴ بزم مملوکیہ ۱۹۵ ص ۲۵ بزم مملوکیہ ص ۱۹۶ ص، ہفت اقلیم ص ۳۶۰ فرہنگ ادبیات فارسی دامی ص ۸۷، تاریخ ادبیات ایران ص ۳۷۵

۲۶۔ تاریخ ادبیات ایران ص ۲۵۶ ص، فرہنگ فارسی دری ص ۹۱۔۹۰۔۱۸۹ ہفت اقلیم ص ۳۶۵ ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰ ۳۲، ۳۳ ہفت اقلم ص ۶۶۔۳۶۵

۳۱۔ بزم مملوکیہ ص ۲۶۰ ہفت اقلیم ص ۳۶۷، فرہنگ ادبیات فارسی دری ص ۱۵۔۲۱۴

۳۴۔ تاریخ ادبیات ایران ص ۴۳۸

۳۵۔ بزم تیموریہ (ج اول) ص ۴۵ ہفت اقلیم ص ۳۶۷

۳۶ ۳۷ ، ۳۸ ، ۳۹ ۴۰ ہفت اقلیم ص ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۳۶۷

۴۱ ۔ تاریخ ادبیات ایران ص ۴۷۰، فرہنگ ادبیات فارسی دری ص ۶۸۶، بزم تیموریہ (ج ۱) ص ۱۴۴

۴۲ ہفت اقلیم ص ۳۷۱

مأخذ:

۱ تذکرہ ہفت اقلیم (ج ۱) مطبوعہ کتابفروسی ادبیہ، ایران ۱۰۱۵ امین احمد رازی ۱۰۱۰ء

۲ بزم مملوکیہ مصنف صباح الدین عبدالرحمن ۱۹۹۵ء

۳ بزم صوفیہ مطبوعہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ

۴ بزم تیموریہ (ج ۱)

۵ تاریخ ادبیات ایران، مصنف رضازادہ شفق لیتھوآرٹ پریس دہلی ۱۹۸۵ء (مترجم سید مبارزالدین رفعت)

۶ فرہنگ ادبیات فارسی دری انتشارات بنیادفرہنگ، ایران (ڈاکٹر زہرای خانلری)

۷ مجمع الغات فارسی مجموعہ شانتی پریس الہٰ آباد

مرتبہ مولوی محمد رفیع فاضل دیوبندی ۱۹۹۰ء، ۱۹۹۴ء، ۱۹۶۳ء، ۱۹۵۸ء

☆☆☆

ڈاکٹر یاسر عباس غازی
شعبہ فارسی،
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

فتنہ از دیدگاہ غزلیات حافظ

اردو زبان وادب میں لفظ "فتنہ" کا استعمال جھگڑا، فساد کے لئے ہوتا ہے لیکن فارسی زبان وادب میں اس کے برعکس امتحان وآزمائش کے معنی میں ہوتا ہے۔ فارسی ادب کی مشہور لغت دہخدا میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں درج ہے:

"آزمون، گداختن و درآتش انداختن سیم و زر جهت امتحان (منتهی الارب) آزمایش، مال، فرزند، محنت، ابتلاء، عبرت (اقرب الموارد)"۔ [۱]

فارسی ادب میں شعرا وادباء نے لفظ "فتنہ" کا استعمال اسی معنی یعنی آزمائش، امتحان، ابتلاء وغیرہ میں کیا ہے۔

فارسی ادب میں لسان الغیب کے نام سے مشہور شاعر شمس الدین محمد حافظؔ جس کی ولادت سن 726ھ کو شیراز میں ہوئی۔ تذکروں میں والد کا نام بہاء الدین لکھا ہے۔ [۲]

حافظ نے مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ قرآن کریم حفظ کیا اس کا بغور مطالعہ کیا اور اسی رعایت سے اپنا تخلص حافظ منتخب کیا۔ خود حافظ نے اپنے اشعار میں اس جانب اشارہ کیا ہے:

ندیدم خوش تر از شعر تو حافظ بقرآنی کہ تو در سینہ داری

حافظ نے سنائی غزنوی، عطار نیشاپوری، مولانا رومی اور شیخ سعدی جیسے عرفانی شعراء کی روایت کو آگے بڑھایا ہے یعنی تلاش معبود، جستجوئے مسجود، توحید وعرفان باری تعالی کو موضوع سخن قرار دیا۔ اکثر غزلیات اسی عشق حقیقی کی روداد سے مملو ہیں۔ حافظ کی غزلیات نے جو مقبولیت حاصل کی وہ حافظ کی دیگر تخلیقات کو میسر نہیں ہو پاتی۔ حافظ نے اپنے تخلص کے مطابق اپنے کلام میں قرآنی مفاہیم ومطالب کو بخوبی موزوں کیا ہے۔ حافظ کے کلام کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ آج بھی ایرانی حضرات اور بعض غیر ایرانی بھی دیوان حافظ سے اپنے کاموں میں فال نکالتے ہیں۔

چونکہ حافظ نے اپنی غزلیات میں جو لفظ "فتنہ" کا استعمال کیا ہے وہ قرآنی مفاہیم کے اعتبار سے کیا ہے لہذا لفظ

"فتنہ" کو قرآن مجید میں کس طرح استعمال کیا ہے یہ جان لینا بھی بیحد سودمند رہے گا۔قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس لفظ کا استعمال ہوا ہے اس میں سے چند مورد کا یہاں ذکر کیا جارہا ہے۔قرآن کریم نے تین چیزوں کو فتنہ اور باعث آزمائش قرار دیا ہے:

1۔مال واولاد:

وَاعلَمُوااَنّمَا اموالکم و اولادکم فتنة و ان الله عنده اجز عظیم (۲۸/انفال)
اور جان لو۔کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد (تمہارے لئے) ایک آزمائش ہیں اور یہ بھی کہ اللہ ہی کے پاس بڑا اجر ہے۔

اَنّمَا اموالکم و اولادکم فتنة و الله عنده اجز عظیم (۱۵/تغابن) تمہارے مال،تمہاری اولاد ایک بڑی آزمائش ہیں اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے۔

2۔شر و نیکی:

کل نفس ذائقة الموت و نبلوکم بالشر والخیر فتنة و الینا ترجعون (۳۵/انبیاء) ہر جاندار موت کا مزہ چکھنے والا ہے اور ہم تمہیں برائی اور اچھائی کے ساتھ آزماتے ہیں (آخرکار) تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

3۔چند چیزیں چند کے لیے وسیلہ آزمائش ہیں:

و جعلنا بعضکم لبعض فتنة ا تصبرون و کان ربك بصیراً (۲۰/فرقان)
اور ہم نے تم کو ایک دوسرے کیلئے ذریعہ آزمائش بنایا ہے کیا تم صبر کرو گے؟ اور آپ کا پروردگار بڑا دیکھنے والا ہے۔

و کذالك فتنا بعضهم ببعضٍ..... (۵۳/انعام) اس طرح ہم نے بعض لوگوں کو بعض کے ذریعہ سے آزمائش میں ڈال رکھا ہے۔

اسی طرح دیگر آیات میں بھی "فتنہ" آزمائش کے معنی میں استعمال ہوا ہے:

وما جعلنا اصحاب النار الا ملائکة وما جعلنا عدتهم الا فتنة.... (۳۱/مدثر)
اور ہم نے دوزخ کے داروغے صرف فرشتے بنائے ہیں اور ہم نے ان کی تعداد کو کافروں کیلئے آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے۔

وما انزل علی الملکین ببابل هاروت و ماروت وما یعلمان من احدٍ حتی

یقولا انما نحن فتنة... (۱۰۲/بقرہ) وہ اس چیز (جادو) کی پیروی کرنے لگے جو بابل کے مقام پر ہاروت و ماروت نامی دو فرشتوں پر اتاری گئی۔ حالانکہ یہ دونوں فرشتے اس وقت تک کسی کو کچھ تعلیم نہیں دیتے تھے جب تک پہلے یہ نہیں کہتے تھے کہ ہم محض آزمائش ہیں۔

لیجعل ما یلقی الشیطان فتنة للذین فی قلوبھم.... (۵۳/حج) یہ سب اس لئے ہے تا کہ اللہ شیطانوں کی خلل اندازی کو ان لوگوں کیلئے آزمائش کا ذریعہ بنائے جن کے دلوں میں بیماری ہے۔

فاذا مس الانسان ضر دعانا ثم اذا خولناہ نعمة منا قال انما اوتیته علی علم بل ھی فتنة ولکن اکثرھم لا یعلمون (۴۹/زمر) اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے اور پھر جب ہم اسے اپنی جانب سے کوئی نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو مجھے اپنے علم و ہنر کی بنا پر دی گئی ہے بلکہ وہ ایک آزمائش ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

حافظ نے اپنے کلام میں خداوند عالم کے صفات و کمالات کو نظم کیا ہے۔ خدا کی وحدانیت کو ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ دنیا کی ہر شی خدا کی خلاقیت کا مظہر ہے۔ کائنات کی ہر چیز، چاہے وہ خشکی کی ہو چاہے تری کی اس کا تعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ خداوند قدوس سے ہے حتی کہ جسم انسانی خدا کی معرفت کا بہترین ذریعہ ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کا مشہور و معروف قول ہے "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" جس اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے رب کو پہچان لیا۔ اس قول کے مطابق نفس انسانی معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے۔ جسم انسانی عناصر اربعہ سے ترتیب ہے۔ اردو کے مشہور شاعر چکبست نے اس شعر میں جسم انسانی کی کیا خوب وضاحت کی ہے:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب　　موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

خداوند عالم نے قرآن کریم کے سورہ تین میں انسانی تخلیق کو "احسن تقویم" قرار دیا ہے ارشاد ہوتا ہے:

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (تین/۴) ہم نے انسان کو بہترین ساخت و انداز کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

اس احسن تقویم میں اللہ نے اضداد کو یکجا کر کے اپنی بہترین انسان خلق کیا اور اس کا اظہار بھی کیا۔ آگ، پانی، مٹی، ہوا ایک دوسرے کی ضد ہیں ایسی ضد جو ایک دوسرے کا وجود گوارہ نہیں کرتا لیکن یہی اضداد جسم انسانی میں ترکیب پاتے ہیں تو اس طرح ایک دوسرے کا جز لاینفک بن جاتے ہیں ان میں سے کسی ایک کی بھی کمی بیشی جسم انسانی کو مریض

بنا کر بستر علالت سے ہمکنار کر دیتی ہے۔اور اس بہترین تخلیق کے لیے یہ کائنات بنائی۔ بنی نوع انسانی میں سب سے افضل ترین شخصیت، محبوب الٰہی حضرت محمد مصطفیٰؐ کے سلسلے میں اللہ نے حدیث قدسی میں فرمایا: کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقتک یا محمد۔ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو اے محمدؐ میں نے تمہیں پیدا کر دیا۔یعنی جس کا صغری و کبری ملا کر نتیجہ نکالا جائے تو معرفت الٰہی موجب بنی تخلیق کائنات کی۔اسی مفہوم کو حافظ نے اپنی ایک غزل میں اس طرح نظم کیا ہے:

عالم از شور و شر عشق خبر ہیچ نداشت
فتنہ انگیز جہان غمزہ جادوی تو بود [۲]

کائنات کو عشق کے شور و غوغہ، اس کی حیلہ بازی و فریب کاری کی کوئی واقفیت نہ تھی یعنی کائنات میں کوئی تگ و دو ،کوئی چہل پہل نہ تھی دنیا کو جائے امتحان تیرے جادو نے بنایا تیری چاہت، الفت نے بنایا۔عشق وہ جذبہ ہے جو ایثار و قربانی چاہتا ہے جو جتنی بڑی قربانی پیش کرتا ہے وہ اتنا زیادہ قریب ہوتا ہے۔تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو خدا کے جتنا قریب ہے اس کا امتحان بھی اسی قدر سخت ہوا۔حضرت خلیل اللہؑ و حضرت ذبیح اللہؑ یعنی حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ کا جو امتحان ہوا ہے وہ قرآن مجید نے ذکر کیا ہے:

فلما بلغ معه السعی قال یا بنی انی اری فی المنام انی اذبحك فانظر ما ذا تری قال یا ابت افعل ما تومر ستجدنی ان شاء الله من الصابرین (۱۰۲) فلما اسلما و تله للجبین (۱۰۳) و نادیناه ان یا ابراهیم (۱۰۴) قد صدقت الرویا انا کذالك نجزی المحسنین (۱۰۵) ان هذا لهو البلاء المبین (۱۰۶/صافات) پس جب وہ لڑکا آپ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو آپ (ع) نے فرمایا (اے بیٹا) میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں تم غور کر کے بتاؤ کہ تمہاری رائے کیا ہے؟ عرض کیا بابا جان! آپ کو جو حکم دیا گیا ہے وہ بجا لایئے اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ پس جب دونوں (باپ بیٹے) نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔تو ہم نے ندا دی اے ابراہیم (ع)! (تم نے (اپنے) خواب کو سچ کر دکھایا بے شک ہم نیکوکاروں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں۔ بے شک یہ ایک کھلی ہوئی آزمائش تھی۔اور ہم نے ایک عظیم قربانی کے عوض اس کو چھڑا لیا۔

حکم الٰہی کی تعمیل میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے جگر گوشے کے حلقوم پر چھری چلائی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شفقت پدری کے ہاتھوں مجبور ہوکر حضرت ابراہیمؑ نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی لیکن خدائی آزمائش سے قدم پیچھے نہیں کھینچے۔ حضرت ایوب جن کو خداوند کریم نے ایسی بیماری بطور امتحان دی کہ جس کے سبب لوگ آپ سے دور بھاگتے کوئی قریب نہ آتا تھا سوائے آپ کی زوجہ کے۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کی جانب اس آیت کے ذریعہ اشارہ کیا ہے:

وایوب اذ نادی ربہ انی مسنی الضر و انت ارحم الراحمین (۸۳/انبیاء)
اور ایوب (کا ذکر کیجئے) جب انہوں نے اپنے پروردگار کو پکارا مجھے (بیماری کی) تکلیف پہنچ رہی ہے اور تو ارحم الراحمین ہے (میرے حال پر رحم فرما)۔

اسی طرح دوسرے مقام پر ارشاد رب کائنات ہے کہ آپ کی اولاد آپ کے سامنے موت کی آغوش میں سما گئی یہ سب امتحان الٰہی کا حصہ تھا:

ووھبنا لہ اھلہ و مثلھم معھم رحمۃ منا و ذکری لاولی الالباب (۴۳/ص) اور ہم نے اپنی خاص رحمت اور صاحبانِ عقل وفکر کیلئے بطورِ نصیحت انہیں نہ صرف ان کے اہل وعیال واپس دیئے (بلکہ) اتنے ہی اور بڑھا دیئے۔

اسی لئے حافظ کہتے ہیں کہ عشق کا راستہ فتنہ، اضطراب، بے قراری و بے اطمینانی سے تعبیر ہیاس میں ہر قدم پر امتحان ہے آزمائش ہے:

طریق عشو پر آشوب وفتنہ است ای دل
بیفتد آن کہ دراین راہ باشتاب رود[۴]

فراق وہجر کی گھڑیاں ہر کسی کے لیے عذاب ہوتی ہیں ایک ماں اپنے بیٹے سے بچھڑ کر بے چین رہی تو ایک بہن اپنے بھائی سے جدا ہوکر بیقرار ہوجاتی ہے اگر دوستی میں خلوص ہوتو دوست دوست سے جدا ہوکر، بچھڑ کر سکون سے نہیں رہ پاتا پریشان رہتا ہے اور اگر وہ دوست ہمارے دین وایمان، دنیا وآخرت یعنی ہر دو عالم میں سہارا ہو، محشر میں شفاعت کا ذمہ دار ہوتو پھر اس کے انتظار میں تن، من، دھن بہر صورت مشغول رہنا عبادت ہی عبادت ہے اور انتظار ایسی عبادت ہے جس میں خداوند کریم اپنی مخلوق کا شریک ہے۔ دو ہی عبادات ایسی ہیں قرآن کی رو سے جس میں خالق ومخلوق باہم شریک ہیں۔ پہلی عبادت: انتظار

قل فانتظروا انی معکم من المنتظرین (۱۰۲/یونس) ان سے کہہ دیجئے کہ پھر تم انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔

دوسری عبادت: درود

ان اللہ و ملائکتہ یصلون علی النبی یا ایھا الذین آمنوا صلوا علیہ و سلموا تسلیماً (۵۶/احزاب) بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی (ص) پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود وسلام بھیجو جس طرح بھیجنے کا حق ہے۔

حافظ اسی انتظار کو دو عالم کا فتنہ یعنی آزمائش قرار دیا ہے کہ اگر بادفتنہ آزمائشی ہوا دو عالم کو باہم ٹکراتی ہے تب بھی میں اور میری آنکھوں کا چراغ دوست کے انتظار میں راستے پہ جمے رہیں گے:

گر بادفتنہ ھر دو جھان را بہ ھم زند

ما و چراغ چشم و رہ انتظار دوست ۵

الغرض حافظ نے اپنے کلام میں ایسی بہت مثالیں پیش کی ہیں اور بہت سے مقام پر لفظ "فتنہ" کا استعمال بطور آمائش، امتحان کیا ہے لیکن مقالہ طویل ہونے کے پیش نظر اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

منابع:

۱۔لغت نامہ دہخدا

۲۔تاریخ ادبیات ایران، رضازادہ شفق، ص۴۲۳

۳۔دیوان حافظ، غزل ۴۴۷

۴۔غرر الحکم، ۷۹۴۶

۵۔دیوان حافظ، غزل ۲۱۰

۶۔دیوان حافظ، غزل ۲۲۱

۷۔دیوان حافظ، غزل ۶۰

☆☆☆

ڈاکٹر عبدالواسع
نئی دہلی

داراشکوہ: مذہبی رواداری اور سماجی ہم آہنگی کا نشان امتیاز

شاہ جہاں اور ممتاز محل کا سب سے بڑا بیٹا داراشکوہ ۲۰ مارچ ۱۶۱۵ کو پیدا ہوا تھا۔ برصغیر کی تاریخ میں داراشکوہ کی ایک منفرد پہچان ہے۔ وہ تصوف میں وحدۃ الوجودیت کا قائل تھا۔ اس نے حضرت میاں میر کو اپنا مرشد بنایا تھا۔ اس نے بھگت رامانند اور مسلمان صوفی مرزا سالک لاہور اور مرزا لاہوری سے بھی اکتساب فیض کیا تھا۔ فلسفہ ویدانت سے اس نے ہندو یوگی لائی داس کے ذریعے آگاہی حاصل کی، جو سنت کبیر کے پیروکاروں میں سے تھا۔ اس نے ویدک ادب کے مطالعے کے ساتھ اسلام اور عیسائیت کا بھی آپسی موازنہ کیا تھا۔

وہ ایک باکمال مصنف، شاعر و خطاط تھا۔ تصوف سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ میاں میر اور ملا شاہ بدخشی سے بھی اس کے اچھے روابط تھے۔ یہ حضرات سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ داراشکوہ ۱۶۴۰ میں ملا شاہ کا مرید ہوا۔ وہ شاہ محبّ اللہ الہ آبادی، شاہ دلربا، سرمد، بابا لال داس بیراگی کے افکار و نظریات سے متاثر تھا۔ اسے فارسی، عربی، سنسکرت اور ہندی زبانوں پر کامل عبور و دسترس حاصل تھا۔

تصوف میں برصغیر کے مسلمان حکمرانوں اور خاص کر مغلیہ سلسلہ شہنشاہت میں داراشکوہ کی حیثیت کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ داراشکوہ شہنشاہ اکبر کی روایت کو لے کر آگے چلا اور برصغیر میں مذاہب کی ہمہ گیریت کا نعرہ بلند کیا۔ سکینۃ الاولیا، مجموعہ البحرین، سرّ اکبر اور سوال و جواب داراشکوہ بابا لال داس جیسی نو کتابیں داراشکوہ سے منسوب ہیں۔

داراشکوہ کی تصانیف سے اس کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ سفینۃ الاولیا، سکینۃ الاولیا، رسالہ حق نما، حسنات العارفین اور مجمع البحرین میں مصنف نے اپنے مطالعہ، مشاہدہ داخلی، افکار و خیالات اور عقائد کو ادبی چابکدستی سے بیان کیا ہے۔ داراشکوہ نے بعض سنسکرت کی کتابیں بھی فارسی میں منتقل کی ہیں۔ سر اکبر اور بھاگوت گیتا اسی قبیل کی کتابیں ہیں۔ مکالمہ داراشکوہ و بابا لال دیال اور یوگ بشست اور شاہنامہ شمشیر خان داراشکوہ کے حکم اور خواہش کے پیش نظر وجود میں آئیں۔

سفینۃ الاولیا داراشکوہ کی پہلی تصنیف ہے جو اس نے پچیس سال کی عمر میں لکھی۔ وہ نفحات الانس، کشف

المحجوب، تذکرۃ الاولیا اور طبقات سلطانی جیسے تذکروں سے مطمئن نہیں تھا کیونکہ اس کے خیال میں ان کتابوں میں صوفیائے کرام کے حالات سلسلہ بہ سلسلہ علاحدہ علاحدہ منقول نہ تھے اور ان کی پیدائش و وفات کی تاریخ کی تفصیل بھی اطمینان بخش نہ تھی۔ اس لئے ان خامیوں کو یہ کتاب لکھ کر پورا کیا۔

سکینۃ الاولیا ۱۶۲۴ میں لکھی گئی۔ یہ کتاب سلسلہ قادریہ، حضرت میاں میر اور ان کے خلفا منجملہ ملا شاہ بدخشی کے احوال و فضائل پر مشتمل ہے۔ رسالہ حق نما میں تصوف کے مختلف مقامات کا ذکر کیا گیا ہے۔

سرّ اکبر میں داراشکوہ نے ہندومت اور سنسکرتی ادب کا تفصیل میں جائزہ لیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ سنسکرت میں گیان یعنی علم کے حصول کے لیے نہایت منظّم طریقہ کار موجود ہے۔ اس نے سنسکرت کے باون اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا۔ وہ اس کتاب کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ اس نے بنارس سے ہندو پنڈتوں اور یوگیوں کی بڑی تعداد سے ملاقات کی اور دہلی میں چھ مہینوں میں اس کتاب کو مکمل کیا جب اس کی عمر بیالیس برس تھی۔ یوں اس کتاب کی صورت میں وہ ایک بڑے وژن کے ساتھ ایک مذہبی عالم کے طور پر سامنے آتا ہے۔ کوئی ایک صدی کے وقفے کے بعد اس فارسی متن کا فرانسیسی میں اور پھر انیسویں صدی کے آغاز میں لاطینی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ یورپ میں ان تراجم نے داراشکوہ کی علمیت کا اعتراف جید علمائے دین نے کیا۔ بعدازاں اس کے تراجم جرمن اور دیگر زبانوں میں ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کا فارسی سے پنجابی زبان میں ترجمہ سکھوں کے دسویں گرو 'گرو گوبند سنگھ' نے کیا تھا جنھوں نے خالصہ سنگھ کی بنیاد رکھی تھی۔ داراشکوہ نے بنارس کے پنڈتوں کی مدد سے اپنیشد کے پچاس ابواب کا ترجمہ سرا کبر کے نام سے کیا۔

دارا کسی جاسوس کی طرح مذاہب کے درمیان بھائی چارے کی تلاش کرتا رہا۔ قرآن کے ایک حصہ میں چھپی ایک کتاب کے ذکر یا کردار سے وہ اِس بات کا قائل ہو گیا کہ یہاں اشارہ اپنشدوں کی طرف ہے۔ دارا نے فلسفہ وحدت الوجود کے اصولوں کو ماننا شروع کیا، جس کے مطابق تمام مذاہب خالق کی تلاش میں کسی توحید پسند سچائی میں ملتے ہیں بالکل ویسے ہی جیسے ندیاں سمندر میں ملتی ہیں۔ دارا کا ماننا تھا کہ ہندو ویدانتی فلسفہ کے مطالعہ سے اسلام کے پوشیدہ راز اُس کے سامنے آ رہے ہیں۔ جس سے اُسے اتنا خاص علم حاصل ہوگا کہ وہ بغیر کسی چیلنج کے تخت پر جا بیٹھے گا۔

داراشکوہ نے مجمع البحرین (دو سمندروں کی ملنے کی جگہ، سنگم) کے نام سیا یک کتاب لکھی لکھی جس میں اسلام اور ہندو مذہب کی توحیدی لکیر کے مابین مماثلت پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ مذاہب کے تنوع کو تلاش کرنے کیلئے مجمع البحرین کو اُن ابتدائی کاموں میں سے ایک مانا جاتا ہے جو اسلام اور ہندو مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب کے درمیان اتحاد کی وکالت کرتے ہیں۔ یہ کتاب اسلامی تصوف اور ہندومت کے نظریہ ویدانت کے باہمی موازنے پر مشتمل ہے۔ اس میں ہندو یوگیوں اور مسلمان صوفیا سے طویل مباحث موجود ہیں، جن کا موضوع جوہر خداوندی اور نظریہ آفرینش ہے۔ مجمع

البحرین کو مصنف نے وحدت کا سرچشمہ قرار دیا ہے اور دو بڑے مذاہب یعنی اسلام اور ہندومت کے پیروؤں کے مشترکہ نظریات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے اور ان دونوں کو ایک ہی سمندر کے دو دھارے بتایا ہے۔اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلامی تصوف اور ویدانت میں لفظی اختلاف کے سوا کوئی فرق نہیں ہے۔مسلمان ان دونوں میں سے جس کی بھی تقلید کریں حقانیت کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔

داراشکوہ رامائن سے خاصا واقف تھا۔اکبر اور جہانگیر کے توسط سے شاہ جہاں کی شاہی لائبریری میں دارا کا سامنا اُن کتب سے ضرور ہوا تھا۔۱۶۵۰ء کی دہائی کے وسط میں، دارا کو ہندو مذہب کے بارے میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ دارا نے نہ صرف تصوف پر متعدد تخلیقات مرتب کیں بلکہ ہندو اور اسلامی تصورات کے موازنہ پر کام کرتے ہوئے دونوں مذاہب کو برابر سمجھا۔

داراشکوہ ایک شاعر بھی تھا۔شاعری کا موضوع بھی تصوف اور وحدت الوجودیت کا پرچار ہوا کرتا تھا۔اسلامی تاریخ میں وحدت الوجود کے فلسفہ کی بنیاد رکھنے کا سہرا معروف صوفی ابن عربی کے سر بندھتا ہے، تاہم سنسکرت ادب اور برصغیر کی تاریخ میں اس کی ابتدائی صورتیں موجود ہیں۔داراشکوہ نے معروف کتابوں یوگ بششت اور گیتا کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔اس اپنے دیباچے میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کو

دیگر مذاہب سے متعارف کرانے ،ان کے رہن سہن کو سمجھنے اور ان کے ساتھ ایک پرامن معاشرہ قائم کرنے کے لئے یہ تراجم کیے جارہے ہیں۔

داراشکوہ برصغیر میں مذہب کی بنیاد پر روا رکھی جانے والی منافرت اور تنگ نظری کو ختم کرنا چاہتا تھا۔اس خواہش کا اظہار اس کی کتابوں میں ایک سے زائد جگہوں پر ملتا ہے۔اس نے ویدانت کا بہت ہی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ نہایت وسیع المشرب اور کشادہ ذہن کا حامل انسان تھا۔مذہبی رواداری اور سماجی ہم آہنگی پر اس کا یقین کامل تھا۔اس نے اسلام اور ہندوازم کے مشترکات کی جستجو کی اور محبت اور انسانیت کے پیغام کو عام کیا۔وہ قومی یکجہتی اور اتحاد کا ایک نشانِ امتیاز تھا۔صوفیا اور رِشی منیوں سے اسے گہری عقیدت تھی۔اس نے 52 اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کرکے باہری دنیا میں اپنشدوں کا مکمل تعارف کرایا۔

امریکا میں بطور پروفیسر اپنی خدمات انجام دینے والی سپریا گاندھی نے بجا طور کہا ہے کہ ''داراشکوہ کسی جاسوس کی طرح مذاہب کے درمیان بھائی چارے کی تلاش کرتا رہا''۔

محترمہ سپریا گاندھی کے بقول داراشکوہ کے دربار میں ایک جوگی اور اس کے متعدد شاگرد بھی موجود تھے۔ان تمام لوگوں کو شاہی خزانے سے امداد ملا کرتی تھی۔(دی امپر رہونیور واز، سپریا گاندھی، صفحہ۱۶۲)۔

داراشکوہ درحقیقت ایک صوفی منش انسان تھا۔وہ مذہبی رواداری وقومی یک جہتی کے اصول پر تاحیات قائم رہا۔اس نے اسلام اور دیگر مذاہب کے درمیان اتحاد کو قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔افسوس کہ باہمی رواداری کوفروغ دینے والی یہ شخصیت زیادہ دنوں تک دنیا میں نہ رہ سکی۔شاہجہاں کی موت کے بعد تینوں بھائیوں میں سموگڑھ میں جنگ چھڑ گئی،جس میں داراشکوہ کوشکست فاش ہوئی اور اورنگ زیب مغلیہ سلطنت کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔داراشکوہ نے پنجاب میں شاہ عباس دوم سے مدد حاصل کی،لیکن ایک افغان بلوچ سردار ملک جیون کی غداری کی وجہ سے مغل فوج کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا۔یہ وہی سردار تھا، جسے ایک مرتبہ داراشکوہ نے شاہجہاں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچایا تھا۔اورنگ زیب عالمگیر کی سربراہی میں مذہبی علما کی ایک مجلس نے داراشکوہ کے مقدر کا فیصلہ کیا اور اسے بدعتی قرار دے کر اس کے قتل کا فتویٰ جاری کیا اور اسے 9 ستمبر 1659 کوقتل کر دیا گیا۔کہا جاتا ہے کہ داراشکوہ کوقتل کر کے اس کی لاش کوایک ہاتھی پر لدوا کر اسے دہلی میں پھروایا گیا۔اور ہمایوں کے مقبرے کے احاطے میں ایک غیر معلوم جگہ دفن کر دیا گیا۔داراشکوہ کو گرفتار کرانے میں اس کی بہن روشن آرا بیگم نے بنیادی کردار ادا کیا تھا اور اس نے اس خاندان کے خلاف سازش کی تھی،لیکن وہ بھی شہنشاہ اورنگ زیب کے اعتماد کو بحال نہیں رکھ سکی اور بعدازاں اسے بھی اورنگ زیب کے حکم پر زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر سعدیہ جعفری
گیسٹ لکچرر، شعبۂ عربی و فارسی
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

غزالی مشہدی۔شخصیت وشاعری

شاہ طہماسپ کی تخت نشینی کے ٹھیک تین سال بعد مشہد کے کسی گمنام گھرانے میں غزالی کی پیدائش ہوئی۔شعراء بالعموم اپنی تاریخ پیدائش کو بیان کرنے میں لاپرواہوتے ہیں لیکن غزالی نے احتیاط سے کام لیا۔کہتا ہے کہ اس شہر میں پیغمبر کی ہجرت کے نوسوتینتیس برس گزرنے کے بعد جہان قدم سے شہر حدوث میں وارد ہوا کہتا ہے :

دریں مدینہ پس از ہجرت رسول امین
گزشتہ نہصدوسی و سہ از شہور سنین
بشہر بند حدوث آمدم زملک عدم
بدین حضیض حوادث زاوج علیین

عجیب اتفاق ہے کہ غزالی کا نام کسی بھی تذکرہ میں نہیں ملتا چنانچہ اس سلسلہ میں اس کا کہنا ہے ۔

خاکساران ترا نام و نشاں پیدا نیست
کس نہ دانست کہ این قوم کجا می باشند
گرسرتاج و غم تخت نداریم چہ شد
عاشقان طائفہ بی سرو پا می باشد

حیدر سلطان شیبانی کے بیٹے علی قلی اور بہادر خان کچھ دنوں غزالی کے سرپرست رہے۔غزالی کی شعری صلاحیتیں دس برس کی عمر سے ظاہر ہو چلی تھیں۔کلیات کے دیباچے میں لکھتا ہے۔''عنفوان شباب کا دور شروع ہوا تو روضہ امام رضا کے لنگر خانے میں چھوٹی سی نوکری کر لی جوانی کی شوریدہ سری نے جہاں گردی اور سیاحی کا شوق پیدا کیا۔مشہد سے روانہ ہو کر شاہ طہماسپ کے دربار میں نوکر ہو گیا۔اس سلسلہ میں کہتا ہے

خود را بتو سپردم شاہا کہ گفتہ ای
خود را بما سپار و عدو را بما گزار

صفوی بادشاہوں کے دربار میں شاعر محض بن کر رہنا اور قدر ومنزل حاصل کر لینا کسی کے لئے ممکن نہ تھا۔ پھر ایک نوجوان شاعر بھلا کس شمار وقطار میں ۔غزالی کے لئے دربار شاہی میں قصیدہ پڑھنا تو درکنار دیدار کی دولت بھی دور ہی سے میسر ہوتی تھی اور وہ بھی بڑی کوشش سے۔

همین بس است که گاهی میسرم گردد
چو بندگان تو از دور دولت دیدار

غزالی دربار میں شاعرانہ صلاحیت کا جوہر دکھانے کا ارمان تو زیادہ پورا نہ کر سکا مگر ایک بہت بڑا فائدہ ہوا کہ موکب شاہی کے ساتھ ایران کے مختلف حصوں میں گھومتا رہا۔ شاعر کے مشاہدے نے بھی قوت حاصل کی ۔ تجربہ وسیع ہوا فکر ونظر میں بلندی آئی اور علم ترقی کرنے لگا۔ وہ جس شہر میں گیا وہاں اہل سخن سے حریفانہ مقابلے کئے ۔ ہر جگہ ارباب ذوق کے ساتھ طبع آزمائی کی ۔مشاعرے کئے اور ہجو کے معرکوں میں طبیعت کی جولانی دکھائی ۔ کچھ دن ہرات میں بھی گزارے ۔ یہ شہر کچھ دن پہلے ہی تیموری سلاطین کی عظمت وشوکت کی جلوہ گاہ رہ چکا تھا۔ یہاں کے قیام کے دوران شاعر کی واردات طبع نے فکر سخن میں تیزی دکھائی اور ''واردات'' کے نام سے دو ہزار شعر کا ایک مجموعہ مکمل کر ڈالا۔

ہرات سے قزوین گیا شہر قزوین میں اس کی دوستی میرزا اشرف جہان قزوینی سے ہوگئی۔ جن کا شمار ایران کی باکمال ہستیوں میں ہوتا تھا۔ لیکن ایک دن چغلخوروں نے غزالی سے آکر کہا کہ میرزا اشرف کی مجلس میں آپ کی برائی ہو رہی تھی۔ پس غزالی نے شرف جہاں کی ایک ہجو کہہ ڈالی لیکن شرف جہاں نے اس کا جواب نہیں دیا بلکہ اس کے جواب میں غزالی کی تعریف میں یہ شعر کہا۔

زہے سر تا بہ پا خوبی ترا بد کس چرا گوید
کدا مین عیب داری تا بہ غیبت غیر وا گوید

غزالی تبریز آیا یہاں بھی شاعروں سے معارضہ ومشاعرہ کا میدان گرم رہا۔ غزالی کا خاص معرکہ وہاں کے مشہور شاعر میر سید علی جدای سے رہا نوبت یہاں تک پہنچی کہ اہاجی رکیکہ از طرفین انشاء شد۔

شیراز میں غزالی کا سامنا مولانا حسین درویش سے ہوا حسین درویش عرفی کے استاد شمار کئے جاتے ہیں۔ تقی اور حدی کے مطابق عرفی کا سارا کمال مولانا حسین کے فیض تعلیم کی برکت تھا۔

شاعر کی شخصیت اجتماعی تجربوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ معاشرے کے مختلف عوامل اس کی زندگی پر گہرے اثرات ڈالتے ہیں۔ انفرادی اطوار وخصائل کی نشونما کا انحصار محض ماحول پر ہوتا ہے۔ بعض افراد کی آفاقیت میں اجتماع کی تصویر محفوظ ہوتی ہے۔ ان کی تنہا شخصیت کے آئینے میں آراستہ انجمن کے تماشے نظر آتے ہیں۔ ان کا قول وعمل اور افکار وعقائد

پورے تمدن کی عکاسی کرتے ہیں۔سوسائٹی کے آشفتہ ماحول کا مشاہدہ اور خلق خدا کی مصیبت کا منظر انسان کے دل و دماغ میں ایک قسم کا ردعمل پیدا کرتا ہے۔اوسط درجہ کی ذہنی صلاحیت رکھنے والا آدمی ایسے حالات میں مغموم اور مایوس ہو جاتا ہے مگر شاعر ہمیشہ روش عام سے الگ رہتا ہے۔اس کی شخصیت پیچ در پیچ ہوتی ہے۔وہ کسی حال میں شگفتگی، لطافت اور تازگی کو خیر باد نہیں کہتا بلکہ طبیعت کو گرانی وافسردگی سے پاک رکھنے کے لئے بذلہ سنجی، شوخی اور مستی رندانہ کا سہارا لئے رہتا ہے۔ ایک شاعر کا دعویٰ ہے ہمارا خمیر آتش وآب کے معمولی عناصر اربعہ سے تیار نہیں کیا جاتا ہماری تخلیق میں شراب کا عنصر لطیف استعمال ہوتا ہے۔اتفاق سے اس دور کے ایران میں خوخلل اور ابتری پھیل گئی تھی اس کے پیش نظر وہاں کی بعض اہل بصیرت ہستیوں نے تصوف سے ملتا جلتا ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ان لوگوں نے انسانی رواداری، بلندی نظر اور صلح کل کو مسلک حیات بنایا اور اپنے نصب العین کا نام آزادی و بے قیدی رکھا۔یہ جماعت اور یہ پوری نسل جو ایران اور ماوراءالنہر کے مخصوص ماحول کی پیداوار تھی جب ہندوستان میں داخل ہوئی تو اپنے ساتھ نئے افکار کا شیرازہ لائی۔اس نئی نسل کے مبصرین نے وسطی ومغربی ایشیا کے محیط میں جو کچھ تجربے کئے تھے ان کا نفاذ ہندوستان میں کیا گیا۔ہندوستانی مورخین ایران اور ماوراءالنہر کی تاریخ اور وہاں کے انسانی ہنگاموں سے بخوبی واقف نہ ہونے کی بنا پر یہ نکتہ نہیں سمجھ پائے کہ اکبر کا نظریہ صلح کل خود اس کے دربار میں تشکیل ہوا یا کہیں باہر سے لایا گیا۔اس جماعت میں قاسم کاہی اور غزالی مشہدی کے بارے میں ملا بدایونی کہتے ہیں ویسے تو سب شاعر عام طور پر بے لگام اور خودسر ہوتے ہیں مگر یہ دونوں (قاسم کاہی اور غزالی) مقتدا اور پیشوائے ہمہ بودند۔

خود بدایونی کے بارے میں دو باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ایک تو ابوالکلام آزاد کی تنقید کہ اس کی زندگی کی تمام سرگرمیوں میں اگر کوئی چیز خصوصیت سے ابھرتی ہے تو وہ اس کی بے لچک تنگ نظری، بے روک تعصب اور بے بدل راسخ العتقادی ہے۔دوسرے جمالیاتی معیار اور مذاق سخن کے سلسلے میں نہایت خلوص اور نیازمندی کے ساتھ ملا بدایونی کا ذاتی اعتراف فرماتے ہیں کہ مجھے شعروشاعری سے کچھ خاص دلچسپی نہیں میں نے معاصر شاعروں کے حالات کو نفائس المآثر کی مدد سے لکھا ہے۔

خراسان کے اجتماعی حالات نے غزالی کے ذکی الاحساس دماغ کو غیر معمولی انداز سے متاثر کیا ان کے سائے میں پرورش پانے کے بعد شاعری کی طبیعت میں ایسا انقلاب آیا کہ مقبول عام روایات اور رائج الوقت عقائد بے معنی نظر آنے لگے۔یہی وہ مرحلہ ہے جہاں روشنی طبع بلا بن جاتی ہے۔وہ معاشرہ اور وہ جہان گیر ودار جو عقائد کے اوپری اور معمولی اختلافات میں سمجھوتے کے لئے تیار نہ تھا وہاں آزاد خیالی اور وسیع المشربی کو کس طرح برداشت کیا جا سکتا تھا۔غزالی نے جو روش جادۂ اعتدال کے طور پر اختیار کی دنیا اس کو بے اعتدالی سمجھی۔سلاست روی اور وصال صلح کے مسلک پر الحاد کا الزام

عائد ہوا۔لوگوں کو اس کے افکار سے کفر و بے دینی کی بو آنے لگی۔تعصب کی ہلاکت خیز آنچ نے سمندر کی پناہ لینے پر مجبور کیا، غزالی کو سمندر کا سفر پسند نہ تھا کیونکہ وہ سمندر کے سفر کو ''زندہ در تابوت رفتن'' کے برابر احمقانہ بات سمجھتا تھا۔کہتا ہے ؎

کے رود عاقل سوی کشتی و بحر
ہر کہ شد دیوانہ و مبہوت رفت
ہیچ دانا شد بہ پای خود بگور
ہیچ عاقل زندہ در تابوت رفت

غزالی خوش تھا کہ اس کے شاعرانہ کمال کی شہرت پھیل رہی ہے۔لیکن اسے کیا خبر تھی کہ ''شیوہ بے قیدی'' کی رسوائی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ بالآخر اس کی بے اعتدالی کی خبر مدعیان شریعت کے کان تک پہنچی اور انھوں نے اس کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا۔زمانے کو اپنی جان کا دشمن دیکھ کر چار و ناچار ہندوستان کی طرف چل پڑا کہ علاوہ کوئی صورت نظر نہ آئی۔ بدایونی نے بڑے مزے سے ایک فقرے میں واقعات کا اظہار کر دیا ہے۔''چون بتقریب الحاد و بی اعتدالی در عراق قصد کشتن او کرد نداز آنجا بہ دکن فرار نمود۔'' غزالی کا شہرہ خود غزالی کے ہندوستان آنے سے پہلے یہاں پہنچ چکا تھا۔اس بات کا ثبوت مذکر احباب کے قول سے ملتا ہے جس کے مولف نے یہ تذکرہ خراسان اور عراق سے دور بخارا میں بیٹھ کر ۹۷۴ھ میں مرتب کیا۔غزالی کے بہت سے دوست شمالی ہندوستان میں آ چکے تھے ممکن ہے ان لوگوں نے خان زمان علی قلی شیبانی کے سامنے غزالی کو دکن بلانے کی تحریک کی۔خان زمان کا دعوت نامہ ایک ہزار روپیہ سفر خرچ چند گھوڑے اور ایک قطعہ لطیفہ آمیز پر مشتمل تھا۔جس میں غزالی کے سر حرف عین کے عدد کے مطابق ایک ہزار روپئے کی پیشکش کا معمہ تھا۔

اے غزالی بہ حق شاہ نجف
کہ سوی بندگان بیچون آی
چونکہ بے قدر گشتۂ انجا
سرخود راگیر و بیرون آی

دکن پہنچ کر غزالی کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔غزالی سب سے پہلے حسین نظام شاہ والی احمد نگر کے دربار میں پہنچا۔نظام شاہی امراء کے دربار میں ملا معین میرک سبزواری کو مشاہیر میں شمار کیا جاتا تھا۔غزالی نے میرزا میرک کے سایہ عاطفت میں جگہ پائی چنانچہ کہتا ہے:

قاصد درد دل بتو گفتم یک یک
جانب دوست اگر میروی اللہ معک

چہ شود گر زلب کام زند صیقل عشق
ساقی بزم گہہ حضرت میرزا میرک
بے غرض مدح تو گفتم چو غزالی دربند
غرض من ز تو اصلانہ کروراست و نہ لک
خوان معنی چو نہادم بتواین بخش رسید
شکرللّٰہ کہ فراموش نہ شد حق نمک
پیر معنی است اگر بلبل گلزار دکن
گرچہ من پیر نیم ہم نیم آخر کو دک

اس موقعہ پر شاعر نے خاص احتیاط اور ہوشیاری سے کام لیا یعنی اسلام اور آل رسول کی دوستی کا حوالہ دے کر کفر والحاد کے گزشتہ الزام کی صفائی بھی پیش کی جس کی پاداش میں ایران سے فرار ہونے کی نوبت آئی تھی۔ کہتا ہے۔

بندہ آل رسول ام ہمہ دانند مرا
پادشاہاں قزلباش و شہان ازبک
نیست اسلام بجز دوستی آل رسول
کافرست آں کہ دراین نکتہ شک آرد شک

خان زمان شعروادب کا انتہائی شائستہ مذاق رکھتا تھا۔ شاعرانہ نزاکت فکر کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کی ایک غزل نے عہد اکبری کے بہت سے شاعروں کو طبع آزمائی پر مائل کر دیا۔ پھر بھی کسی سے وہ لذت ولطافت پیدا نہ ہوسکی جو اس غزل کے مطلع میں ہے۔ کہتا ہے۔

باریک چو موی است میانی کہ تو داری
گویا سر آن مو ست دہانی کہ تو داری

غزالی نے خان زمان کی مدح میں ایک ہزار شعر کی مثنوی ''نقش بدیع'' کہہ کر پیش کی اور فی بیت ایک اشرفی کے حساب سے انعام پایا۔ کہتا ہے۔

☆ خان زمان صاحب امن و امان
پیش رو صاحب آخر زمان
آنکہ خرد یافتہ منشور ازو

چشمۂ خورشید سخن نورازو
☆ داد گرا عیش تو جاوید باد
ظل تو ہمسایۂ خورشید باد
بخت کہ القاب تو پر زرنوشت
تیغ ترا سد سکندر نوشت
☆ ذوق جنوں از سر دیوانہ پرس
لذت شوق از دل پروانہ پرس
آہن و سنگی کہ شراری در اوست
خوشتر از آن دل کہ نہ یاری در اوست

خان زمان نے ایک دن مولانا قاسم کاہی سے غزالی کے بارے میں ان کی ذاتی رائے دریافت کی۔کاہی نے غزالی کے کمالات کی تعریف کی اور تفنن طبع کے طور پر ایک رباعی لکھ کر پیش کی جس میں اپنے کو میر علی شیر نوای اور غزالی کو جامی سے تششبیہ دی۔

کاہی چو غزالی شہ ملک سخنم
زان روی ستایند بہر انجمنم
گویند کہ جامی و علی شیر کہ بود
جامی ست غزالی و علی شیر منم

غزالی کو دربار اکبری تک پہنچانے میں خان اعظم میرزا کا بہت ہاتھ تھا۔وہ بادشاہ کا ہم سن اور ہم بازی تھا اور دودھ شریک بھائی بھی تھا۔اس کی ذات تنوع اور ہمہ رنگی کے اعتبار سے پورے مغل امراء میں لاثانی صفات کا مجموعہ تھی۔علم تاریخ وسیر کا فاضل خط نستعلیق کا منشی سخن فہمی اور شعر گوئی کے ذوق میں کامل بذلہ سنجی اور حاضر جوابی میں بے مثال زمانہ سازی اور مصلحت پرستی کی عادت سے مطلق پاک تھا۔دین الٰہی کے جاری ہونے کے بعد جب دربار کا نقشہ بدلا تو اس نے دربار میں حاضری بند کر دی۔

یہ مان لینا سراسر غلط ہوگا کہ غزالی کو محض اپنے قدر دانوں کی سفارش اور مربیوں کی نوازش کے طفیل ملک الشعرا کا منصب ملا۔شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ طبقہ عمایدوا کابر میں غزالی کے تعلقات کا دائرہ کافی وسیع تھا۔ان روابط کے ذریعہ اس کو سازگار موقع جلدی اور آسانی سے ملنے میں مدد ملی ہوگی لیکن اس کے کلام اور افکار کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے

کہ اس منصب کے لئے غزالی نہایت موزوں، افضل اور مناسب تھا۔غزالی کے اشعار اور اسلوب میں ایک پختہ فکر شاعر اور جہان دیدہ مفکر کی شخصیت نظر آتی ہے۔اس بات کا اعتراف اس کے تمام معاصرین نے کی ہے۔تذکرہ نفائس الماثر میں ہے کہ از خوش طبعاں ونوادر زبان بود، اکبر کے دربار کا ملک الشعراء بننا اس کی ذات کے جوہر کی فتح تھی۔ملک الشعراء بننے کے بعد زندگی کے آخری چھ سال انتہائی اطمینان اور فراغت اور عزت وشوکت سے گزرے۔غزالی کی کوتاہی قسمت عبرت انگیز ہے۔اس کی فکری صلاحیت دین الٰہی کے پیغمبر کے دربار میں ملک الشعراء کے منصب کی منتظر تھی۔وطن سے روانہ ہوا تو عجیب بے سروسامانی کا عالم تھا۔عرصہ تک عزیزان وطن کی یاد تڑپاتی رہی۔بڑی حسرت سے کہتا ہے کہ کاش خواب ہی میں وطن کے خاک کی زیارت ہو جائے۔کہتا ہے ۔

چرخ ز گرد غربتم چہرہ نہ شست ہیچ گہہ
کاش بخواب دیدمی خاک دیار خویش مرا

ملک الشعراء ہونے کے بعد غزالی کو شاہی سواری کے ہمراہ رہنا پڑتا۔تقریبات کے تمام موقعوں پر تہنیت نامے لکھنے پڑتے جس کے متعدد نمونے کلام میں محفوظ ہیں۔

صاحب نفائس الماثر نے لکھا ہے کہ غزالی کے اشعار کی تعداد ستر ہزار تک پہنچتی ہے لیکن کلیات غزالی میں صرف بارہ ہزار اشعار ہیں۔غزالی کی شاعری اور فکری نصب العین کے سلسلے میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اس نے اپنی جرات اظہار اور ندرت طبع کی بدولت اپنی جان کو خطرے میں ڈالا۔اپنے وطن اور عزیزوں کو چھوڑا۔غزالی بنیادی حیثیت سے شاعر تھا۔البتہ اس کی شاعری کے پس منظر میں ایک اخلاقی نظام فکر ملتا ہے۔جس کی وجہ سے اس کی شاعری دلچسپ ودلنشین اور اس کی شخصیت باوقار بن گئی ہے۔ابوالفضل غزالی کو صوفی شاعروں میں شمار کرتا ہے۔اس کی شاعرانہ ہستی اجتماعی حوادث کے ایسے ہجوم سے گزری اور ابھری تھی کہ تصوف کا سہارا لئے بغیر آگے بڑھنے کا راستہ ملنا دشوار تھا۔ہر آدمی زندگی کے خاص قسم کے تجربوں سے روشناس ہوتا ہے۔جن کی بدولت اس کی ذہنی دنیا تشکیل پاتی ہے۔اور بالآخران ہی کے جلوۂ صدرنگ سے فن وجود میں آتا ہے۔غزالی کے لہجے میں دربار کے بہار کی سی مسلسل کیفیت اور جولانی کا ایک عالم ہے۔جو شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔داخلی میلانات کا جوش اس کی نمایاں خصوصیت ہے۔اس کا اندازہ کلام پر نظر ڈالتے ہی ہو جاتا ہے۔اور مثالوں کے لئے دقت اور جستجو نہیں کرنی پڑتی۔

غزلیہ شاعری محض عشق ومحبت کی واردات اور حسن کی ظاہری دلفریبیوں سے سروکار رکھتی تو نوجوانوں کی پسند کا موضوع بن کر رہ جاتی مگر اس صنف کی عظمت اور مقبولیت کا راز کچھ اور ہے۔دراصل یہ اپنی خاص رمزیات اور کنایات کے ذریعہ ہم کو زندگی کے اعلیٰ نصب العین سے روشناس کراتی ہے۔آدمی شدید لگن اور شوق کے بغیر بلند مقصد تک نہیں پہنچ سکتا۔

مشکل آرزو جاں بازی کا مطالبہ کرتی ہے۔غزل میں معشوق اوراس کی دل انگیزیوں کا ذکراسی آرزواورشوق کے لئے ایک دلچسپ کنایہ ہے۔اسی طرح عشق کے باریک رمزشدیدلگن اوردھن کی طرف رہنمائی کے لئے روشنی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حصول مدعا کے لئے تگ ودواور بے رحمانہ تنازعہ آدمی کی فطرت ہے۔عشقیہ ماحول اس کشمکش کو دور کرتا ہے۔محبت کے جذبات کا کرشمہ اورتاثیر یہ ہے کہ آدمی کا دل سوز وگداز میں ڈوب جاتا ہے۔اورنہایت نرم اورلطیف ہوجاتا ہے۔پھراس کی خواہش ہوتی ہے کہ فطرت اورکائنات سے جنگ کے بجائے ہم آہنگی اورصلح کی راہ تلاش کرے۔ ہمارے داخلی کردار کی صفائی اورتہذیب وتربیت میں غزل بہت مدد کرتی ہے۔ یہ فاسد جذبات کو زائل کرنے کا ایک اچھا وسیلہ ہے۔غزل ہمارے جمالیاتی احساس کی تسکین ہی نہیں کرتی بلکہ بہت سے ناگزیرحقائق کی تلاش اوربعض بنیادی عقائد کی تشکیل بھی کرتی ہے۔غزالی مشہدی کی شاعری میں غزل کی پاکیزہ اورشائستہ روایات کی بازیافت ہمیں ہرجگہ نظرآتی ہے۔

☆ حریم دیر کہ زاہد نمی نشست آنجا
لب تو توبہ صد پارسا شکست آنجا
مرا بہ میکدہ جام جہان نما دادند
چہ غم کہ شیشۂ ناموس من شکست آنجا
حریم دیر غزالی نشیمن طرب است
تہی مباد زرندان می پرست آنجا
☆من بجان مشتاق ودل بے صبروہجران خانہ سوز
وصل آسان می کند این محنت دشوار را
گر شدی در عاشقی رسوا غزالی عیب نیست
عشق رسوا کرد در کوی بتان بسیار را

غزالی کی زندگی کا ایک رخ یہ ہے کہ اس پرکفرکا الزام لگتا ہےاورقتل کا فتویٰ جاری ہوتا ہے۔دوسری طرف ہم اس کوایک اخلاقی نظام کا پابند پاتے ہیں۔جس میں حق العباد اوراحترام بشرپہلی شرط ہے۔تحقیراورعیب گوئی سے پرہیز کی تاکیدتکرار کے ساتھ کرتا ہے۔

چون رد و قبول ہمہ درپردۂ غیب است
زنہار کسی را نہ کنی عیب کہ عیب است

غزالی کے اخلاقی تصورات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔وہ اجتماعی نیرنگیوں کا مشاہدہ بھی انھیں تصورات کی مدد سے

کرتا ہے اور دنیا کو حیرت عبرت کی ایک تصویر بتاتا ہے۔

غزالی عشق کی عام اور جانی پہچانی واردات کو اپنا شخصی تجربہ کہنے کے بجائے اس پر ایک فلسفی کی نگاہ ڈالتا ہے۔ اور اس کے لئے قاعدہ کلیہ تلاش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے حسن جہاں بھی ہے شہرت کا مطالبہ رکھتا ہے۔ اور عشق کا تقاضا رسوائی ہے۔ پھر معشوق کا کیا جرم اور عاشق کی کیا خطا۔

حسن شہرت عشق رسوائی تقاضا می کند
جرم معشوق و گناہ عاشق بی چارہ چیست

گزری ہوئی یادوں کو دہرانا بھی آدمی کے لئے باعث مسرت ہوتا ہے۔ بظاہر یہاں غزالی کا تخیل کارفرما ہے لیکن تجربے کی ایسی صداقت اور ہمہ گیری ہے کہ احساس پر حاوی ہو جاتا ہے۔ دراصل ساری دنیا کے ادب میں یادوں کی شاعری قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ اس کی مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ آدمی اپنے ماضی کو لاشعور کے تاریک گوشوں میں ہمیشہ ڈھونڈتا رہا ہے اور ہر وہ صدا جو اس مقام گم گشتہ کے سراغ پر ابھارے دل کے تاروں کے لئے مضراب کی ضرب بن جاتی ہے۔

از بزم جہان بادہ گساراں ہمہ رفتند
ما با کہ نشینیم کہ یاران ہمہ رفتند
نے کوہ کن بے سر و پا ماند نہ مجنون
از کوی جنوں سلسلہ داران ہمہ رفتند
بر خیز کہ ماندیم در این راہ پیادہ
راہست خطرناک و سواران ہمہ رفتند
زین شہر شہیدان تو باگریۂ جانسوز
ماتم زدہ چون ابر بہاران ہمہ رفتند
از دست غمت بے سر و پایان ہمہ مردند
با داغ وفا سینہ فگاران ہمہ رفتند
بر حلقۂ زلف تو چو دیدند گرہ ہا
از سلک خرد سبحہ شماران ہمہ رفتند
زان طوطی طبع تو خموش است غزالی

کائنہ دلان نکتہ گزاران ہمہ رفتند

غزالی کی تصانیف میں نقش بدیع، مراۃ الصفات، مشہد الانوار، آئینہ خیال، گنج اکبری، اسرار مکتوم، سنت الشعرا، واردات، قدرت آثار اور مواہب وغیرہ ہیں۔ جن سے اس کے شاعرانہ کمالات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے دیوان کے کئی مجموعے ہیں۔ جیسا پہلے ذکر ہوا۔ بدایونی نے اس کے اشعار کی تعداد چالیس ہزار بتائی ہے۔ عرفات العاشقین اور ریاض الشعرا نے ستر ہزار اور مولانا آزاد نے اپنے تذکروں میں اس کے اشعار کی تعداد ۹۰ ہزار بتائی ہے۔

شاہی قافلہ کے ساتھ غزالی ۹۸۰ھ میں فتح پور سیکری سے گجرات جا رہا تھا کہ احمد آباد پہنچ کر ۲۷ رجب ۹۸۰ھ مطابق ۱۵۷۲ء کو جمعہ کی شب اچانک غزالی کا انتقال ہو گیا۔ اکبر بادشاہ نے گورستان سرگنج میں دفن کرنے کا حکم دیا اس قبرستان میں گجرات کے بیشتر سلاطین اور اس دربار کے مشائخ کبار دفن ہیں۔ اسیر قاسم کاہی اور فیضی وغیرہ نے تاریخ وفات لکھی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر ثمینہ امین
شعبہ فارسی
کشمیر یونیورسٹی، سری نگر

فارسی ادب کے سائنسی پہلو۔ایک جائزہ

دنیا اکیسویں صدی کے اس مقام پر کھڑی ہے جہاں پر احتمالی زندگی کا تصّور بھی سائنس اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں ہے . جب سے آدم خاکی نہاد نے دنیا کی اس بحر بیکران مین قدم رکھا اس نے ہر روز شب نئی تجربات اور عجائبات کو درک کر کے اپنے لئے سود وزیان کا سامان کیا. اس مناسبت سے زبان وادب کا دائرہ کار اتنا وسیع ہے کہ اس میں سائنس، سیاست، سماجیات، تعلیمات اور ماحولیات کے علاوہ متعدد مضامین اپنے اندر سمائے ہوئے ہیں

زبان انسان کے لئے ایک ذریعہ اظہار ہے جس سے وہ اپنی تمام تر درونی کیفیات واحساساتِ لطیف کو الفاظ کی پیرائے میں سمو کر صفحہ قرطاس پر بکھیرتا ہے . قدیم یونان وروم میں متعدد سائنسی فنون کو کتابی شکل دیکر محفوظ کئے جانے کی شواہد دنیا کے تشیب وفراز میں موجود ہیں . میرا مقصد اس مقالے میں فارسی اور اردو میں لکھے گئیے ان مضامین میں سے چند کا ادراک ہے۔جن مین سائنسی اور ٹکنالوجی کی دنیا کو نگاہِ تخیل سے دیکھ پیرایہ شعری میں ڈہالا گیا ہے. فارسی زبان کے مایہ ناز شعراء اور ادبا نے سائنسی علوم کے بارے میں وہ نکتے بیان کئے ہیں . جن کو تا دیر کہا جائے گا۔فارسی کی زبان جو پارسی سے فارسی تک آ پہنچی میں معتدد ادباء پیدا ہوئے . جنہون نے سائنسی علوم میں اپنے دستِ تجّر کا اظہار کیا انہی مایہ ناز افتخار ہستیوں میں ایک ابوریحان محمد بن احمد بیرونی ہیں . جن کو دنیا میں آج بھی ایک ریاضی دان، ستارہ شناس، ہندشناس، اور زولوجسٹ کی نام سے یاد کیا جارہا ہے . ان کی مشہور کتابوں میں "التجیم در ریاضت ونجوم"، " آثار باقیہ" (تاریخ و جرافیہ)"الجماہر فی المعرفتہ الجواہر" (معدنیات)" تحقیق الہند" اور "قانون مسعودی" خاص طور قابل ذکر ہیں. گو یہ کہ انہون نے ایک سو سے زیادہ چھوٹے بڑے رسائل اور کتابیں لکھی ہیں . اولالزکر کتاب میں البیرونی نے ریاضی اور ستارہ شناسی پر دقیق نکتے بیان کئے ہیں . جن کی بنیاد بعد ازان اسٹرالوجیز نے ستاروں کے بارے میں بہت ساری باتیں اور حقائق بیان کی ہیں . آثارالباقیہ میں جغرافیہ معلومات درج ہیں . جن سے سمتوں کی معلومات اخذ کی گئی ہیں" . الجماہر فی المعرفتہ الجواہر" نامی کتاب میں البیرونی نے کمسٹری میں مستعمل اصطلات اور معدنیات کا ذکر کیا ہے . یہان تک بعض محققین کے مطابق تیں سوفلزیات انکا رنگ و بو اور استعمال کا بہی ذکر کیا ہے. مزکورہ کتاب میں براعظم ایشیاء، افریقاء اور

یورپ میں پائے جانے والے جواہر اور فلزیات کے ذکر کے علاوہ یونانی دانشمندوں اور اسلامی فقہا کی رائے بھی درج ہے. مجموعی طور پر ابوریحان البیرونی نے سائنس کی موجودہ ترقی میں بنیادگری کا کام کیا ہے .اسی صنف کی دوسری محقق رازی ہیں. جنہیں کاشف الکل کے نام سے یاد کیا ہے .الکوہل آج دنیا میں سائنسی اعتبار سے روا سازی میں ایک کارگر کمیکل کی طور پر استعمال ہوتا ہے .رازی نے ابتدا میں کیمیات میں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا اس لئے وہ پہلا شخص ہے کہ جس نے مختلف دہات پر ایک تجربہ کیا اور ایسا کمیکل ایجاد کیا جس سے دہات کو سونے میں تبدیل کیا جاتا رہا ہے. سلفیورک ایسیڈ بھی رازی کی تحقیق کا نتیجہ ہے .علاوہ ازین رازی کو مختلف ادوایات کا موجد مانا جاتا ہے .یورپ میں ان کی بارے میں متعدد کتابیں لکھیں جنہیں ہنری کی دے گریٹ ڈاکٹر اور اچ رالپ کی ہسٹری آف میڈیسن خاص طور پر قابل ذکر ہیں .فارسی میں "سراسرار" کے نام سے رازی کی تصنیف شدہ کتاب کمستری کی بنیادی کتابوں میں شامل ہے۔ رازی کو ایسی تصنیف گردانا جاتا ہے جو کیمیات کی بنیاد ہے.

ابن سینا کو اس صنف میں شامل نہ کرنا ایک صریح غلطی ہی نہیں بلکہ ناانصافی بھی ہوگی .چونکہ انہون نے طب اور کیمیات پر جو کتابیں لکھی ہیں وہ آج بھی یورپی ممالک کی مختلف دانشگاہوں کے نصاب میں شامل ہیں. ابوعلی حسین بن عبداللہ بن حسن بن علی بن سینا کو سرزمین ایران کا ایک برگزیدہ محقق،طبیب، ریاضی دان، روان شناس اور فیزیک دان مانا جاتا ہے۔ان کی کتاب "القانون فی الطب" آج بھی یورپی ممالک میں پرہائی جاتی ہی .علاوہ ازین انہون نے فلسفہ پر بہی متعدد کتابین لکھی ہین .ان کی کتاب قانون ۱۹۷۳م مین نیویارک سے زیورطبع سے آراستہ ہوئی .ابن سینا کی علاوہ جابر بن حیان، محمد الغزاری، یعقوب بن طارق، ابن ترک،الخوارزمی، الکندی،علی ابن ریان طبری، جابر بن ستان، الفارابی اور عبدالرحمٰن العوفی کے نام بھی اس صنف میں شامل ہیں .

علاوہ ازین فارسی زبان میں سیاسیات، معاشیات، طب، طبیعات، ماحولیات اور متعدد کتابیں لکھی گئی جنکا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہیے۔ نثر پر زیادہ بحث کرنا اس مقالے کی طوالت کا باعث ہوگا لہزا میں اپنی بات کو فارسی شعراء کی طرف لانا چاہوں گی۔فارسی نثر کی مانند ہی فارسی شاعری میں بھی طبیعات فلکیات طب ماحولیات پر متعدد ایسی اشعار لکھی گئی جن کا بغور مطالعہ تحقیق نے بعد میں کیا .مولانا جلال الدین رومی بلخی کو تصوف کے میدان کا ایک بحر بیکران تصور کیا جاتا ہے جنہوں نے مثنوی معنوی لکھ کر اہل مغربی کے دلوں میں تجسس پیدا کیا۔مثنوی کا پہلا ہی شعر آدم کی خلقت اور اس کے اندر موجود روح پر سوچنے کی ترغیب یوں دیتا ہے۔

بشنو ازنی چون حکایت می کند
وز جدایہا شکایت می کند

کز نیستان تا مرابریدہ اند
وز نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

برآن مثنوی میں جن حکایات کا ذکر کیا گیا ہے. اس میں ستاروں کی باتیں بھی کی گئی کہ جو سراسر آسمان کے دور تک ایک ساقط قطار میں کہڑے ہیں جسے دور حاضر کی سائنس گلکسی کے نام سے جانتی ہے.

گو کہ خیام کو علم نجوم اور ریاضیات کی وجہ سے دنیا میں شہرت ملی مگر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ موصوف فلسفہ کی علاوہ ستارہ شناسی میں بہی کامل مہارت رکہتے تہے دور حاضر میں ستارون کے علم کے لئے مختلف آلات کا استعمال کیا جاتا ہے فیزکس کی دنیا میں خیام کی بنیادی کتاب میزان الحکمت ہے جس میں خیام نے ذرات کی آپسی کشش کا ذکر بحسن خوبی کیا ہے. اس میں ایک باب مکانیک سیالات ... کے نام سے بہی باندہا ہے جس انگریزی ترجمہ روزن فلد نے کیا ہے. صادق ہدایت نے اپنی کتاب ترانہ ہای خیام میں گردش دوران اور ذرات گردندہ کے نام سے بہی عنوان باہذ ہے جو آجکل سالمات کی مقاطیسی قوت... کی نام سے معنون ہے . خیام نی دنیا کی ابتداء اور وجود کو بڑے حسین پیرائی میں اپنی رباعیات میں بیان کیا ہے۔ جو محققین کے لئے باعث تجسس بنی . ذیل کی رباعی ملاحظہ ہو.

دوری کہ دراو رفتن و آمدن ما است
او را نہ بدایت و نہ نہایت پیدا است
کس می زند دمی درین معنی راست
کہ این آمدن زکجا و رفتن بہ کجا است

حکیم ابوالیاس نظامی گنجوی نے خمسہ لکھ کر فارسی میں ایک نئی صنف سخن کی بنیاد رکھی . مثنوی کو حسین پیرائی اور انداز بیان سے منور کیا . اس کی تتبع میں بہت ساری شعراء نے خمسہ لکہے مگر سائنسی اعتبار سے نظامی کے متعلق ایک--- یورپ کے ایک محقق... نے لکہی ہے جس سے میں نے اس بات کا انکشاف ان الفاظ میں کیا۔ " The rich imagery poetry of nizami ganjawi drw its inspiration for all of time,one of thoese field in his botny."

خمسہ نظامی کے انداز بیان کا ادراک کرنے کے لئے ذیل کے اشعار ملاحظہ کریں . :

ای واہب عقل و باعث جان با حکم تو ہست ونیست یکسان
ای محرّم عالم تحیّر عالم عالم ز تو ہم تہی و ہم پر
ای بصفات خویش موصوف ای نہی تو منکر امر و معروف
ای امر تو را نفاذ مطلق و ز امر کائنات مشتق

نظامی کے علاوہ سعدی کی بوستان میں بھی مختلف نوع جغرافیائی اور سائنسی معلومات کے عناصر موجود ہیں. جن سب کا ذکر مقالہ کے لئے طوالت ہوگا.

مجموعی اعتبار سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فارسی زبان وادب میں سائنس کی بنیادی نکات موجود ہیں . جن کا ادراک علوم سائنس وٹکنالوجی کے لئے باعث فخر ہوگا. جس میں فلسفے کو غزالی نے اپنی کتاب احیاءالعلوم میں بیان کیا وہ بھی درحقیقت ایک سسائنسی نظریہ ہے . مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے . وسطی ایشیائی محققین نے سائنسی کی بنیادگزاری میں ایک کلیدی رول ادا کیا ہے . جس سب کا ذکر محال ہے۔

کتابیات:

خمسہ نظامی گنجوی

زندگی نامہ ابوریحان بیرونی، دردانشگاہ انگلیسی . دسمبر۲۰۱۵

ہزارہ نقوس، محمود کویر، انتشارات ا . چ . اندس میدیا لندن- چاپ ۱۳۹۶

آثارالیاقیہ، ابوریحان البیرونی مصحح ومدون عنر یراللہ علی زادہ تہران-۱۳۹۰

خلاصہ زندگی نامہ علمی دانشمندان، احمد بیر مشک، انتشارات علمی وفرہنگی، تہران، ۱۳۴۱۔

ترانہ ہای

خیام، صادق ہدایت، تہران، ۱۳۸۶۔

مثنوی معنوی، جلداول، فیروزانفر، تہران ۱۳۸۷-

-naami-Wikepedi

-The Botny of Nizamie Khamsa By Christine van Ruy Beke 2007. USA

☆☆☆

یاورعباس میر
ریسرچ اسکالر،شعبہ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ

فارسی ادب پرامام خمینی کے اثرات

فارسی ادب کی تاریخ تقریباً دو ہزار سال سے زیادہ پرانی اور دنیا کے غنی ترین ادبیات میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس ادب نے اپنی پوری تاریخ کے دوران بہت سارے زیر و بم اور تغیر وتبدل دیکھے۔کبھی اس ادب کو اوستائی متون کی آمیزش نے اپنے رنگ میں رنگا تو کبھی عربوں نے اسے اپنے تحت تاثیر قرار دیا۔زبان وادبیات میں تغیر وتبدل عموماً بہت آہستہ آہستہ پیدا ہوتا ہے۔فارسی زبان وادبیات کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا،تاریخ کے مختلف ادوار اور گوناگون تحریکوں نے فارسی نظم ونثر کو بہت متاثر کیا جن میں ''تحریک مشروطیت'' وانقلاب اسلامی'' قابل ذکر ہیں۔ان تحریکوں سے وابستہ علمی و ادبی شخصیات جنہوں نے اپنی تخلیقی صلاحتیوں سے فارسی زبان وادب کو بہت متاثر کیا اُن میں امام خمینی بانی انقلاب اسلامی بھی ایک ہیں۔امام خمینی کی ذاتی شخصیت اوران کے لائے ہوئے انقلاب نے پورے ملک کا نظام وفرھنگ بدل کر رکھ دیا اورادبیات چونکہ فرہنگ وتمدن کا ہی ایک حصہ ہے لہذا اس میدان میں بھی تبدیلی آنا لازمی تھا۔امام خمینی کی ذاتی شخصیت اورآپ کے لائے ہوئے انقلاب نے فارسی ادبیات کو کیسے متاثر کیا اسی موضوع کے مختلف گوشوں پر یہاں روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

امام خمینی ایک شخص نہیں بلکہ کئی شخصیتوں کے مجموعہ کا نام ہے آپ بیک وقت ایک عظیم فقیہ،سیاستدان،صاحب عرفان،ادیب،استاد،شاعر،فلسفی،مرجع تقلید اور رہبر ملت کے لباس میں خود کو آراستہ کئے ہوئے نظر آتے ہیں۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ آپ کی تاثیر گزار شخصیت کے پیچھے رہبر ملت یا مرجع تقلید کا عہدہ کارفرما نہیں بلکہ آپ کی ذاتی شخصیت تھی جس میں ایسے تاثیر گزار اور پُرکشش عوامل موجود تھے جس کی بنا پر آپ نے ملت ایران کو مقام عظمیٰ تک پہنچا دیا اور پوری دنیا میں پہچانے گئے۔آپ نے چونکہ ایک بہت بڑے اور ہمہ گیر انقلاب کی رہبری کر کے اسے کامیابی سے ہمکنار فرمایا جس کی وجہ سے آپ کی شخصیت اور انقلاب اسلامی کے اثرات سیاست کے علاوہ دیگر شعبہ جات پہ بھی مرتب ہوئے۔یہ انقلاب چونکہ ایک اسلامی انقلاب تھا اور اسلام میں فرھنگ،سماج،سیاسیات،معاملات،معاشیات غرض زندگی کا ہر پہلو شامل ہے لہذا ایران میں ان تمام شعبوں میں یکسر تبدیلی آئی۔فارسی زبان وادب کا گہوارہ بھی چونکہ ایران میں ہی ہے اور

ادبیات،فرھنگ وتمدن کا ہی ایک حصہ ہے اس لحاظ سے یہ شعبہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

امام خمینی کو زیادہ تر لوگ ایک مذہبی شخصیت کے عنوان سے جانتے اور پہچانتے ہیں لیکن بہت سارے لوگ اس امر سے بے خبر ہیں کہ آپ ایک بہترین ادیب وشاعر بھی تھے۔آپ کا فارسی شعری دیوان اس بات پہ دلالت کرتا ہے کہ آپ فارسی ادبیات سے بخوبی آشنائی رکھتے تھے اور شعر وشاعری کے اصول وقواعد سے بھی حد درجہ واقفیت رکھتے تھے، شعری دیوان میں اگر چہ انہوں نے خود کو شاعر نہیں گردانا ہے لیکن اصولی اعتبار سے اگر کوئی آپ کے شعری دیوان کا مطالعہ کرے وہ آپ کو شاعر مانے بغیر نہیں رہ سکتا۔آپ کا دیوان اشعار جو کہ آپ کا مکمل کلام نہیں ہے، دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوکر ایران سے باہر کی دنیا میں بھی پہنچ چکا ہے۔ان ترجموں میں عربی، اردو اور انگریزی ترجمے بھی شامل ہیں۔

اس بحث سے قبل کہ "فارسی زبان وادب کو امام خمینی نے کس طرح متاثر کیا" پہلے یہاں پہ آپ کی شخصیت کا مختصر تعارف کرنا بہتر ہوگا۔

آپ کا اصل نام سید روح اللہ ہے،خمین میں پیدائش کے سبب خمینی کہلاتے تھے،انقلاب اسلامی وملت ایران کی رہبری کر کے امام خمینی کے نام سے مشہور ہوگئے۔۲۴ستمبر۱۹۰۲ءکو آپ نے عالم زیست میں قدم رکھا(۱)۔شہر خمین نے سب سے پہلے آپ کو اپنی آغوش میں پناہ دی۔خوش نصیبی سے علمی خاندان سے تعلق رکھنے والے آباء واجداد میسر آئے۔آیت اللہ سید مصطفیٰ آپ کے پدر بزگوار اسلامی تعلیمات کے اعلی مدارج طے کر کے درجہ اجتہاد پہ فائز ہوئے تھے۔ پانچ ماہ کی عمر میں ہی سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا،حکومت وقت کے کارندوں نے ندائے حق بلند کرنے کی پاداش میں انہیں شہید کر دیا تھا۔لہذا طعم یتیمی کی کڑواہٹ سے ابتدا میں ہی آشنا ہوئے۔اپنے بچپن اور لڑکپن کا زمانہ اپنی والدہ ہاجرہ خاتون کے زیر سایہ گذارا، ہاجرہ خاتوں بھی اہل علم وتقویٰ کے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔امام خمینی نے اپنی پھوپھی محترمہ صاحبہ خانم کے دامن میں بھی پرورش پائی جو ایک پاک وپارسا اور بہادر خاتون تھیں۔پندرہ سال کی عمر میں یہ دو مہربان ہستیاں بھی چل بسیں اور آپ ان کے سایہ عاطفت سے محروم ہوگئے۔سترہ برس کی عمر تک خمین میں ہی آپ نے تحصیل علم کیا، پھر ۱۳۳۹ھ میں تحصیل علم جاری رکھنے کے لئے عراق چلے گئے،عراق کا حوزہ علمیہ اس زمانے میں بہت شہرت کا حامل تھا اور بہترین مدارس میں سے شمار ہوتا تھا، وہاں کے ہر دل عزیز استاد شیخ عبدالکریم حائری یزدی اس حوزہ علمیہ میں ایک برجستہ اور نادر روزگار استاد تھے،جنہوں نے بعد میں ایران آکر شہر قم میں حوزہ علمیہ کی بنیاد رکھی۔خمینی صاحب نے عراق میں مرحوم شیخ محمد گلپایگانی سے "منطق" اور مرحوم آقا عباس اراکی سے "شرح لمعہ" کی تعلیم حاصل کی(۲)۔پھر ۱۳۴۰ھ میں جب آیت اللہ عبدالکریم حائری قم تشرف لائے تو اس کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ بھی قم روانہ ہوئے اور بڑی سرعت کے ساتھ دینی علوم حاصل کر کے درجہ اجتہاد پہ فائز ہوگئے۔

امام خمینی نے کافی عرصے تک حوزہ علمیہ قم کے مختلف مراکز جیسے مدرسہ فیضیہ، مسجد اعظم، مسجد محمودیہ، مدرسہ حاج ملا صادق اور مسجد سلماسی میں درس دیا۔ تقریباً ۲۷ سال سے بھی کم عمر میں فلسفہ پڑھانا شروع کیا تھا، ساتھ ہی ساتھ درس اخلاق بھی دیتے تھے۔ سیاسی رسا کشی کے دوران پہلوی حکومت نے مجبور کر کے آپ کے تدریسی پروگرام کو مدرسہ فیضیہ کے بجائے ایک دور دراز مدرسہ حاج ملا صادق منتقل کر دیا۔ جلاوطنی کے دوران نجف اشرف میں چودہ برس تک مسجد اعظم انصاری میں درس دیتے رہے۔ پہلی بار حکومت اسلامی کا نظریہ بھی آپ نے نجف اشرف میں ہی پیش کیا تھا۔

۱۹۶۰ء کی دہائی میں ایران کی سیاسی تاریخ میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جس کی بنا پر روحانی (علماء) طبقہ نے حکومت کے خلاف سخت احتجاج کیا جس میں امام خمینی کی شخصیت سب سے زیادہ ابھر کر سامنے آئی۔ ۱۹۶۳ء میں شاہ ایران نے "انقلاب سفید" کے عنوان سے مملکت میں کچھ غیر آئینی تبدیلیاں کرنا چاہی جس کی مخالفت میں امام خمینی نے شاہ کو مخاطب کر کے بہت سخت لہجے میں ٹوکا اور ان جیسے اقدامات سے پرہیز کرنی کی نصیحت کی۔ امام کی زندگی میں یہی وہ تاریخی موڑ ہے جب آپ کھل کر میدان سیاست میں آئے اور شاہ کو تنقید کا نشانہ بنایا جس کے بعد امام کو کئی مرتبہ گرفتار کر کے بالآخر فرانس اور پھر عراق جلاوطن کر دیا۔ اس کے بعد امام نے جلاوطنی کے چودہ سال عراق (نجف اشرف) میں گزارے، جہاں آپ نے اپنی سیاسی سرگرمی جاری رکھی اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے ایرانی عوام تک اپنا پیغام پہنچاتے اور اپنی انقلابی تحریک کو مضبوط کرتے رہے۔ آخر کار آپ ۱۴ سال کی جلاوطنی کے بعد ۱۹۷۹ء میں اپنے ملک کے عزیز عوام کے پاس واپس پہنچے جنہوں نے آپ کا انتہائی غیر معمولی استقبال کیا جس کی مثال ہمیں تاریخ میں کہیں دور دور تک بھی نہیں ملتی۔ شاہ ایران اور دنیا کی سفاک طاقتوں کے خلاف لڑنے کے لئے آپ کے پاس فقط آپ کی پرخلوص شخصیت اور عوام کا ساتھ تھا۔ لوگوں نے ہر محاذ پر آپ کا ساتھ دیا یہاں تک کہ آپ نے ظالم حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور اسلامی حکومت برپا کی۔ انقلاب اسلامی کے بعد آپ نے دس سال تک اس انقلاب کی رہبری کی اور بالآخر ۳ جون ۱۹۸۹ء میں آپ نے اس جہاں کو خیر باد کہا۔

تاثیر بر ادبیات فارسی

فارسی ادب نے اپنی پوری تاریخ کے دوران بہت ساری تبدیلیوں کا سامنا کیا۔ کبھی اس ادب پر اوستائی رنگ چھا گیا تو کبھی عربوں نے اسے اپنے تحت تاثیر قرار دیا۔ زبان و ادبیات میں تغیر و تبدل عموماً بہت آہستہ آہستہ پیدا ہوتا ہے۔ فارسی زبان و ادبیات کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، تاریخ کے مختلف ادوار اور گوناگون تحریکوں نے فارسی نظم و نثر کو بہت متاثر کیا جن میں "تحریک مشروطیت (Constitutional Movement")اور انقلاب اسلامی (Islamic revolution) قابل ذکر ہیں۔ البتہ انقلاب اسلامی کی نوعیت کچھ الگ ہے جس نے یکا یک پورے ملک کا نظام بدل

کے رکھ دیا۔ان تحریکوں سے وابستہ علمی وادبی شخصیات جنہوں نے اپنی تخلیقی صلاحتیوں سے جہاں پوری دنیا کو متاثر کیا وہیں فارسی زبان وادب پہ بھی گہرے نقوش چھوڑے،اُن میں امام خمینی بانی انقلاب اسلامی سب سے زیادہ نمایاں شخصیت ہے۔

انقلاب اسلامی سے قبل ایران کی سیاسی تاریخ میں ظلم و بربریت کے سیاہ بادل منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ایران کے بہترین فرہنگ وتمدن خواہ وہ طرز زندگی ہو یا ادبیات ہو، وہ سب غربی تمدن سے آلودہ دکھائی دیتا ہے۔ظاہری آلودگی مثلا بدحجابی،تاش و جوا کی لعنت، ناچ وفحاشی کے اڈے اور دیگر سماجی برائیوں کے ساتھ ساتھ فکری گندگی بھی پنپتی نظر آتی ہے۔اس دور کے داستان یارمان نویسوں کی تخلیقات میں اس چیز کا نمایاں عکس ملتا ہے۔لیکن ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس دور میں سبھی صاحبان قلم گمراہ ہو چکے تھے۔ہاں کچھ شعراوادباءاس زمانے میں بھی اپنے قلم کو گندگی سے بچاتے ہوئے ظلم و بربریت اور غرب زدگی کے لئے سراپا احتجاج اور انقلاب کی حمایت کرتے تھے۔لیکن سماج کی مجموعی نوعیت یہ تھی کہ ایران ظلم و بربریت اور غرب پرستی سے جوج رہا تھا۔جس کی بنا پر اس زمانے کا فارسی ادب اخلاقی تنزلی کا شکار ہوکر اپنی دیرینہ عظمت کھوتا ہوا نظر آتا ہے۔صادق چوبک جیسے مشہور ومعروف صاحب قلم کے ادبی آثار کا مطالعہ کر کے بخوبی اس زمانے کے سماج اور ادب کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ان کی لکھی ہوئی داستانوں میں مختلف قسم کی فکری واخلاقی غلاظتیں جیسے فحش کلام، عیش وعشرت اور رقص وسرود کی محفلیں،شہوت انگیز مناظر، بدکار عورتوں کی بدکلامی و بے حیائی وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔یہی وجہ ہے صادق چوبک کی کئی کتابیں جن میں "انتری کہ لوطی اش مردہ بود" ایک ایسی کتاب ہے جو قبل انقلاب سات مرتبہ چاپ ہو چکی تھی ،لیکن بعد انقلاب اس کتاب کی کچھ داستانیں جیسے کہ "چرا دریا طوفانی شدہ" اور "توپ لاستیکی" پر پابندی لگا دی گئی اور انہیں مزید شایع ہونے سے روک دیا گیا۔اسی طرح خانم فروغ فرخ زاد جیسی فکر رکھنے والے شعراء کے منظوم کلام میں بھی ہمیں مبینہ طور پر بے شرمی و بے حیایی کی باتیں دکھائی دیتی ہیں۔ پہلوی حکومت جو انقلاب اسلامی سے پہلے کی حکومت تھی جس نے مغربی تہذیب وتمدن کو ایران کے اندر پھیلانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی،اس حکومت نے بے حجابی کا قانون بنا کر ایران کو مغربی رنگ میں رنگ دیا اور اس کے باوجود جو خواتین پھر بھی حجاب کی پابندی کرتی تھیں ان کے سروں سے زبردستی چادریں چھینی جاتی تھیں۔ اسی طرح مغربی سوچ کو فارسی ادب میں بھی دھیرے دھیرے شامل کیا گیا جس کی وجہ سے فارسی ادب میں بھی مغرب کی بے حیایی وعریانیت داخل ہوگئی۔غرض فارسی ادب میں مغربی تمدن رچ بس گیا تھا کیونکہ جب ملکی حکومت بھی اسی تمدن کی خواہاں اور اسے فروغ دینے پہ تلی ہو تو اس وقت ادب کو اس اخلاقی تنزلی سے بچانا اور بھی سخت ہو جاتا ہے۔لیکن امام خمینی کی بدولت ،انقلاب اسلامی کے بعد یکا یک یہ روش تبدیل ہوئی بلکہ ایران کے پورے فارسی ادب میں انقلاب آ گیا۔

بنیادی طور پر امام خمینی وانقلاب نے فارسی ادبیات کو دو طریقوں سے متاثر کیا:

اول: ادبی ساخت اور دوم: موضوعات

۱۔ تاثیر بر شکل و قالب

شعرا یا ادبا کسی قالب میں بھی اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں جیسے کہ نظم یا نثر، اور پھر نظم میں بھی مختلف قالب جیسے غزل، رباعی، قصیدہ، مثنوی وغیرہ۔ نثری قالب جیسے انشائیہ، ناول، داستان، وغیرہ غرض کسی بھی ادبی قالب میں اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتے ہیں۔ البتہ بعض ناقدین کی نظر میں قالب یا ساختار بہت اہم ہے اور وہ معنی کو الفاظ اور مضمون کو قالب پر قربان کر دیتے ہیں، اسی طرح بعض کی نظر میں اس کے برعکس درست و صحیح ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مضمون و مفہوم کے بہ نسبت قالب کی زیادہ اہمیت نہیں ہے، قالب جو بھی ہو جیسا بھی ہو اگر اس قالب میں اچھے مضامین یا اچھے مطالب نہیں پائے جاتے تو اس کی مثال ایک بے روح بدن یا بے ثمر درخت کی سی ہوگی۔

بعد انقلاب، شکل و ساخت کے اعتبار سے فارسی ادب میں نئے اور با ارزش الفاظ شامل ہوئے جن سے فارسی ادب پہلے تہی دامن تھا مثلا جہاد، استکبار، مستضعف، شہید، امت، مقاومت، بسیج، رزمندہ، ولایت، مبارزہ، ستم ستیزی وغیرہ جیسے الفاظ و اصطلاحات انقلابی ادب میں شامل ہوئے۔ اس کے علاوہ امام خمینی نے بعض ایسی اصطلاحیں فارسی زبان میں شامل کیں جو اس سے قبل کسی نے استعمال نہیں کیں اور اگر کسی نے استعمال کئے بھی ہوں وہ شناختہ شدہ نہیں ہیں، امام نے یہ اصطلاحات بار بار اور تاکید کے ساتھ استعمال کر کے ان کے معانی میں ایک نئی جان پیدا کر دی۔ جیسے کہ اسلام ناب محمدی،، اسلام آمریکائی،، شیطان بزرگ،، جنگ فقر و غنا،، نہ شرقی نہ غربی،، جمہوری اسلامی، ولایت فقیہ،، وغیرہ۔ یہ الفاظ و اصلاحات خصوصی طور پر امام خمینی کے ذریعے پہلی بار فارسی ادب میں شامل ہوئے اور ان الفاظ کو امام خمینی نے اتنا زیادہ اپنی تقریروں و تحریروں میں بیان کیا کہ زبان زد عام ہو گئے۔ نثری اصناف میں زیادہ تر داستانی ادب پر انقلاب و امام خمینی کے اثرات نظر آتے ہیں۔ کس طرح کی اور کن موضوعات پہ داستانیں لکھی جانے لگیں اس کا ذکر آگے آئے گا یہاں پہ فقط قالب یا ساختار زیر بحث ہے۔ امام و انقلاب نے نثر کی نسبت شعری ادب کو زیادہ متاثر کیا، پرانے شعری قالبوں کی نسبت نئے قالبوں اور شعر نو کے طرز پر عرفانی و حماسی ادب وجود میں آیا۔ اس کے علاوہ انقلابی ترانوں کی ایک خاص طرز پر انقلابی اشعار کہنے کی روایت شروع ہوئی۔ اس سب کے باوجود جس چیز کی سب سے زیادہ اہمیت ہے وہ ادبی موضوعات ہیں۔

۲۔ تاثیر بر موضوعات

قالب جو بھی ہو قوم یا سماج پر اس کا کوئی زیادہ منفی یا مثبت اثر مرتب نہیں ہوتا لیکن قالب کے اندر موضوعات بالواسطہ یا بلاواسطہ سماج پر تاثیر گزار ہوتے ہیں، منفی ادب اور گمراہ کن لٹریچر قوم کو گمراہی کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ اسلامی انقلاب کے بعد ان تمام گمراہ قلمکاروں کی گمراہ ادبی کاوشوں پہ پابندی لگا دی گئی جس کی وجہ سے سماج میں بے راہروی یا فساد پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ انسانی اقدار کی پاسداری کرنے والے قلمکاروں کے لئے اب میدان بالکل صاف ہو گیا اور انھوں نے خوب اس دور سے استفادہ کرتے ہوئے بہترین ادبی شہ پارے وجود میں لائے۔ خصوصا داستانی ادب میں بے حد بدلاو نظر آتا ہے۔ اس دور کے داستانوں میں کوئی مافوق الفطرت عناصر یا قدیم دور کی جعلی منظر کشی نظر نہیں آتی، بلکہ نویسندہ کے دل و دماغ پر وہی حالات اور واقعات غالب ہیں جو وہ اپنے دور میں دیکھ رہا ہے، انقلاب کے دوران چونکہ جنگ وشہادتوں کا ایک طویل سلسلہ جاری رہا جس کی وجہ سے ایران خونین مناظر کی جلوہ گری کرتا نظر آتا ہے داستان نویس بھی اپنی داستانوں میں وہی حالات اور وہی منظر کشی کر کے سماج کی اندرونی صورتحال اور لوگوں کا مافی الضمیر پیش کرتا ہے۔ بالخصوص نسل جوان کے مسائل، سیاسی وسماجی حادثات، اجڑے خانوادوں کا درد اور دیگر تازہ مسائل داستانوں کے موضوعات بننے لگے۔ غرب زدگی اور فحش مطالب متروک ہوئے، دینی رجحان عروج پکڑتا دکھائی دیتا ہے۔ معصومہ آباد جیسی داستان نویسوں کی داستانیں اس دور کی ہو بہو تصویریں پیش کرتی ہیں ان کی ایک حقیقی داستان "من زندہ ام" کا مطالعہ کر کے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امام خمینی کس قدر قبل انقلاب بھی پورے ملک پہ چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ البتہ یہ بھی واضح رہے کہ بعد انقلاب صرف ایک ہی ادبی روش قائم نہیں رہی بلکہ موضوعات میں وقت کے مطابق تبدیلی ہوتی رہی، جیسے کہ جنگ کے دوران ظاہر ہے جنگ، شہادت اور گھروں کا اجڑنا جیسے موضوعات اہمیت رکھتے تھے اور انہیں موضوعات کو داستانوں میں جگہ دی گئی۔

شعری اور نثری قالب کے اندر نہایت عمدہ اور انسانی اقدار سے میل کھاتے ہوئے مطالب دیکھنے کو ملتے ہیں۔ موضوعاتی اعتبار سے فارسی ادب میں یہ ایک بہت بڑی تبدیلی ہمیں نظر آتی ہے، بعد انقلاب ادباء و قلمکار مادی و دنیایی مضامین کے بجائے معنویت کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے اور بہت عالی وعمدہ قسم کے شہ پارے وجود میں لے آئے، دینی واسلامی اقدار کو از سر نو زندہ کر کے ادبیات میں شامل کیا گیا، بچوں اور نوجوانوں کی بہتر تعلیم وتربیت کے لئے دینی تعلیمات کو نصاب میں شامل کیا گیا۔ اسی طرح ان شعراو قلم کاروں کے قلم وزبان کی بھی تطہیر ہوئی جو قلم کو بے حیایی اور شرم آور فاسد ادب میں استعمال کرتے تھے۔ بعد انقلاب اسلامی، حکومت کی طرف سے ادبیات فارسی کی تطہیر کے سلسلے میں غیر اخلاقی ادب کی اشاعت روک دی گئی۔

۱۹۷۹ء کے بعد ادبیات فارسی میں ایک نئے ادب کی شروعات ہوئی جسے ماہرین ادبیات نے "ادبیات انقلاب" یا "ادبیات پایداری" کا نام دیا (۳)۔ اس طرح کی ادبی روش میں انقلابی موضوعات جیسے شہادت، مقاومت، پیروزی، ظلم ستیزی، انقلاب، ولایت وغیرہ بیان کئے جاتے ہیں۔ ادبیات انقلاب میں نظم ونثر دونوں شامل ہیں لیکن زیادہ

تر مطالب شعری قالب میں بیان ہوئے ہیں۔شعرانقلاب زیادہ تر امام خمینی، انقلاب اسلامی اور دفاع مقدس کی حمایت پر مبنی ہے۔ذیل میں شعرانقلاب کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

آن گاہ کہ امام آمد (حمید سبزواری)

الا خمینی، ای نائب امام زمان — الا خمینی، ای رہبر خود پرور
الاخمینی، ای آنکہ از مجاہدہ ات — رہا شد ایران از نکبت بت و بتگر
دوبارہ تا کہ شود زندہ مکتب توحید — دوبارہ تا کہ شود تازہ رسم پیغمبر
بریز در خط اسلام طرح — جمہوری بشوی دفتر خود کامگان بی مشعر (۴)

پیشانی صبح (اسرافیلی)

روزی کہ تو آمدی شفق خونین بود — گل ھای چمن ورق ورق خونین بود
از خون ستارہ ہا کہ شب افسردند — پیشانی صبح ، در فلق خونین بود (۵)

خندۂ شیرین بہار (نصراللہ مردانی (۶))

نام نورانی تو در افق یاد شگفت — روح خورشید در آسمان میعاد شگفت
آب و آتش بہم آمیخت در آغاز حیات — غنچۂ بستۂ دل در دم میلاد شگفت
ریخت ہر قطرہ خون تاز گلوگاہ فلق — آفتابی شد و در ظلمت بیداد شگفت
راز بیداری خون در رگ گل می دانست — آنکہ چون لالہ پر پر شدہ در باد شگفت
ای کہ از خانہ روحانی جان می آئی — نام نورانی تو در افق یاد شگفت(۷)

طلوع نور بہاران (سیاوش دیہیمی)

سوار بارہ ی نور از پگاہ می آید — دہید مژدہ کہ آن پیر راہ می آید
بہ تن ردای امامت، کف صحیفۂ نور — شکوہ رحمت حق در نگاہ می آید
اساس دولتِ بیدادگر زِ بنیان — ریخت ز سوی حضرت حق دادخواہ می آید
بہ سالکان رہ عشق و عارفانِ خدای — خبر دہید کہ آن مرد راہ می آید(۸)

یہ تو دوران حیات امام، مشہور فارسی شعرا کی کاوشیں ہیں، جو فارسی ادبیات پر امام خمینی و انقلاب سلامی کے تاثیر کو واضح کر رہی ہیں۔لیکن امام خمینی کی رحلت کے بعد ادبیات فارسی اس سے بھی بڑھ کر متاثر ہوا اور ایک دم سے آسمان ادبیات پر غم آلود بادل چھا گئے۔ یہاں پہ یہ بات بے حد قابل ذکر ہے کہ جب امام خمینی کی رحلت واقع ہوئی تو یہ صدمہ

پوری امت کے لئے اس قدر دردناک تھا کہ ہر زندہ دل انسان آہ وفغاں کرنے لگا،شعرا و ادباء نے بھی اس دردناک حادثہ کو اپنی لطیف زبان میں بیان کیا ہے۔آپ کی رحلت پر اتنا زیادہ لکھا گیا کہ اس کا فقط اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔"در سوگ خورشید"" سوگ نامۂ امام"، "ز اشک پُرس حکایت"،" مجموعہ نغمہ ھای انقلاب"،"حماسہ ھای انقلاب" وغیرہ ایسی کتابیں ہیں جن میں فقط امام خمینی ؒ سے متعلق سوگ ونوحے اور آپ کی شخصیت کے مختلف پہلو درج کئے گئے ہیں۔

"سوگنامہ امام" نامی ایک کتاب جو کئی جلدوں پہ مشتمل ہے جس میں فقط ان شعرا کا کلام جمع کیا گیا ہے جنہوں نے امام خمینی کے انتقال پر اپنا درد بیان کیا ہے۔بندہ حقیر کو قم المقدس (ایران) میں تحقیق کے دوران یہ کتابیں ہاتھ لگی تھیں جن کے چند صفحات کی تصویریں بطور نمونہ میں اپنے ساتھ لے کے آیا ہوں۔مذکورہ کتابوں میں مشہور معاصر شعراء جیسے جواد محقق، قیصر امین پور، فاطمہ راکعی، میر شکاک، زہرہ احمدی زادہ، حسین اسرافیلی، رضا اسمائیلی، سید مرتضٰی آوینی، زکریّا اخلاقی، صفا حسین لاہوتی اور دیگر سینکڑوں شعرا کا وہ منتخب کلام درج کیا گیا ہے جو فقط امام خمینی سے منسوب ہے۔ذیل میں چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

تکرار عاشورا (حسین اسرافیلی)

چیست این شیون، مگر باغ پیمبر سوختہ است؟
یا مگر جبریل را در عرش شهپر سوختہ است
چیست این غوغا، مگر تکرار عاشوراست این
کز شررہا خیمہ آل پیمبرؐ سوختہ است (۹)

بوسہ گاہ اہل نظر (شکراللہ از خاک)

رفتی، ولی نمی رود از دل ولای تو — جانم فدای آن ہمہ مہرو وفای تو
باور نمی کنم ز میان رفتہ ای ہنوز — خالی ز صدر مصطبہ گردیدہ جای تو
دل بردہ از کفم، غزل عارفانہ ات — مستم زشور آن سخن دلربای تو (۱۰)

مہر آسمان ولایت (حسین لاہوتی)

رفتی وجان ز ہجر تو جانا در آذر است — آئینہ دلم ز فراقت مکدّر است
ای میر بارگاہ فضیلت کہ نام تو — لوح زمانہ را زشرف زیب وزیور است (۱۱)

کولہ بارت بہ روی شانہ ماست (حمید آیتی)

حجم ماتم بہ وسعت دریاست

چشم من چشمہ‌وار می گرید
دیدہ خون فشان شہر ہنوز
زین عزا زارزار می گرید

دل ز موج ملال، مالامال
روح را اشتیاق ماندن نیست
بلبلان را ندا دھیم،

دگر

فصل امروز، فصل خواندن نیست (۱۲)

استاد الشعرا محمد حسین شہریار جو معاصر ادبیات فارسی کا ایک تابندہ ستارہ ہے ان پر امام کی شخصیت کا اتنا اثر تھا کہ ان کے دیوان اشعار کا کافی حصہ امام خمینی و انقلاب سے ہی متعلق ملتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

☆ مژدہ ای دل کہ ترا یار، خریدار آمد دل بہ دلخواہ تو و بخت ترا یار آمد
غرفہ حسن چراغان کن و نازی بفروش کز تو ہم مشتری عشق بہ بار از آمد (۱۳)

☆ دلی دارم چو برگ گل کہ از آہی بہ درد آید ولیکن درد عشقش ہم ہمہ با آہ سرد آید
بہ خون دل توان نقاش نقش آسمانی بود بہ شنگرف شفق رنگین سپہر لاجورد آید (۱۴)

خوف طوالت کی وجہ سے ہم یہاں پہ سبھی شعرا کے نمونے بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ چند نمونے فارسی ادب پر امام کے اثرات نمایاں کرنے کے لئے کافی ہیں۔

مندرجہ بالا مطالب کے علاوہ امام خمینی نے شخصی طور پر فارسی ادبیات کو اپنی چند گراں قدر تصانیف سے بھی کافی متاثر کیا۔ نثری تصانیف میں آپ نے چہل حدیث و آداب الصلاۃ تحریر فرمائی جو نام سے دینی و احادیث کی کتابیں معلوم ہوتی ہیں لیکن مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ تصوف و عرفان کی شاہکار ہیں۔ کئی زبانوں میں ان کا ترجمہ ہو کر منتقل ہونا بھی ان کی اہمیت و افادیت کو واضح کرتا ہے۔ ذیل میں آداب الصلاۃ سے ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

یکی از آداب قلبیہ در عبادات و وظایف باطنیہ سالک طریق آخرت، توجہ بہ عزّ ربوبیت و ذلّ عبودیت است، و آن یکی از منازل مہمّہ سالک است؛ کہ قوّت سلوک ہر کس بہ مقدار قوّت این نظر است، بلکہ کمال و نقص انسانیت تابع کمال و نقص این امر است. و ہر چہ نظر انانیّت و انانیت و خود بینی و خود خواہی در انسان غالب باشد، از کمال انسانیت دور، و از مقام قرب ربوبیت مہجور است. و حجاب خود بینی و خود پرستی از جمیع حجب ضخیم تر و ظلمانی تر است۔ (آداب الصلاۃ، ص ۱۱)

شعری تصانیف میں آپ کا ایک دیوان ملتا ہے جو کہ آپ کا مکمل کلام نہیں ہے۔ آپ نے جتنا بھی کلام فارسی میں لکھا تھا وہ سیاسی کشمکش اور نقل مکانی کی وجہ سے ضائع ہوگیا اور بعد انقلاب آپ نے اپنی ایک بہو کے اصرار پر دوبارہ جتنا ہو سکا اپنے منظوم کلام کو قرطاس کے حوالے کیا جس کو بعد میں آپ کے بیٹے حجت الاسلام احمد خمینی نے مرتب کر کے "دیوان امام" کے نام سے چاپ کروایا۔ بعد انقلاب جب آپ کی ایک غزل روز نامہ میں شایع ہوئی تو صاحبان ذوق کی روح مچل اٹھی اور آپ کے اس کلام کو نہ صرف سراہا بلکہ اس کو سر مشق قرار دے کر تضمین بھی لکھ ڈالیں۔ ذیل میں اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔(۱۵)

من بخال لبت ای دوست گرفتار شدم — چشم بیمار تورا دیدم و بیمار شُدم
فارغ از خود شدم و کوسِ انا الحق بزدم — ہمچو منصور خریدا ر سر دار شُدم
دَر میخانہ گشائید برویم شب و روز — کہ من از مسجد و از مدرسہ بیزار شُدم
واعظ شہر از پند خود آزارم داد — از دم رِند می آلودہ مددکار شُدم
بگذارید کہ از بتکدہ یادی بکنم — من کہ با دست بُت میکدہ بیدار شدم

یہ غزل اتنی مشہور ہوئی کہ زبان زد عام وخاص ہوگئی۔ اس عرفانی غزل کی معنوی تفسیر بہت کم لوگ جانتے ہیں یہی وجہ ہے اس کی شرح میں سید عبداللہ فاطمی نیا نے ایک کتاب بنام "فرجام عشق" تحریر فرمائی جس میں آپ نے عوام کی خاطر اس غزل کی عارفانہ تشریح وتفسیر بیان کی ہے۔

اس موضوع کو سمیٹتے ہوئے آخر میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ امام کی بابرکت ذات نہ ہوتی تو نہ انقلاب آتا، نہ ہی ایران مغربی استعمار سے خلاصی پاتا۔ اگرچہ انقلاب، ایرانی عوام کے ذریعے کامیابی سے ہمکنار ہو پایا لیکن یہ امام خمینی کی شخصیت تھی جس نے پوری ملت کو ایک رہبر کے زیر سایہ لاکر ظلم واستبداد کے خلاف کھڑا کیا اور ملت کو عالی شان کامیابی سے نوازا۔ باالفاظ دیگر امام خمینی کی ذات میں وہ عناصر موجود تھے جنھوں نے عوام کو آپ کا شیدائی بنا کر آپ کو رہبر تسلیم کروایا، اور انقلاب اسلامی کی کامیابی کے بعد دس سال تک ملک ایران کے سب سے بڑے رہبر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ بے شک ایسی عظیم ہستیاں بہت مشکل سے اور صدیوں بعد قوم کو میسر آتی ہیں اور پورے چمن کو مہکا کر رخصت ہوتی ہیں۔ بقول شیخ سنایی:

عمر ہا باید کہ تا یک کودکی از روی طبع — عالمی گردد نکو یا شاعری شیرین سخن
قرن ہا باید کہ تا از پشت آدم نطفہ ای — بوالوفای کرد گردد یا شود ویس قرن[۱۶]

منابع وماخذ:

۱۔ سخن بیداری، حمید انصاری، چاپ تہران، ص۱۳

۲۔ پژوھشی درشیوہ ھای ادبی آثار امام، محمد رضا اسدی، چاپ تبریز، ص۱۶

۳۔ https://article.tebyan.net/310867/

۴۔ شعر انقلاب وادبیات پایداری، محمد فولادی، بہاءالدین اسکندری، ص۵۲

۵۔ ایضاً، ص۵۳

۶۔ http://www.magiran.com/npview.asp?ID=2059486

۷۔ مجموعہ شعر آتش نی، نصراللہ مردانی، غزل، خندہ شیرن بھار۔

۸۔ شعر انقلاب وادبیات پایداری، محمد فولادی، ص۵۳

۹۔ سوگنامہ امام، گرد آردگان: محمود شاہرخی، مشفق کاشانی، چاپ اول ۱۳۶۹ش تہران، ص۱۳

۱۰۔ ایضاً،۔۔ ص۱۲

۱۱۔ ایضاً، ص۲۴۹

۱۲۔ سوگنامہ ج۲، ناشر موسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی،، چاپ اول ۱۳۷۱ش، ص۲۹

۱۳۔ دیوان شہریار، ص۴۷۸

۱۴۔ ایضاً، ص۵۲۳

۱۵۔ دیوان امام خمینی، چاپ موسسہ امام، غزل چشم بیمار، ص۱۴۲

۱۶۔ قصیدہ شیخ سنایی، دیوان اشعار، قصیدہ نمبر۱۳۴۔ برگ بی برگی نداری۔

☆☆☆

نصرت فاطمہ
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

حکیم محمد اکبر ارزانی: حیات و کارنامے

حکیم محمد اکبر ارزانی کا شمار ستر ہویں اور اٹھارویں صدی میں ایران اور ھندوستان کے نامور طبیبوں میں ہوتا ہے آپکا اصلی نام محمد اکبر بن میر مقیم تھا۔ پورا نام محمد اکبر ارزان شاہ تھا۔ آپکی حالات زندگی کے متعلق بہت کم مواد ملتا ہے۔ جو معلومات فراہم ہوئیں ان کے مطابق ان کا آبائی وطن شیراز تھا، وہیں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم و تربیت بھی حاصل کی ۔ جوانی میں شیراز کو خیر آباد کہہ کر ھندوستان کا رخ کیا جہاں اسوقت بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت تھی، ہندوستان میں آپ برہان پور (مدھیہ پردیش) میں سکونت پذیر رہے اور یہیں متداول علوم کی تحصیل کی اسکے بعد طب کی طرف متوجہ ہوئے اور آخری وقت تک وہ یہیں مطب کرتے رہے اور اسی جگہ ۱۷۲۲ء/ ۱۱۳۴ھ میں انکا انتقال بھی ہوا۔ انکی جائے پیدائش میں اختلاف ہے بعض لوگ انکو دہلوی بھی لکھتے ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دہلی میں رہے اور وہیں انکا انتقال ہوا۔ تاریخ طب کے مولف اپنی کتاب میں سید ظل الرحمٰن کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انکا انتقال دہلی میں ہوا۔ (ص:۴۱۱)

انکی طبی تعلیم کے متعلق محققین کی یہ رائے ہے کہ جب انہوں نے متداول علوم کی تحصیل کر لی تو فن طب کی طرف مائل ہوئے لیکن طب سے متعلق بیشتر کتابیں عربی زبان میں تھیں اور چونکہ آپ عربی سے کم آشنا تھے اسلئے سب سے پہلے آپ نے اس زبان کو پڑھنا اور سیکھنا شروع کیا اور دھیرے دھیرے انھیں اس زبان سے آشنائی ہوگئی بعد ازیں موضوع طب پر لکھی گئی بیشتر کتابیں جو زبان عربی میں ان سے مستفیض ہونے کے بعد تصنیف و تالیف کی طرف توجہ کی حتیٰ کہ ان کے آثار میں ایک تصنیف عربی اور بقیہ تمام فارسی تصانیف ہیں۔

حکیم اکبر کی طبی کتابوں کو فارسی زبان میں لکھنے اور انھیں منتقل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اول تو انھیں اس زبان پر قدرت تھی کیونکہ آپ کا تعلق ایران سے تھا دوسرے یہ کہ جس وقت وہ ھندوستان تشریف فرما تھے اسوقت عہد مغلیہ کا آخری دور تھا اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں اس زمانے میں فارسی کو دفتری زبان کا درجہ حاصل تھا اسلئے حکیم اکبر نے اپنی کتابوں کو اس دور اور زمانے کی زبان میں لکھنے کا ارادہ کیا۔

اطبائے عہد مغلیہ کے مولف نے ایک جگہ اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ اکبر ارزانی کا تعلق عالمگیر کے لشکر سے تھا اور دکن کی مہم میں ساتھ تھے، ممکن ہے ان کا عالمگیری لشکر سے تعلق فن طب میں مہارت کی وجہ سے رہا ہو اسی لئے ارزانی کو تصنیف و تالیف کا موقع ملا ورنہ اگر دکن کی مہم میں وہ ایک لشکری کی حیثیت سے شامل ہوتے تو اس قدر نادر کتابوں کی تصنیف و تالیف کا وقت میسر ہونا مشکل امر معلوم ہوتا ہے۔

انہوں نے اپنی کتابوں کو فارسی کے سادہ الفاظ اور تکلفات سے دور جو اس زمانے میں عام تھا، کے مطابق ترتیب دیا اور یہی وجہ ہے کہ انکے لقب ارزان کے متعلق کچھ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ انہوں نے طب کی تعلیم یعنی Medical Education کو فارسی زبان میں لکھکر اور بھی زیادہ آسان بنا دیا اور جس کی خاطر انھیں ارزان کا لقب حاصل ہوا۔

حکیم ارزانی کے والد ایک صوفی صفت اور روحانی رہبر تھے یہی وجہ ہے کہ والد کی بدولت انھیں زہد و روحانیت ورثے میں ملی تھی اور جسکی وجہ سے اوائل جوانی میں ہی اپنی پوری توجہ تزکیہ نفس و پاکیزگی روح کی جانب مبذول کی۔ تذکیہ نفس اور روحانی تعلیمات کے زیر اثر ہی انہوں نے اپنی اولین تصنیف طب النبی کی تلخیص پر لکھی۔ آپ نے علوم فلسفہ کے متون کو عمیق غور و فکر اور حکیموں کی طبی کتابوں میں دقیق جستجو اور سالہا سال ذاتی طبابت میں تجربہ سے اور گزشتہ حکیموں اور طبیبوں کے تدارلیس سے ایسی نادر اور بیش بہا کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جو اب تک طبی مدارس میں درسی کتب کا درجہ رکھتی ہیں:

حکیم ارزانی کی نادر اور نایاب کتابوں کی فہرست اس طرح ہے:

۱۔ تلخیص طب النبوی

۲۔ طب اکبر

۳۔ مفرح القلوب

۴۔ میزان الطب

۵۔ حدود الامراض (عربی میں)

۶۔ مجربات اکبری

۷۔ قرابادین قادری

اسکے علاوہ انہوں نے دو مقالے بھی لکھے۔ طب الھندی اور علاج الصبیان۔ آپ نے طب کے علاوہ موسیقی میں بھی ایک رسالہ "تشریح الموسیقی" کے عنوان سے لکھا۔ آپ کی علمی بلندی کا یہ مرتبہ ہے کہ ایرانی حکیموں کی فہرست میں

آپ ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

ارزانی کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب اولاد تھے جیسا کہ کوثر چاندپوری نے اپنی کتاب میں اسکا ذکر کیا ہے، ان کے ایک بیٹے کا نام محمد شکر اللہ تھا، جس کی بیماری کے متعلق انہوں نے حسب ذیل حکایت اپنی مشہور کتاب مفرح القلوب میں بیان کی ہے۔

"محمد شکر اللہ کے جو اس فقیر کا لڑکا ہے، سخت چیچک نکلی اور دانوں میں پانی بھر گیا جلن نہایت شدید تھی، کسی طرح چین نہ تھا، چوں کہ ھندوستان میں دانوں میں شگاف دینے کا رواج بہت کم تھا، فقیر نے بھی کسی کو اس وقت تک یہ مشورہ نہ دیا تھا، آخر ضرورت کی بنا پر بوڑھی عورتوں کے روکنے کے باوجود میں نے سونے کی سوئیوں سے دانوں میں شگاف دئے جہاں سے پانی نکلتا تھا فوراً تسکین ہو جاتی تھی چناچہ آہستہ آہستہ تین پہر میں سارے دانوں میں شگاف دے دیا، اس عمل سے مکمل آرام ہو گیا۔ اس کے بعد بھی بارہا یہ تجربہ کیا گیا۔ (اطبائے عہد مغلیہ: ص۵۲)

کتابوں کے مطالعہ کے دوران یہ بھی بات سامنے آئی ہے کہ انکے ایک چھوٹے بھائی بھی تھے جنکا نام محمد اصغر تھا وہ بھی طبیب تھے لیکن بڑے بھائی کے مقابلے میں انکو شہرت نصیب نہ ہو سکی۔ انکی ایک کتاب "مجربات اکملی" کا پتہ چلتا ہے۔ (اسلامی طب: ۱۱۷)

ذیل میں انکی تمام کتابوں کی فہرست کا مختصراً ذکر کیا جا رہا ہے:

۱۔ تلخیص طب النبوی: یہ آپ کی سب سے پہلی کتاب ہے جو طب نبوی کی تلخیص ہے جسکو بعض لوگ سیوطی کا رسالہ "منھاج الاساوی" کا ترجمہ قرار دیتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کتاب کے متعلق اطلاعات اب فراہم نہیں ہے بس صرف اسکا نام فہرست کتب میں درج ہے۔

۲۔ طب اکبر (۱۱۱۲ھ/۰۱۔۱۷۰۰): یہ حکیم اکبر کی شاہکار تصنیف ہے جو طب النبوی کی تلخیص کے بعد لکھی گئی اور انکی دوسری کتاب ہے۔ اس کتاب کا شمار فارسی میں طب کی مشہور و مقبول کتابوں میں ہوتا ہے جو علامہ نفیس بن عوض کرمانی (المتوفی ۸۲۷) کی مایہ ناز کتاب "شرح اسباب و علامات" کا عربی سے فارسی میں ترجمہ ہے اور بعد میں اردو اور سندھی زبان میں بھی ترجمہ ہوئی۔

مولف نے اس کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں اصل کتاب کی غیر ضروری باتوں کو حذف کر دیا ہے اور بہت سی مفید باتوں کو دوسری طب کی معتبر کتب مثلاً قانون، حاوی، سدیدی، کفایہ مجاھد یہ وغیرہ سے اخذ کر کے شامل کر دیا ہے۔ شرح اسباب و علامات سے اگر حروف علت (چار الف اور ایک واؤ) جدا کر دئے جائیں تو طب

اکبر کی تاریخ اختتام ۱۱۱۲ھ نکل آتی ہے۔(طب اکبر:صفحہ ۱۳)

کتاب کے مضمون کو ۲۷/ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب کئی کئی فصلوں پر مشتمل ہے اور ہر فصل چند اقسام میں منقسم ہے۔ذیل میں چند ابواب کے اسماء کا ذکر کیا جارہا ہے تا کہ تصنیف کی اہمیت وافادیت کا اندازہ ہو سکے:

باب اول۔درتوضیحات بیماری ھای سر

باب دوم۔درتوضیحات بیماری ھای چشم

باب سوم۔درتوضیحات بیماری ھای گوش

باب چہارم۔درتوضیحات بیماری ھای بنی

باب پنجم۔درتوضیحات بیماری ھای دہن وزبان

باب ششم۔درتوضیحات امراض لب

باب ھفتم۔درتوضیحات امراض اسنان ولثہ یعنی دانتوں اور مسوڑوں کے امراض پر

باب ہشتم:درتوضیحات امراض حلق

باب نہم۔درتوضیحات امراض شُش یعنی پھیپھڑا وسینہ

باب دہم۔درتوضیحات امراض قلب

اسی طرح اور بھی ابواب ہیں جن میں الگ الگ بیماریوں سے متعلق امراض اور انکے علاج سے متعلق تدابیر کا ذکر ہے آخری یعنی ستائیسواں باب متفرقہ بیماریوں سے متعلق ہے جن میں چند فصل ہے، پہلی فصل قمل یعنی جوں اور صیبان یعنی لیکھ (بیضۂ سیش) سے متعلق ہے۔

ابواب کے ذکر کے بعد کتاب کے آخر میں طبی اصطلاحات اور کتاب کی تشریح ہے۔یہ ضخیم کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

" صحیح ترین کلامی کہ مشام ناطقہ دانش آئین را کہ آئینہ ادراک محسوسات ومعقولات است ازشیم گذارش آن تقویت تمام دست دھد وسالمتر ینائن۔(طب اکبر)

اسکے متعدد نسخے دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسکے دو نسخے دستیاب ہیں ایک حبیب گنج کلکشن میں اور دوسرا یونیورسٹی کلکشن میں ہے۔پہلا نسخہ ۳۰۳ اوراق پر اور دوسرا ۲۲۷ پر مشتمل ہے۔یہ کتاب نول کشور پریس لکھنؤ سے ۱۹۳۹ میں اور نول کشور پریس کانپور سے ۱۹۱۷ میں طبع ہو چکی ہے اسکے علاوہ لاہور اور ایران سے

بھی شائع ہوئی ہے۔

۳۔مفرح القلوب: حکیم اکبر نے مفرح القلوب کی تالیف طب اکبر کے بعد کی۔ یہ کتاب انہوں نے اپنے ایک عزیز دوست کے اصرار پر جوان سے قانونچہ پڑھا کرتے تھے عالمگیر کے آخری دور حکومت میں شروع کی اور عالمگیر کی رحلت کے بعد یعنی فرخ سیر بادشاہ عالمگیر ثانی کے آغاز جلوس میں یہ کتاب تمام ہوئی۔

اس کتاب کی اصل بنیاد علم طب کی مشہور کتاب القانون فی الطب (ابن سینا) ہے جس کو کافی زیادہ تعداد میں مسلم اور مغربی اطبا نے تلخیص کے طور پر تیار کیا۔اس کتاب کی ایک تلخیص علامہ شمس الدین چغمینی نے جنکا شمار نویں صدی ہجری کے معروف اطباء میں ہوتا ہے، نے لکھی جو" قانونچہ فی طب" کے نام سے جانی جاتی ہے جو کبھی درس نظامی میں طلبا کو طب سے روشناس کرانے کے لئے پڑھائی جاتی تھی۔اس کتاب کی شرح حکیم علامہ اکبرارزانی نے فارسی زبان میں مفرح القلوب کے نام سے لکھی جو چغمینی کی شرح پر بازی لے گئی اور جسکا شمار طب کی بہترین اور نفیس کتابوں میں ہوتا ہے۔

اس کتاب کی مقبولیت اور اہمیت کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ متعدد مرتبہ اس کتاب کی شرحیں لکھی گئیں۔

۱۔شرح مولوی حسین بن محمد استرآبادی

۲۔شرح ملا حسین فتاحی نیشاپوری متوفی ۸۳۲

۳۔شرح عبدالفتاح بن عبداللہ قزوینی بہ نام المفرح فی العلم الطب

۴۔شرح ابوالقاسم بن محمد جعفر بائینی

۵۔شرح لطف علی بن محمد کاظم تبریزی ملقب بہ صدرالافاضل

۶۔شرح محمد مومن جزایری شیرازی متوفی ۱۱۸۱ق

ان میں سب سے معروف ترین شرح مفرح القلوب ہے جو بادشاہ وقت محمد فرخ سیر کے نام معنون ہوئی اور فارسی زبان میں لکھی گئی۔

مولف نے اس کتاب کی تالیف میں چغمینی کے بہت سے طبی مآخذ سے استفادہ کیا ہے لیکن خود اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ اس نے بیشتر مآخذ قانون ابن سینا اور شرح قرشی سے لئے ہیں جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

"در اثنای نگارش این رسالہ اگر چہ اکثر کتب حاضری شدند، لیکن بیشتر از قانون و شرح قرشی مرقوم می گشت۔"

اس شرح میں مولف نے جو بھی مآخذ اطبائے قدماء کے کتب سے لیا ہے اسکا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انہوں نے صرف دوسروں کے اقوال کو نقل کیا ہے بلکہ بڑے بڑے اطبا کے کلام پر نہایت دقیق و عمیق انداز میں نقد و تبصرہ بھی

کیا ہے۔

حکیم اکبر کی یہ شرح پانچ مقالوں پر مشتمل ہے اور ہر مقالہ کئی کئی فصلوں میں منقسم ہے۔ مقالے کا عنوان عربی زبان میں ہے جبکہ فصول کے عنوان فارسی میں ہیں۔ مقالوں کی فہرست اس طرح ہے۔

۱۔المقالة الاولیٰ فی الامور الطبیعه

یہ مقالہ پانچ فصول پر مشتمل ہے:

فصل اول۔ در بیان ارکان امزجہ

فصل دوم۔ در بیان اخلاط

فصل سوم۔ در بیان اعضا

فصل چہارم۔ در بیان قوتہا

فصل پنجم۔ در بیان بقیہ امور طبیعی

۲۔مقاله الثانیه فی التشریح

۳۔مقاله الثالثه فی احوال بدن الانسان و اسبابها

٤۔المقالة الرابعة فی النبض التفسرة

٥۔المقالة الخامسة فی تدابیر الاصحاء و علاج المرض علیٰ وجه کلی۔

اور آخر میں خاتمہ ہے۔ یہ کتاب نول کشور پریس لکھنؤ اور لاہور پاکستان سے شائع ہو چکی ہے۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسکا ایک نسخہ موجود ہے جو یونیورسٹی کلکشن میں جو کل ۳۲۶ اوراق پر مشتمل ہے۔

کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"الحمد لله رب العالمین و الصلوٰة السلام علیٰ سید المرسلین و علیٰ آله اصحابه اجمعین۔" (مفرح القلوب)

۴۔میزان الطب: یہ حکیم اکبر ارزانی کی طب پر چوتھی مشہور کتاب ہے جو مفرح القلوب کے بعد لکھی گئی، یہ کتاب علم طب کے ابتدائی اصول وضوابط اور امراض معالجات کا ایک مختصر مجموعہ ہے جسکو مولف نے اپنے بیٹے اور دوسرے اہل قرابت کے فرزندوں کو علم طب کی تعلیم دینے کے لئے تالیف کیا۔ بعد کے ادوار میں محمد شریف بن محمد بخاری نقشبندی نے فارسی میں "اُمان الطب" یا شرح میزان الطب ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء کے نام سے اسکی شرح لکھی، انیسویں صدی میں اسکے کئی اردو ترجمے ہوئے۔

یہ کتاب تین مقالوں پر مشتمل ہے۔مقالہ اول اور دوم کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جبکہ مقالہ سوم مفصل ہے جو ۱۲۵ ابواب پر مشتمل ہے جس میں الگ الگ بیماریوں کی وضاحت کی گئی ہے اور متعدد بیماریوں کے علاج اور تدابیر کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب سادگی بیان کے اعتبار سے طب کی اولین کتابوں کی فہرست میں شمار ہوتی ہے جو ھند وایران میں طبی مدارس میں درس کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔

مقالوں کی فہرست اس طرح ہے:

مقالہ اول: درعلامات کیفیات چہارگانہ یعنی حرارت و برودت ورطوبت و یبوست

مقالہ دوم: در بیان ادبیہ مفردہ ومرکبہ وغذ یہ

مقالہ سوم: در بیان امراض وعلاج، جوکل ۱۲۵ ابواب پراور ہر باب چند فصول پر مشتمل ہے۔

چند ابواب کی فہرست کچھ یوں ہے:

باب اول: درامراض سر جو ۲۸ فصل پر مشتمل ہے۔

باب دوم: درامراض عین جو ۳۵ فصل پر مشتمل ہے۔

باب سوم: درامراض جفن وحدب ۲۸ فصل پر۔

باب چہارم: درامراض اذن یعنی گوش ۱۲ فصل پر۔

باب پنجم: درامراض انف یعنی بنی ۱۱ فصل پر۔۔۔

اوراسی طرح باقی باب بھی اسی طرح کی متعدد بیماریوں سے متعلق ہے۔

کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"الحمد لله رب العالمين و الصلوة و اسلام على سيد المرسلين و على آله الطاهرين اما بعد ۔"(میزان الطب)

پہلی بار یہ کتاب ۱۲۶۶ھ یعنی ۱۸۷۰ء میں چھپی تھی اوراب تک دس سے زائد مرتبہ الگ الگ جگہوں سے شائع ہوچکی ہے۔

فارسی زبان میں یہ کتاب نول کشور پریس لکھنؤ سے ایک مرتبہ، مطبع علوی لکھنؤ سے ایک بار، تین بار لاہور سے ایک بار قم سے اور ایک بار انتشارات المعی تہران سے شائع ہوئی ہے۔اسکے علاوہ اردو زبان میں بھی یہ کانپور، دہلی اور کراچی سے شائع ہوئی۔

۵۔حدودالامراض: یہ حکیم اکبر کی وہ واحد کتاب ہے جسکو انہوں نے عربی زبان میں لکھا جو طبی اصطلاحات سے متعلق لغت

ہے جسکی ابو القاسم میر قدرت اللہ خان (المتوفی ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۴ء) نے فارسی میں شرح لکھی۔ یہ کتاب ۱۸۵۰ء میں افغانستان سینٹر کابل یونیورسٹی سے شائع ہوئی۔ اسکا ایک مخطوطہ اوسلر لائبریری میں ہے۔

۶۔ مجربات اکبری: یہ کتاب مولف کی چھٹی اہم کتاب ہے جو قرابادین قادری سے پہلے اور حدود الامراض کے بعد لکھی گئی۔ یہ کتاب طب اکبر کی نظر ثانی کا خلاصہ ہے۔ کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

" الحمد لله الزی هدان الی الصراط المستقیم و الصلوة علی محمد مالزی وصف بانك علی خلق العظیم و علی اله و اصحابه الزی۔"(مجربات اکبری)

جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولف نے کتاب کا آغاز خدا کی حمد وثنا سے کیا ہے اور اسکے بعد رسول ﷺ اور اصحاب کرام کی تعریف وتوصیف بیان کی ہے۔ اور اسکے بعد سبب تالیف میں بتایا ہے کہ یہ کتاب ان مرکب ادویات اور نسخہ جات کا مجموعہ ہے جو انھیں اہل تجربہ سے دستیاب ہوئے اور متفرق حالت میں موجود تھے، سہولت کے لئے ان سب کو جمع کیا گیا اور ترتیب دیکر ایک کتابی شکل میں منتقل کیا گیا پھر مرض کے زیر عنوان اسکے معالجات کو یکجا طور پر درج کیا گیا۔ مطالب کتاب کو مقدمہ، فصول اور ۲۳/ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مقدمہ میں بہت سے فائدوں کا ذکر ہے مثلا:

۱۔ فائدہ تراکیب ہلیلہ یعنی ہرڑ کے استعمال میں۔

۲۔ فائدہ فلزات یعنی دھات کے مارنے اور صاف کرنے کے بیان میں

۳۔ فائدہ درصاف کردن گندھک

۴۔ فائدہ درترکیب شنگرف

۔ فائدہ وترکیب کشیدن سیماب از شنگرف۔

اس طرح اور بھی بہت سے فائدے اور تراکیب کا ذکر مقدمہ میں کیا گیا ہے اسکے بعد ابواب کا ذکر ہے جس کی ابتداء "امراض سر" سے ہوتی ہے اس باب میں سر کی بیماریوں سے متعلق انکے علاج اور ترکیب کا ذکر ہے جنھیں چند فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے جیسے فصل اول صداع یعنی دردسر کے بیان سے متعلق ہے۔ اس طرح اس کتاب میں مولف نے کل ۲۳ /ابواب کا ذکر کیا ہے جیسا کہ اول ذکر کیا جاچکا ہے اور ہر باب میں الگ الگ امراض سے متعلق انکا علاج اور تراکیب کا بیان ہے۔ اسکے علاوہ اس کتاب کے آخری باب میں متفرق پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے مثلا پتھر پر نقاشی کرنے کا طریقہ، جانوروں اور پرندوں کے شکار کرنے کا طریقہ وغیرہ۔

یہ کتاب ۱۸۷۴ء میں نول کشور پریس کانپور سے طبع ہو چکی ہے۔اس کتاب کا ایک مخطوطہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے حبیب گنج کلکشن میں موجود ہے جو ۱۲۵ اوراق پر مشتمل ہے۔

۷۔قرابادین قادری: یہ حکیم اکبر کی سب سے آخری کتاب ہے جو فن طب میں ایک معتبر اور مفید کتاب سمجھی جاتی ہے جو ۱۱۳۰ھ/۱۸/۱۷۱۸ء میں تالیف ہوئی۔

"قرابادین" ایک ایسی جامع دستوری کتاب کو کہتے ہیں جس میں ادویہ مفردہ کو مرکب کرنے کے مختلف اصول و ضوابط سے بحث کی گئی ہو اور اس کے لئے واضح اصول وقوانین طے کئے گئے ہوں۔

قرادادین کے معنی لغت میں اس طرح ہیں: دواؤں کا لغت،لغات الادویہ،مرکب دوائیں،تریاق وغیرہ۔

عربی، فارسی اور اردو میں بہت سی قرابادینیں لکھی گئیں جن میں فارسی میں حکیم اکبر ارزانی کی" قرابادین قادری " کو ایک خاص مقبولیت حاصل ہے۔مولف نے اس کتاب کے لکھنے میں اپنی پوری کوشش کی ہے کہ انکی یہ تالیف ہر لحاظ سے طب میں ایک ایسی کتاب ہو جو اس سے پہلے کسی نے نہ لکھی ہو۔ہر مرض کے متعلق ادویہ مرکبہ کی تفصیل بترتیب حروف تہجی بیان کی گئی ہے،امراض کی ترتیب اعضائے جسم انسانی کے ترتیب کے مطابق رکھی گئی ہے۔مطالب کتاب کو ۲۵ /ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔کتاب کے دیباچہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولف نے دوسرے علوم کی تحصیل کے بعد طبی مسائل کی تحقیق کی جانب توجہ کی اور بعد میں طب میں متعدد کتابیں تالیف کیں۔جیسا کہ وہ کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"میر محمد اکبر عرف ارزانی بعد تحصیل علوم دیگر در تنقیح مسائل طبیعی تمام نمودہ۔"

(قرابادین قادری۔در مطبع فخر المطابع دہلی باہتمام حافظ عبداللہ)

کتاب کے دیباچہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کی تالیف ۱۱۲۶ھ میں ہوئی۔

مولف چونکہ سلسلہ قادریہ سے وابستہ تھے اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ارادت مندوں میں شامل تھے اسلئے شیخ ممدوح کے نام سے برکت حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اس کتاب کا نام قرابادین قادری رکھا۔

کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"ثنای کہ شایان جناب مستطاب حضرت سبحانہ وتعالی است بجز از ذات پاک نیاید پس الثنہ بندگان چنین ذاتی رابغیر لا احصی ثناء علیک چہ ستاید۔"(ایضا)

ایتھے کے بیان کردہ نسخے میں دیباچہ نہیں ہے۔

ابواب کی فہرست اس طرح ہے:

باب اول: درادویہ سر

باب دوم: درادویہ چشم

باب سوم: درادویہ گوش

باب چہارم: درادویہ بینی

باب پنجم: درادویہ لب

باب ششم: درادویہ دندان ولثہ

باب ہفتم: درادویہ دہان وزبان وحلق

باب ہشتم: درادویہ خناق

اسی طرح دیگر اور بھی ابواب ہیں جو قلب، معدہ، جگر، امعاد، گردہ ومثانہ، مقعد ورحم، پستان، مفاصل، حمیات، جلد، حشرات اور احراق وغیرہ وغیرہ جیسے امراض سے متعلق ہیں اور آخر میں ایک خاتمہ ہے جس میں طریق احراق وتشویہ و تحمیص وتقلیہ وغسل ادویہ واتخاذ وتدبیر کو بیان کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے بعض نسخوں میں ابواب کی تعداد ۲۵ ہے اور بعض میں ۲۲۔ پنجاب پبلک لائبریری کے نسخے میں ابواب کی تعداد ۲۲ ہے اور ایتھے کے بیان کردہ نسخے میں ۲۳ ہے۔

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسکے دو نسخے دستیاب ہیں اور دونوں یونیورسٹی کلکشن میں ہے ایک ۲۰۹ اور دوسرا ۲۵۲ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کے بہت سے قلمی نسخے دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ یہ کتاب کئی مرتبہ فارسی اور اردو میں چھپ چکی ہے۔ فارسی میں یہ کتاب لاہور اور دہلی سے شائع ہوئی اور اردو میں یہ کیمیای عناصر کے عنوان سے ۲۰۰۶ میں نئی دہلی سینٹرل کاونسل فار ریسرچ این یونانی میڈیسن، انڈیا سے طبع ہوئی۔ اسکے علاوہ تین مرتبہ نول کشور پریس لکھنؤ سے بھی چھپی ہے۔

طب میں فارسی کتابوں کی تالیف کے علاوہ انہوں دو مقالے بھی لکھے جو "طب الھندی" اور "علاج الصبیان" کے نام سے ہیں۔ طب الھندی ہندوستانی علاج ومعالج پر مشتمل ہے۔ لیکن اب صرف کتابوں میں انکا نام ہی ملتا ہے۔

اسکے علاوہ انہوں نے موسیقی پر بھی ایک رسالہ لکھا جسکا نام "تشریح الموسیقی" ہے یہ کتاب اکبر کے نورتوں میں سے ایک جسکا نام تانسین تھا، کی ھندی میں موسیقی پر مشتمل کتاب "بدھ پرکاش" کا فارسی ترجمہ ہے۔ تانسین کی تصانیف میں بدھ پرکاش کا کہیں پتہ نہیں چلتا، مانکتو ہل کی طرح بدھ پرکاش بھی صرف ترجمہ کی شکل میں موجود ہے۔

شریف حسین قاسمی نے اپنے کیٹلاگ A Descritive Catlouge of Persian Translations of Indian Works میں اسکے تین نسخے کا ذکر کیا ہے۔

1.PUL.Shirani,Lahore .4570/52 . nast.

2.Islamia College,Pishawar,1966,nast .Bahauddin.1902 Bik,P.152

3.Makhdum.S,Shamsuddin Gilani ,Uch,467/2,nast,Ghulam Qadir,Rajab 12 Sammat 1916 Bik.

مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حکیم محمد اکبر ارزانی کا شمار ایران اور ھندوستان کے ان مایہ ناز طبیبوں کی فہرست میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی طبی خدمات کی بدولت ایسی نایاب اور نادر کتابیں تالیف کیں جو فن طب کے میدان میں اپنا ایک اہم اور منفرد مقام رکھتی ہیں۔طب کے موضوعات پر مشتمل آپکی فارسی کتابیں بعد کے ادوار میں اردو ترجمے کے ساتھ اس قدر لوگوں میں اور اس میدان میں آنے والے اور دلچسپی رکھنے والے اطباء کے لئے ایک شاہراہ کی اہمیت رکھتی ہیں۔آپ کی علمی لیاقت اور بزرگی کا یہ عالم ہے کہ نہ صرف ھندوستان میں بلکہ ایران میں بھی آپکا نام مشہور و مقبول اطباء کی فہرست میں گنا جاتا ہے۔ایران کے بزرگ نامور ایرانی حکیم مرحوم میر محمد حسین عقیلی خراسانی نے اپنی طبی کتابوں میں حکیم ارزانی کی علمی بلندی اور انکے نظریے کو سراہا ہے۔آپ نے بہت زیادہ کتابیں تالیف نہیں کیں صرف چند کتابیں ہی لکھیں جو آپکی شہرت اور مقبولیت کے لئے کافی تھیں۔تلخیص طب النبوی۔طب اکبر،مفرح القلوب،میزان الطب،مجربات اکبری اور قرابادین قادری آپکی وہ کتابیں ہیں جو آج تک ھندوستان کے طبی مدارس میں شریک درس ہوتی چلی آرہی ہیں اور نہایت معتبر درجہ رکھتی ہیں۔ان کتابوں کی مقبولیت سے مصنف کے علم و فضل کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے کس قدر عمدہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔

مراجع و مآخذ:

۱۔چاندپوری،کوثر۔(۱۹۶۰)۔اطبائے عہد مغلیہ۔کراچی،ہمدرد اکیڈمی۔

۲۔فاروقی،معین الدین۔(۱۳۵۶ھ)۔اسلامی طب۔حیدرآباد دکن،اعظم اسٹیم پریس۔

۳۔نگرامی،محمد حسان۔(۱۹۸۹)۔تاریخ طب۔نئی دہلی،ترقی اردو بیورو۔

۴۔تسلیم،محمد انوار حسین۔(۱۹۱۷)۔مظاہر العلاج ترجمہ طب اکبر۔کانپور،منشی نول کشور پریس۔

۵۔ارزانی،محمد اکبر۔(۱۹۱۵ء)۔مفرح القلوب فارسی۔لاہور،اسلامیہ اسٹیم۔

۶۔نور،محمد۔(۱۸۷۲ء)۔اکسیر القلوب ترجمہ مفرح القلوب۔لکھنو،منشی نول کشور۔

۷۔حسین،غلام۔(۱۹۵۱ء)۔ترجمہ قانونچہ اردو۔لکھنو،مطبع منشی تیجکمار۔

۸۔ارزانی،محمد اکبر۔(۱۸۸۱ء)۔میزان الطب فارسی۔لکھنو،منشی نول کشور پریس۔

۹۔ارزانی،محمد اکبر۔(۱۸۷۴ء)۔مجربات اکبری فارسی۔کانپور،منشی نول کشور پریس۔

۱۰۔ارزانی،محمد اکبر۔(۱۸۵۵ء)۔قرابادین قادری فارسی۔دہلی،درمطبع فخر المطابع۔
۱۱۔نیمروزی،مجید۔برزو،صفورا۔صالحی،علی رضا۔(۱۳۹۴ھ)۔بررسی بی اشتھای واختلالات اشتھا از دیدگاہ حکیم ارزانی درکتاب میزان الطب۔شیراز،مرکز تحقیقات طب سنتی وتاریخ طب،دانشگاہ علوم پزشکی۔مجلّہ طب سنتی اسلام وایران،سال ششم،شمارہ ی اول
۔
۱۲۔انصاری،نورالحسن۔(۱۹۶۹ء)۔فارسی ادب بعہداورنگ زیب۔دہلی،کوہ نور پریس۔
۱۳۔مفرح القلوب۔ویکی نور،دانشنامۂ تخصصی
۱۴۔میزان الطب۔ویکی پدیا۔دانشنامہ آزاد

15. Qasemi,Sharif Husain.(2014).A Descriptive Catalogue of Persian Translations of Indian Works.Delhi,National Mission for Manuscript.

16.Encyclopedia Iranica.

17.WorldCat.Org.

☆☆☆

رخسانہ
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ

مولانا رومؔی کی مثنوی معنوی کا عرفانی پہلو

فارسی دنیا کی قدیم اور شیرین ترین زبان ہے۔اسی کے متعلق یہ مقولہ بہت مشہور ہے کہ ''فارسی شکر است''۔ فارسی زبان، شاعری کا بہت ہی وسیع اور عظیم ذخیرہ رکھتی ہے اس کو دنیا کی کسی بھی بڑی زبان کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، قطعہ اور دیگر اصنافِ سخن کی شکل میں فارسی شاعری کا ایک بیش بہا اور لازوال خزانہ ہمارے پاس موجود ہے۔جس میں رودکی سے لے کر ملک الشعراء بہار تک عظیم فارسی شعراء کا کلام موجود ہے جس میں مذکورہ شعراء نے اپنے اپنے اسلوب بیان یا طرزِ نگارش سے زبان و بیان اور خیال کے بہت سارے جوہر دکھائے ہیں۔کسی نے درباری شاعری کی تو کسی نے رزمیہ شاعری سے روبرو کروایا۔کسی کا شوق عاشقانہ شاعری کو قلم بند کرنا تھا تو کسی کا نغمہ سرائی۔کسی نے داستان کو نظم کی مالا میں پرویا تو کسی نے حکیمانہ اور ناصحانہ شاعری سے پند و نصیحت کا کام لیا۔طنزیہ اور مزاحیہ شاعری سے لوگوں کا دل بہلایا تو کہیں پر مذہبی شاعری سے لوگوں کے دِلوں کو مذہب کی طرف مائل کیا اور انہیں کے بیچ عارفانہ شاعری کا بھی جلوہ رونما ہوا۔عارفانہ شاعری پر ڈاکٹر ذاکرہ شریف قاسمی کا بیان ہے:

> ''فارسی ادب پر تصوّف کا بڑا احسان ہے۔چھٹی صدی ہجری سے فارسی میں مطالب و موضوع کے لحاظ سے ایک نیا پہلو نظر آتا ہے یہ عرفانی شاعری ہے۔اس شاعری کی دنیا بالکل الگ ہے۔یہاں عقل اور دل محوِ گفتگو ہے اور دل ہی اس کا مخاطب بھی۔اسی زمانے میں پند و نصائح اور حکمت اور موعظت عرفانی مطالب سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے بعض شعراء کے کلام میں عرفانی افکار کو پند و نصاع سے جدا کرنا مشکل نظر آتا ہے۔'' (فارسی شاعری ایک مطالعہ، ص ۱۱۸)

اس ذیل میں جن لوگوں نے اپنی قلم کو آگے بڑھایا ان میں مجدد ابن آدم متخلص بہ سنائی، سنائی نے حدیقۃ الحقیقت عشق نامہ، عقل نامہ وغیرہ میں حکیمانہ اور عرفانی خیالات کو سماجی مسائل کے ہمراہ بیان کیا ہے۔مرزا عبدالقادر بیدلؔ نے محیط اعظم، طور معرفت اور عرفان کے عنوان سے صوفیانہ و عارفانہ مضامین کو اپنی مثنویوں میں بیان کیا ہے۔نظامی گنجویؔ کے عرفانی افکار کو بہت زیادہ کامیابی اور شہرت حاصل ہوئی۔نظامیؔ کی مثنوی ''مخزن الاسرار'' کو اسی قسم کا بہترین نمونہ قرار دیا

گیا ہے۔

اسی صنف میں عرفانی شاعری کا بہترین ترجمان فریدالدین عطارؔ نیشاپوری ہے۔عطارؔ نے اپنی دلکش اور لطیف غزلوں اور سادہ مگر سبق آموز مثنویوں میں عرفانی شاعری کو فروغ دیا ہے۔منطق الطیر مصیبت نامہ، الٰہی نامہ وغیرہ۔عطارؔ کی عرفانی طرز کی شاہکار ہیں۔سناؔئی نے عرفانی شاعری کا باقاعدہ آغاز کیا۔اس کے بعد عطارؔ آئے ان دونوں شاعروں نے عرفانی شاعری کا جو پودہ لگایا وہ ساتویں صدی ہجری میں ایک گھنا درخت بن گیا۔انہی دونوں شاعروں کی کاوشوں کی بدولت اس صدی میں ایک عبقری شاعری پیدا ہوا۔جس نے فارسی میں عرفانی شاعری کو اس کے اوج کمال تک پہنچا دیا۔یہ شاعر مولانا جلال الدین محمد بلخی رومؔی ہیں انہیں مولوی اور مولانا روم کے اَلقاب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔مولانا کی پیدائش ۶۰۴ ہجری میں بلخ میں ہوئی۔آپ کے والد سلطان العلماء بہاؤالدین محمد بن حسینی بھی اسی طرز پر شاعری کرتے تھے اور اپنے زمانے کے عارفوں اور علماء میں شمار کئے جاتے تھے۔تو ظاہری بات ہے کہ مولانا نے بھی عارفانہ شاعری کی تعلیم اپنے والد سے ہی حاصل کی۔اسی زمانے میں آپ کے والد کی شہرت کی وجہ سے بلخ کے باشندے اور تصوّف کے مخالف آپ کو تکلیف دینے لگے اور مجبوراً آپ کے والد کو ہجرت کرنا پڑی۔اس وقت آپ کی عمر ۱۴ سال کی تھی۔

مولانا رومؔی دنیا کے ایک مفکر اور عارف شاعر ہیں۔اہلِ تصوف، اہلِ تحقیق اور حکمت و پند آمیز شاعری کرنے والے شعراء نے آپ کی پیروی کو باعثِ افتخار سمجھا ہے۔بحرِ رمل مسدسِ مقصود میں چھ دفاتر پر مشتمل آپ کی مثنوی ''مثنوی مولانا روم'' تصوّف و عرفان کا ایک لافانی شاہکار ہے۔مثنوی لکھنے کی شروعات مولانا نے ۶۶۰ یا ۶۵۷ ہجری میں کی۔حسام الدین چلپؔی مولانا کے خاص مریدوں اور پیروں میں تھے۔مولانا نے انھیں کی طرف خاص توجہ دے کر پوری مثنوی مرتب کردی۔مثنوی میں اشعار کی کل تعداد چھبیس ہزار ہے اور ہر دفتر کی شروعات حسام الدین چلپؔی کے نام سے ہی ہوتی ہے۔مثنوی معنوی مولانا کے افکار کا گراں بہا ثمرہ اور ان کے اشعار کا بہترین مجموعہ ہے بلکہ یہ فارسی زبان میں عرفان و تصوف کا مکمل ترین دیوان ہے۔مثنوی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر رضازادہ شفقؔ لکھتے ہیں:

> ''مثنوی کی محتویات مسلسل منظوم حکایتیں ہیں اور ان حکایتوں کو بیان کر کے مولانا دینی اور عرفانی نتائج اخذ کرتے اور حقائق معنوی کو سیدھی سادی زبان میں ازراہِ تمثیل بیان فرماتے ہیں۔مولانا خود اپنا ایک مستقل رنگ اور اپنی ایک مستقل آواز رکھے ہیں انھوں نے تصوّف میں اپنا دلکش و بلند و بالا قصر الگ ہی تعمیر کیا ہے اور اس پر اپنا پرچم لہرایا ہے۔'' (تاریخ ادبیاتِ ایران، ص ۳۶۱)

مثنوی میں جس دنیا کا رنگ ملتا ہے وہ روح کی دنیا ہے دنیا جس کی ہر شے جس میں زندگی ہے ہر شے کو سماعت و بصارت کی قوت حاصل ہے۔رومؔی عشقِ حقیقی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔کلام میں بھی انتہائی سوز ہے۔حکمت و فلسفہ کے علاوہ

جذب باطن کے شعلے ان کے کلام سے اٹھ رہے ہیں۔ مولانا نے شاعری کی ہے مگر حسنِ بیان کے چکّر میں نہیں پھنسے جو کچھ کیا بے تکلف کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کلام میں بے پناہ تاثیر ہے۔

مولانا رومؔی کی مثنوی معنوی عرفانی افکار کی چاشنی سے لبریز ہے۔ انہوں نے جگہ جگہ عرفانی پہلو کو کئی تمثیلوں اور استعاروں کے ذریعے سمجھایا ہے۔ اس مختصر سے مقالہ میں مثنوی معنوی کے مطالب و افکار اور عرفانی پہلو کی شرح و تفصیل ممکن نہیں کیونکہ دریا کوزہ میں نہیں سماتا۔ اس لئے یہاں صرف چند اشعار دیئے جا رہے ہیں۔ مثنوی کا افتتاح جس آتشیں اور حزیں نوا سے کیا ہے اس کی نظیر فارسی شاعری میں کم ملے گی۔ مولانا فرماتے ہیں:

بشنو ازنی چوں حکایت می کند
(بانسری سے سن کیا بیان کرتی ہے)
وز جدائی ہا شکایت می کند
(اور جدائیوں کی (کیا) شکایت کرتی ہے)
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند!
(جب سے بنسلی سے کاٹا گیا ہے)
ازنفیرم مردو زن نالیدہ اند!
(میرے نالوں سے مرد اور عورت سب روتے ہیں)
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
(میں ایسا سینہ چاہتی ہوں جو جدائی سے پارہ پارہ ہو)
تا بگویم شرح درد اشتیاق
(تا کہ میں عشق کے درد کی تفصیل سناؤں)
ہر کسی دور ماند از اصل خویش
(جو کوئی اپنی اصل سے دور ہو جاتا ہے)
باز جوید روز گار وصل خویش
(وہ اپنے وصل کا زمانہ پھر تلاش کرتا ہے)
من بہر جمعیتی نالاں شدم
(میں ہر مجمع میں روئی)

جفت خوش حالاں و بد حالاں شدم
(خوش اوقات اور بداحوال کے ساتھ رہی)
ہر کسی از ظن خود شدیار من
(ہر شخص اپنے خیال کے مطابق میرا یار بنا)
ازدرون من نجست اسرار من
(اور میرے اندر سے میرے رازوں کی جستجو نہ کی)

(مثنوی مولانائے روم، دفتر اوّل، ص۳۱)

دنیا کی ہستی ایک ہے اور وہ خدا تعالیٰ کی ذات ہے خدا کے سوا کوئی موجود نہیں جو کچھ ہے حقیقت میں اسی کی ذات ہے اور دنیا تمام خدا کی جلوہ گاہ ہے۔ ہماری روح بھی اس کی ہستی کی ایک کرن ہے۔ جو اپنے اصل نور سے جدا ہو کر اس جہاں میں آئی ہے اس لئے یہ اپنے دلدار کے شوق وعشق اور اس کے دیدار کی حسرت میں اپنی عمر بسر کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ ظلم کے ظلماتی حیات کے پردے کو چیر کر اپنی اصل سے جا ملے۔ اس کے ہجر کے نالے ایسے ہی ہیں جیسے بانسری کو نیستان یعنی کہ اس کے اصل سے کاٹ لینے کے بعد اس کے اندر سے نکالتے سنائی دیتے ہیں۔ ظاہر بینوں اور کوردلوں نے اپنی اصلی بنیاد کو فراموش کر دیا ہے اور وہ روح کی پکار کا جواب دینے میں ناچار ہیں۔

مولانا کے کلام کی متعدد خوبیاں ہیں۔ انہوں نے عارفانہ مباحث کو بڑی سادگی اور تصّوف وحکمت کے پیچیدہ اور مبہم خیالات کو دلچسپ داستانوں اور دل نشیں حکایات کی مدد سے بیان کیا ہے۔

انہوں نے باطن کی توانائی اور وجود کی خوشبو کا احساس طرح طرح سے کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ وجود کی خوشبو جو ہے وہ انسان کو اللہ کے قریب کر دیتی ہے۔ یہ خوشبو اور خوشبو کا پُر اسرار رشتہ ہے۔ خوشبو جو دل میں ہوتی ہے، معبود حقیقی تک پہنچا دیتی ہے اس سے معارف کے دروازے کھلتے ہیں جو عارف ہوتے ہیں ان کے لئے یہ دل دیوار نہیں دروازہ ہے۔ پتّھر نہیں موتی ہے ہم سب جو کچھ آئنے میں دیکھتے ہیں۔ ایک عارف لوہے کے ٹکڑے میں اس سے پہلے دیکھ لیتا ہے یہ دل بہت سے آفتابوں کا مشرق ہے:

☆ آں دلی کو مطلعِ مہتابہا ست
بہر عارف فتحت ابوابہا ست
☆ باتو دیوار است و باایشا در ست
باتو سنگ و عزیزاں گوہر ست

☆ آنچہ تو در آئینہ بینی عیاں
پیراندر خشت بیند پیش ازاں

(مثنوی مولانائے روم، دفتر دوم)

اس ضمن میں مولانا رومؔی مزید رقم طراز ہیں:

گندم از بالا یزیر خاک شد
بعد اذاں اُو خوشۂ چالاک شد
دانہ ہر میوہ چوگردودفیں
بعد ازاں سرہا بر آرد از زمیں
اصل نعمتہا ز گردون تابخاک
زیر آمد شد غذائے جان پاک

مولانا رومؔی فرماتے ہیں کہ گیہوں بلندی سے مٹی کے نیچے گیا پھر خوبصورت لہلہاتا خوشہ بنا، پھل کا دانہ جب زمین میں گرّتا ہے اس کے بعد ہی زمین سے سر ابھارتا ہے۔ تمام نعمتوں کی اصل آسمان سے مٹی تک نیچے آئی تو جان پاک کی غذا بن گئی۔ (مثنوی مولانا روم، دفتر سوم)

مولانا رومؔی ایک بڑے فنکار معلم ہیں جو خارجی اور داخلی زندگی میں ایک خوبصورت توازن دیکھنا چاہتے ہیں۔ مولانا رومؔی کی روحانی تعلیم سے انسان کے ذہن کا کوئی نہ کوئی دریچہ کھلتا ہے اور جو ٹھنڈی اور لطیف ہوائیں ملتی ہیں ان سے بڑی جمالیاتی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ مولانا کی اسی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے شکیل الرحمٰن صاحب فرماتے ہیں:

''مولانا کے کلام میں خشک فلسفیانہ نکات نہیں ملتے، تصّوف کی جمالیات اور اس کی رومانیت کے انگنت پہلو اور سطحیں ملتی ہیں۔ مولانا نے عرفان وتصّوف کی جمالیات میں اپنے فکر ونظر سے بڑی کشادگی پیدا کی ہے اور اس کی رومانیت کو نئی جہتیں بخشی ہیں۔ مثنوی کی تمثیلیں بیداری اور جاگرتی پیدا کرتی ہیں۔ انہوں نے جہالت اور علم کی روشنی کو تاریکی اور روشنی کے استعاروں سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔'' (مولانا رومؔی کی جمالیات، ص ۲۷)

مولانا رومؔی بلاشبہ ایک ایسے بڑے معلم کی نمائندگی کرتے ہیں جو علوم اور فقر کی نعمتوں کا سرچشمہ ہے۔ ایک عارف اور معلّم کی فکر ونظر کی پہچان اس وقت ہوتی ہے جب وہ خرد کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے صاحب جنون بن جاتا ہے۔ اس جنوں میں ذوقِ نظر بھی ہے اور ضرب کلیمی بھی۔ معلم فنکار ہے اور فنکار معلّم۔ دونوں حسن کاروں کے عرفان، دل

کے گداز، دماغ کی جولانی، جذبۂ تلاش وجستجو اور لذّت بے تابی کے قائل ہیں۔

مولانا نے افکاروں اذہان پر بڑا زبردست اثر ڈالا ہے۔ان کے پیرو مقلد بے شمار ہیں۔آپ کا معنوی اور ادبی اثر نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں انتہائی عروج پر ہے آپ کی شہرت مغربی ممالک میں بھی پھیل چکی ہے اور ان ممالک کی مختلف زبانوں میں مثنوی کا ترجمہ ہو چکا ہے مثنوی کی متعدد شرحیں اور تفسیریں بھی لکھی ہیں۔مثنوی ایک طرف مروجہ علوم وفنون میں مولانا کی مہارت کی شہادت ہے تو دوسری طرف ان کے خانقاہی مشاہدات ومعارف کا آئینہ بھی۔ عارفانہ شاعری کے اعتبار سے مثنوی قدرت کلام کا نہایت دلکش نمونہ ہے۔مثنوی کا طرزِ استدلال اس کی ایسی خصوصیت ہے جو ہر پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔مولانا رومؔی کا عرفان، رومانی وژن دنیا کی ایک خوبصورت تصویر پیش کرتا ہے۔

کتابیات:

کتب:

	مصنف کا نام	کتاب کا نام	پبلیشر	سنِ اشاعت
۱۔	اسلام عبد، محمد	افکارِ رومؔی	مکتبہ جامعہ لیمٹڈ، نئی دہلی	
	ذاکرہ، شریف قاسمی	فارسی شاعری ایک مطالعہ	انڈو پرشین سوسائٹی	۱۹۸۷ء
	رحمٰن، شکیل	مولانا رومؔی کی جمالیات	عرفی پبلیکیشنز	۲۰۰۲ء
	سجاد حسین، مولانا قاسمی	مثنوی مولانائے روم	سب رنگ کتاب گھر، دہلی	۱۹۷۴ء
	شفق، ڈاکٹر رضا زادہ	تاریخِ ادبیات ایران	کتب خانہ خورشیدیہ، دہلی	۲۰۱۴ء

رسائل:

۱۔ سہ ماہی ''دبیر'' ۲۰۱۸ء

۲۔ سہ ماہی ''فکر وتحقیق''، نئی دہلی ۲۰۱۸ء

☆☆☆

قمر حیدر
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

شیخ علی حزیں کی ہمہ گیر شخصیت

فارسی ادب کے وسیع وعریض چمن میں ایسے بے شمار گل بوٹے ہیں جو گوشۂ گمنامی میں رہ کر اپنی بھینی بھینی خوشبو سے چمنستان ادب میں سیر کرنے والوں کے مشام کو معطر کرتے رہتے ہیں۔ فارسی ادب کے طویل سفر میں نامور شعراء ،ادباء کی ایک طویل فہرست ہے جن کے ضروری حالات وکوائف آج بھی مرور ایام کی دھند میں دھندلا گئے ہیں انھیں بے شمار ادباء وشعراء کی فہرست میں بارہویں صدی ہجری کے عظیم عارف، فلسفی، ادیب، نقاد، ماہر علوم معقول ومنقول علامۂ ذوالفنون شیخ علی حزین ہیں جو بیک وقت علم قرأت وتجوید کے ماہر، ہیئت وجغرافیہ میں صائب الرای، فلسفہ وحکمت میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، دریائے تاریخ کے ماہر شناور، علم الحیوانات میں متبحر، مناظرہ کے میدان میں شہسوار، وادی ادب کے سنگ میل تھے۔ ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۰۳ھ کو اصفہان کے دارالسلطنت میں آنکھیں کھولی۔ علم وادب کی فضا میں سانسیں لیکر پروان چڑھتے رہے۔

☆ خاندانی وجاہت وتعلیمی سفر:

دنیائے ادب میں علی حزین کے نام سے آسمان شہرت کے نصف النہار پر چمکتا ہوا آفتاب تاریخ کی مسلسل ستم ظریفی کا شکار رہا، افسوس تو اس وقت ہوتا ہے جب تاریخ میں مورخین کے درمیان ان کے نام وتخلص کے حوالے سے متعدد آراء ونظریات دیکھنے کو ملتے ہیں، صاحب کتاب احوال وآثار حزین لاہیجی نے تحریر کیا ہے:

"شاہنواز خان نے آپ کا نام علی اور رضا قلی ہدایت وعبداللطیف نے محمد علی جبکہ محمد رضا نے میرزا محمد علی تحریر کیا ہے"(۱)

رسائل حزین لاہیجی کے مدونین ومرتبین نے سرورق پر آپ کا نام یہ درج کیا ہے:

"محمد علی ابن ابی طالب حزین لاہیجی"(۲)

آپ کا شجرہ نسب:

محمد علی ابن ابی طالب ابن عبداللہ ابن علی ابن عطاء اللہ ابن اسمعیل ابن اسحاق ابن نورالدین

محمد ابن شہاب الدین علی ابن علی ابن یعقوب ابن عبدالواحد ابن شمس الدین محمد ابن احمد ابن محمد ابن جمال الدین ابن شیخ تاج الدین ابراہیم معروف بہ زاہد گیلانی (۳)

چونکہ آپ کی زندگی حزن واندوہ کا مرقع تھی لہذا حزین تخلص منتخب کیا، بعض افراد کا خیال ہے کہ آپ نے یہ تخلص اپنے استاد شیخ خلیل اللہ جو ایک زاہد وعارف تھے سے اخذ کیا تھا۔(۴)

سلسلہ نسب کی ہر کڑی درخشاں اور ہر فرد سرمایہ افتخار تھی، علم وادب سے گہرا لگاؤ، مطالعہ وکتب بینی سے عشق کی حد تک لگاؤ رکھتے تھے چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کے والد غربت وافلاس کی وجہ سے اکثر کتب کو خود لکھتے تھے جس کا مجموعی ذخیرہ پانچ ہزار سے زائد کتب پر مشتمل تھا جو خود نوشت تھا۔

شیخ حزین نے اپنے پدر بزرگوار کے آثار کو "رسالہ در فہرست اساتذہ وتصنیفات خود" میں درج کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

''رسالہ فی تحقیق الحرکات، رسالہ فی عمل المسبع والمتسع فی دائرۃ الف، باء، جیم من التعالیم، رسالہ فی قول ارسطو، رسالہ فی بیان قل الروح من امر ربی وغیرہ''۔(۵)

شیخ علی حزین کا پورا خاندان علم وادب سے سرشار تھا مختلف علوم وفنون کے ماہرین اس خاندان میں نظر آتے ہیں چنانچہ آپ کے چچا عبداللہ علم فقہ وحدیث میں تبحر کے حامل تھے اور ید طولیٰ رکھتے تھے۔آپ کے اجداد میں شیخ علی شاہ گیلان کے اتالیق میں تھے اور بادشاہ گیلان آپ کے علمی مرتبہ کے باعث بیحد احترام کرتا تھا آپ نے حدیث معراج کی شرح، اور قانون شفا بوعلی سینا کی فارسی شرح قلم بند فرمایا تھا(۶)

عظیم وبلند پایہ علمی گھرانے میں آنکھیں کھولنے والے بچے لوریوں میں علم وادب سیکھتے ہیں چنانچہ عالم طفلی میں ہی آپ نے علم وادب کے موتی اس عمر میں جمع کرنا شروع کر دیے تھے جس عمر میں بچے کھلونے سے کھیلنے کے عادی ہوتے ہیں، آپ اپنی خود نوشت میں اپنے تعلیمی سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"چار سال کی عمر میں والد ماجد نے مولانا اعظم شاہ محمد شیرازی کے پاس جو اس وقت اصفہان کے بلند پایہ عالم تھے کے پاس بھیجا جبکہ علامہ شاہ محمد شیرازی ہمارے گھر مہمان بنکر آئے تھے چنانچہ ''بسم اللہ'' کی رسم ادا ہوئی اور مولانا نے ''بسم اللہ'' کے بعد مندرجہ ذیل آیہ کریمہ تین مرتبہ تکرار کرائی ۔''رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدۃ مّن لسانی یفقہوا قولی''(۷)

علم وادب سے عشق کی حد تک لگاؤ خاندانی میراث تھی، لکھنا پڑھنا گھر کا معمول تھا لہذا علمی فضا میں رہ کر ذوق تعلیم بیدار نہ ہو ممکن نہیں ہے اور طرفہ تماشا کہ ذکاوت وذہانت نے اس جذبہ کو اور شعلہ ور کر دیا چنانچہ مختصر ترین مدت میں

صرف ونحو،منطق وفلسفہ،فقہ واصول کی بنیادی کتب سے فراغت حاصل کرلی ،خداداد ذہانت کو دیکھتے ہوئے اساتذہ دادتحسین سے نوازتے ،بزرگ افراد حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے،اپنے شوق مطالعہ ومباحثہ کے حوالے سے اپنی خود نوشت میں تحریر کرتے ہیں:

"مطالعہ ومباحثہ کا شوق مجھے اتنا بے قرار کرتا تھا کہ بسا اوقات میرے والدین کو رحم آتا تھا مجھے نصیحت کرتے تھے جس کا مطلق اثر مجھ پر نہیں ہوتا ،جو کلاس درس میں نہیں حاصل کر پاتا وہ مطالعے سے حاصل کرنے کی انتھک کوشش کرتا،اس سلسلے میں والد محترم سے بہت استفادہ کرتا تھا"(۸)

آپ کا علمی خاندان آذربائجان کے شہر استارا میں زندگی بسر کرتا تھا لیکن آپ کے اجداد سے شیخ شہاب الدین نامی شخص نے اس شہر کو خیر باد کہہ کر لاہیجان جو گیلان کا خوبصورت ترین شہر تھا کو مسکن بنالیا اور وہیں اس خاندان علم وادب کے چشم وچراغ زندگی بسر کرنے لگے(۹)

☆ہندوستان کا سفر:

شیخ حزین نے لاہیجان کو کیوں خیر باد کہا؟ وہ اسباب وعوامل کیا تھے جن کی وجہ سے اس عظیم وبلند پایہ علمی خاندان سے دور ہندوستان کو سکونت کیلئے اختیار کیا؟ اس سلسلے میں باتیں تو بہت بیان ہوتی ہیں لیکن آپ کے حالات زندگی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۱۲۷ھ میں والد کے انتقال کے بعد آپ نے شیراز کا سفر کیا لیکن بہت جلد وہاں سے لوٹ آئے اور پھر اس کے بعد بھی کئی سفر کئے لیکن جائے امن نہ مل سکی اور حالات نے تیزی سے کروٹ بدلنا شروع کردی،افغانیوں کے ہاتھوں اصفہان غارت کردیا گیا تو عالم بیماری میں لباس تبدیل کر کے شہر سے راہ فرار اختیار کیا اور تقریبا دس سال مختلف علاقوں کی خاک چھانتے رہے اور پھر سندھ وملتان کا رخ کیا کچھ عرصہ قیام کر کے لاہور چلے آئے اور پھر دہلی کا رخ کیا ان تمام باتوں کے علاوہ سب سے اہم بات جو خود شیخ حزین نے تحریر کی ہے ملاحظہ ہو:

"صوبہ لار میں جب حالات پر آشوب ہوگئے اور والی لار محمد خان شاملو قتل کردیا گیا تو میں اس قتل میں متہم کردیا گیا"(۱۰)

عرصہ دراز تک دہلی میں قیام پذیر رہے جب دہلی کی آب وہوا کی ناسازگاری نے مجبور کیا تو بنارس کا ارادہ فرمایا جہاں تقریبا انیس(۱۹) سال قیام فرمایا اور وہیں زندگی کی آخری سانسیں لیں،روضۂ فاطمان میں آج بھی آپ کا مزار عوام وخواص کا مرکز ہے۔

☆عصر حزین کا سرسری مطالعہ:

شیخ علی حزین کا دور حیات بارہویں صدی پر محیط ہے جس کا ابتدائی حصہ ایران میں گزرا اور باقی عمر ہندوستان کے مختلف شہروں میں گزری، سیاسی اعتبار سے آپ کے دور حیات میں ایک مرحلہ نہایت ہی اتھل پتھل والا نظر آتا ہے ،بہت پرسکون حالات نہیں تھے اصفہان کا محاصرہ، افغانیوں کی غارتگری، اور اس جیسے واقعات بھی ملتے ہیں۔ سیاسی حالات کی ابتری نے ادبی دنیا کو بے رونق بنا دیا تھا، شعراء کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوتی تھی، ادباء گوشہ گمنامی میں زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ تاریخ ادبیات ایران میں اس دور کو نہایت ہی بے سود مانا گیا ہے چنانچہ ای۔ جی۔ براؤن نے اس دور کو ادبی اعتبار سے بے سود و خالی بتایا ہے(۱۱)

بارہویں صدی میں شعری میدان میں تقلید کا عنصر زیادہ حاوی ہے اور تخلیقی عنصر کمیاب ہے عموماً تکراری مضامین زیادہ نظر آتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ارباب فن مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے اپنے خیالات کو جدید پیرایے میں پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

اس دور کی نثر میں سادگی، سلاست اور پختگی بعد میں پیدا ہوئی جب کچھ حالات پرسکون ہوئے اور شعرا نے ایک اجتماعی تحریک ادبی دنیا کو بارونق بنانے کیلئے شروع کی۔ جس کے نتیجے میں بے جان ادب میں جان پڑ گئی اور ادب فقر و افلاس سے نکل کر غنی و ثروتمند ہو گیا۔ تفصیلات کیلئے ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا کی کتاب "ادب"، ص 679 تا 681 کا مطالعہ مفید ہے۔

☆آثار شیخ علی حزین پر طائرانہ نظر:

شیخ علی حزین عالم اسلام و دنیائے ادب کے اس نابغہ دہر کا نام ہے جس نے اپنے دور کے تمام مروجہ علوم میں مہارت تامہ حاصل کی تھی۔ وہ صرف ایک ادیب ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ مفسر، عظیم فقیہ، نامور فلسفی، اعلیٰ درجے کے معلم اخلاق، ماہر علوم غریبہ، عالی رتبہ مورخ اور طبیب حاذق بھی تھے، اور ہر فن میں اپنا گرانقدر سرمایہ ارباب علم و دانش کیلئے چھوڑا ہے، آپ کے قلمی ذخیرے کے مطالعہ سے آپ کا تبحر و عالمانہ شان نمایاں ہوتی ہے، عرفانی نکات، اخلاقی موشگافیاں، تفسیری اسرار و رموز، علوم طبیعی کی حلاجی دیکھکر انسان وقاری انگشت بدنداں رہ جاتا ہے، ادبی، تاریخی، مذہبی و عرفانی آثار درحقیقت معرفت کا اک دفتر اور معلومات کا عظیم خزانہ ہیں۔

شیخ کی شاعری کی بات کریں تو آپ نے سبک ہندی کے دیگر شعرا کی طرح تمثیل سے استفادہ ضرور کیا ہے لیکن وہ تمثیلات عقلی زیادہ ہیں اور تمثیل میں بھی دو مصرعوں کے درمیان غیر محسوس پیوندکاری کا خیال رکھا ہے لیکن اس کا سبب معنی کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے اس کے علاوہ غیر انسانی شخصیات مثلاً حیوانات وغیرہ کو انسانی رنگ و روپ میں پیش کر کے طراوٹ و دلکشی میں اضافہ کر دیا ہے، تلمیح کے قالب میں خیال انگیزی کا ہنر خوب نبھایا ہے چنانچہ مذہبی دنیا سے

وابستہ ہونے کی وجہ سے قرآنی تلمیحات بکثرت پائی جاتی ہیں، ملاحظہ ہو یہ شعر:

جایی کہ بہ رقص آید طور از ارنی گفتن مستان لقا دانند بیہوشی موسی را (۱۲)

اشعار حزین کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عناصر جو لفظی یا معنوی رابطہ باہم رکھتے ہیں انکی تکرار مسلسل کرتے رہتے ہیں اور ذہن مخاطب کو ایسے مفاہیم کی طرف موڑنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر وہ ان کو سمجھ لے تو شعر کا مفہوم بآسانی سمجھ لیگا مثلا:

کتاب ھفت ملت ماندہ در طوق فراموشی
مراسی پارہ دل بس کہ نیکو فال می باشد (۱۳)
بر کف دل سی پارہ عشاق نگہ دار
حرز تن جان این کہن اوراق نگہ دار (۱۴)

فارسی شعرا کے اشعار میں گرچہ عرفانی تعبیرات بہت نظر آتی ہیں جس سے ادبیات فارسی کی وقعت مختلف تاریخی ادوار میں بڑھ جاتی ہے، ان دقیق نکات، لطیف مضامین میں غور وفکر کرنے سے مشتاقان تحقیق کیلئے ایسے چشمے پھوٹتے ہیں جو انکی تشنگی کو ختم کر دیتے ہیں، شیخ حزین کے پر مغز و بلند و بالا مضامین پر مشتمل اشعار کا مطالعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ عارف و شاعر زندگی بھر کوشش کرتا رہا کوئی نئی چیز بیان کرے اور باغ عرفان کے دریچہ کو وا کر کے چمنستان عالم کے ہر ذرہ میں جلوہ رب دیکھے، موہومات کے پردے چاک کر کے بغیر کسی پردے کے جلوہ یوسف و عشق کا نظارہ کر سکے چنانچہ وہ کہتے ہیں:

عشق تو بانگ زد بہ زمین وزمان ھمہ جستیم ازین خروش زخواب گران ھمہ
ازقول کن بہ ساغر دل بادہ ریختی ای عالم ازشراب لبت کامران ھمہ
کثرت حجاب دیدہ عارف نمی شود دارند بوی یوسف ما کاروان ھمہ (۱۵)

آپ کے اشعار کی نمایاں خصوصیات میں عرفانی رنگ ہے جو صرف اشعار میں ہی نہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں حکمرانی کرتا ہے، مزید برآن ہندوستان کی معنوی آب وہوا نے اس کو اور نکھار دیا جس سے قارئین کی تشنگی عرفان ختم ہو جاتی ہے۔

شیخ حزین نے احساسات کو خشک و بے روح افکار میں تبدیل نہیں کیا ہے لہذا جزنگری ان کے اشعار میں مفقود ہے عشق ان کے اشعار میں جسور نظر آتا ہے اسی وجہ سے عاطفہ و احساسات کو اتنا برانگیختہ کر دیتا ہے کہ آدمی ہم نوا ہو جاتا ہے۔ انھیں اسباب کی بنا پر ان کے اشعار میں سبک خراسانی کی روانی، سبک عراقی کے عشقیہ و عرفانی مضامین اور سبک ہندی کی

تمثیل کی جھلک دکھائی پڑتی ہے۔

صاحب نغمہ عندلیب رقمطراز ہیں:

''شیخ سعدی کے بعد شیخ حزین کے ہم پلہ کوئی سخنور پیدا نہیں ہوا جس کی نثر شعر سے بہتر اور جس کے اشعار نثر پر سبقت لیجانے کے لئے بیتاب نظر آتے ہیں، تمام اصناف شعر میں جب کبھی طبع آزمائی کیا زمین سخن کو آسمان کی معراج پر پہونچادیا''۔(۱۶)

وحشت کلکتوی تحریر کرتے ہیں:

''حزین نے غزل ورباعی میں کمال حاصل کیا آپ کی غزلیات کا سبک لائق تقلید ہے آپ کے سبک میں فکری گہرائی، بیان کی شفافیت، ظریف الفاظ، متانت، عشقیہ انداز تکلم اور عرفانی رنگ پایا جاتا ہے جس سے آپ کے اشعار کی عظمت دوچند ہوجاتی ہے''۔(۱۷)

نثری آثار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی نثر واضح، تصنع وتکلفات سے مبرا ہے، استعارات سے گریز کرتے تھے، عموما ان الفاظ کا استعمال کرتے تھے جو روزمرہ کی عام بول چال میں مستعمل ہوتے تھے۔

رسائل حزین نامی مجموعہ جو دفتر نشر میراث مکتوب کے زیر نگرانی محققین کے ایک گروہ کے ذریعہ تصحیح پایا ہے اسمیں بارہ رسالے ہیں ان رسائل کا مختصر تعارف ہدیۂ ناظرین کیا جارہا ہے:

آیہ نور: سورہ مبارکہ نور کی آیہ ۳۵ کی مختصر عرفانی وفلسفی تفسیر ہے جو عربی زبان میں قلم بند فرمایا تھا۔

مراۃ اللہ فی شرح آیۃ شہد اللہ: نہایت ہی مختصر تفسیر ہے آیہ شہد اللہ کی جسمیں عرفانی طرز کو اپنایا ہے یہ رسالہ بھی عربی زبان میں تحریر کیا تھا اسکا نسخہ لندن میوزیم میں موجود ہے۔

المذاکرات فی المحاضرات: فارسی زبان میں علم منطق کی صنعت جدل سے متعلق نہایت ہی اہم معلومات کا خزانہ ہے جسمیں جدل کی ماہیت، مناظرہ کے آداب پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔اس رسالے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خالق نہج البلاغہ حضرت علیؑ، حکماء وبزرگان کے اقوال کے ساتھ ساتھ لطیف حکایات بھی درج کی گئی ہیں۔

اہمیت زبان کے حوالے سے اک طولانی مقدمہ اور کچھ لغات پر اجمالی بحث کرتے ہوئے ان علوم کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی مناظرے میں ضرورت پڑتی ہے لیکن بنیادی حصہ رسالہ کا علم مناظرہ سے مختص ہے جسمیں نہایت ہی ایجاز کے ساتھ تحقیقی انداز میں مناظرہ کی ماہیت، شرائط وآداب پر روشنی ڈالی ہے، اس کے بعد علم محاورہ پر گفتگو کی ہے اس رسالے کا خاتمہ سب سے زیادہ جاذب نظر ہے جس میں حکمت وضرب الامثال، حکایات، ظریف ونادر اقوال جس کی علم محاورہ میں ضرورت پڑتی ہے نقل کئے ہیں اس رسالہ کی نثر دلکش ودلفریب ہے۔

رسالہ در چگونگی صید مروارید: فارسی زبان کے اس رسالے میں موتیوں کی ماہیت ورنگ، شکلیں، آفتیں، منافع وخواص نیز ان کی حفاظت کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ سرفراز خان ختک کی کوششوں سے ۱۹۵۴ء میں پہلی بار خط نستعلیق میں طبع ہوا تھا۔

رسالہ درحقیقت نفس وتجردآن: احکام الٰہیہ نے عموماً فلسفی مباحث میں ماہیت کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے جسمیں ماہیت کی حقیقت وآثار وغیرہ کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کرتے ہیں علامہ حزین نے بھی اہمیت موضوع اور ایک طالب حق کی فرمائش کے پیش نظر یہ رسالہ مرتب کیا تھا، اس رسالے کی ابتدا میں معرفت نفس کی اہمیت وافادیت کو قرآن وسنت کی روشنی میں نہایت دلنشین وجذاب عبارات میں بیان کیا ہے۔

رسالہ اوزان ومقادیر: فارسی زبان میں اوزان کی وضاحت پر مشتمل رسالہ ہے جس میں روایات میں بیان شدہ اوزان کی وضاحت کی گئی ہے، اس قسم کے رسالہ عموماً فقہی ضرورتوں کے تحت تحریر پاتے ہیں کیونکہ شریعت اسلامیہ کے احکام زکات ودیات وغیرہ میں کچھ اوزان بیان ہوتے ہیں جن کا علم ہر مکلّف کیلئے ضروری ہے۔ رسالہ کی عبارت سلیس وروان اور تکلفات وتصنعات سے خالی ہے۔

رسالہ خواص الحیوانات: فارسی زبان میں حیوانات کے انواع واقسام، انکی خاصیت، فقہی احکام پر مشتمل مبسوط رسالہ ہے جو طبع بھی ہوا ہے۔ اور بھی بے شمار قلمی آثار شیخ علی حزین نے یادگار چھوڑے ہیں جن کی فہرست بھی طولانی ہے۔ مختلف علوم وفنون پر مشتمل یہ رسائل وکتب آپ کی جلالت وشان علمی کو بیان کرتے ہیں، علم طب میں مفرح القلوب، علم نجوم میں معرفۃ التقویم واحکام النجوم، رسالہ تحقیق غنا، نغمہ پردازی کے فن سے متعلق۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی نایاب کتب ورسائل ہیں جن کو شیخ حزین نے تالیف کیا تھا جن کا تذکرہ خوف طوالت سے نہیں کیا جارہا ہے۔ تفصیلات کے خواہشمند حضرات کلیات حزین، تذکرۃ الاحوال، احوال وآثار حزین لاہیجی وغیرہ کا مطالعہ کریں۔ مگر اتنا کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جن کتب ورسائل کا نہایت ہی مختصر تعارف درج کیا گیا ہے ان سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کی ذات والا صفات اک ہمہ گیر شخصیت کی مالک تھی جسمیں ہر قسم کے علوم وفنون کے لئالی آبدار پائے جاتے تھے، دہن کھلتا تو لعل ویاقوت فن جلوہ ریز ہوتے، قلم گردش کرتا تو سیاہی قلم علم ومعرفت کی اک دنیا روشن کردیتی۔

منابع ومأخذ:

۱۔ احوال وآثار حزین لاہیجی، مولفہ سرفراز خان ختک، ص ۳۰

۲۔ رسائل حزین لاہیجی، زیر نظر دفتر نشر میراث مکتوب ایران، سرورق

۳۔ تاریخ بنارس مؤلفہ مظہر حسن، ص ۲۷۸

۴۔ احوال وآثار حزین لاہیجی، ص ۳۴۔ پیشگفتار رسائل حزین لاہیجی، ص ۱۸

۵۔خطی نسخہ r.a.s.b.،نمبر۱۷۷۸،ص۲۷۴
۶۔احوال وآثار حزین لاہیجی،ص۳۹
۷۔مقدمہ رسائل حزین لاہیجی،ص۱۷،ناشر دفتر نشر میراث مکتوب ،بحوالہ مفاخرالاسلام،ج۷،ص۳۰۲
۸۔پیشگفتار رسائل حزین لاہیجی،ص۱۹،دفتر نشر میراث مکتوب ایران بحوالہ مفاخر اسلام،ج۷،ص۳۰۲
۹۔تذکرۃ الاحوال،ص۴،مطبوعہ لکھنو،حالات حزین مع انتخاب کلام مؤلفہ شروانی،ص۹
۱۰۔تذکرۃ الاحوال،ص۲۱۴
۱۱۔لیٹریٹری آف ہسٹری آف پرسین،ج۴،ص۱۵۹
۱۲۔دیوان حزین مصححہ ذبیح اللہ صاحبکار،ص۸۵
۱۳۔دیوان حزین مصححہ ذبیح اللہ صاحبکار،ص۱۹۵
۱۴۔ دیوان حزین مصححہ ذبیح اللہ صاحبکار،ص۱۹۵
۱۵۔دیوان حزین مصححہ ذبیح اللہ صاحبکار،ص۴۱۳
۱۶۔احوال وآثار حزین لاہیجی،ص۸۵،بحوالہ نغمہ عندلیب مخطوطہ برٹش میوزیم
۱۷۔مجلّہ مخزن،جون۱۹۰۹ء،ص۱۲

☆☆☆

سیّد محمد نوید جعفری
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

میر تقی میؔر کا فارسی دیوان

فارسی نظم میں میؔر کا کل اثاثہ ایک مختصر دیوان ہے۔اس میں غزلیات کی تعداد ۵۲۲، رباعیات ۱۰۴، ایک شہر آشوب اور ایک منقبت شامل ہے۔ایک طویل مدّت تک یہ دیوان غیر مطبوعہ حالت میں رہا۔حالانکہ اسکے چند قلمی نسخے ملک کے مختلف کتب خانوں موجود تھے۔لیکن اکثر محققین کی توجہ اسکے شایع کرنے کی طرف مبذول نہیں ہو پائی۔دیوان فارسی میر کے خطی نسخوں کی تفصیل اسطرح ہے۔اس دیوان کا ایک مخطوطہ کتاب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں، ایک ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں، ایک رضا رامپور لائبریری میں، ایک کتاب خانہ غمگین، گوالیار میں اور ایک ذخیرہ مسعود حسن رضوی ادیبؔ میں موجود ہے۔اوران کے علاوہ بھی کلیات میؔر کے کسی کسی مخطوطہ اور شعرائے فارسی کے تذکروں میں میؔر کے فارسی اشعار مل جاتے ہیں۔کیوں کہ میؔر کا فارسی کلام مطبوعہ صورت میں دستیاب نہیں تھا، اس لیے میؔر کی فارسی گوئی پر اکّا دکّا ہی مضامین لکھے گئے ہیں اور وہ بھی مختصر ہیں۔اب تک میؔر کی فارسی گوئی پر کوئی سیر حاصل تبصرہ منظر عام پر نہیں آیا ہے۔یہ مضمون اسی سمت میں ایک ادنا کوشش ہے۔

یہ دیوان ایک طویل عرصہ تک کتب خانوں کی فہرست نسخہ ہای خطی کی زینت بنا رہا۔آخر کار ڈاکٹر نیّر مسعود رضوی نے مدیر مجلّہ ''نقوش'' ادارۂ فروغ اردو لاہور، محمد طفیل کی فرمایش پر دیوان فارسی میؔر کے نسخہ ادیب کو مرتب کرنے کا ذمہ اپنے سر لیا۔ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے بھی ایک زمانہ تک میؔر کے فارسی دیوان کو مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا اور اس غرض سے مخطوطہ رامپور کی نقل تیار کر کے کچھ حد تک ادارۂ ادبیات اردو کے مخطوطہ سے اس کا مقابلہ بھی کر لیا تھا۔انکو جب معلوم ہوا کہ نیّر مسعود، میؔر کا فارسی دیوان مرتب کر رہے ہیں تو انہوں نے مخطوطہ رامپور کی یہ نقل انکے سپرد کر دی۔نسخہ ادیب میں متعدد نقائص تھے جو نثار صاحب کے نسخہ کی مدد سے تقریباً دور ہو گئے۔دیوان فارسی میؔر کا یہ مطبوعہ ایڈیشن، نسخہ ادیب اور مخطوطہ رامپور پر مبنی ہے۔یہ بات یاد رکھنی چاہے کہ اس نسخہ کی تصحیح میں جتنی کوشش نیر مسعود صاحب کی ہے، اتنا ہی حصّہ نثار احمد فاروقی صاحب کا بھی ہے۔

میؔر کا فارسی دیوان ''نقوش'' کے ''میر تقی میر نمبر ۳''، کے شمارہ نمبر ۱۳۱، اگست ۱۹۸۳ء، ادارۂ فروغ اردو لاہور، سے شایع ہو چکا ہے۔مگر آجکل کمیاب ہے۔

شعرائے فارسی کے تذکروں میں ذکرِ میرؔ:

میرؔ کی فارسی گوئی پر کسی بھی قسم کی گفتگو کرنے سے قبل ہمیں میرؔ کی فارسی شاعری کے متعلق معاصر فارسی گوشعراء کے تذکروں پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہیئے کیوں کہ تذکرہ نگاروں کی رائے جاننا بھی ضروری ہے۔اس سے ہمیں میرؔ کی فارسی شاعری کی اصل کیفیت معلوم کرنے میں کافی مدد ملے گی۔

فارسی کے عظیم شاعراور ماہر علم لغت سراج الدین علی خان آرزؔو اپنے فارسی تذکرے ''مجمع النفائس'' میں میرؔاور انکی فارسی گوئی کے متعلق مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''میر محمد تقی المتخلص بمیر ،مستقر الخلافہ اکبرآباداست دراوّل بمشق اشعار ریختہ، کہ بزبان اردوشعر یست بطرز شعر فارسی ،توغل بسیار نمودہ چنان چہ شہرۂ آفاق ست۔بعد آن گفتن اشعار فارسی بطرز خاص گرویدہ،قبول خاطر ارباب سخن و دانایان این فن گشت۔طبعش بمضامین تازہ وغیرہ مبتذل معنی پرداز است۔واشعار او بلطافت اداواندازـاز بسکہ ذھن مناسب وطبع ثاقب یافتہ۔درابتدائ مشق شعر رتبہٴ سخن را بپایۂ انتھار سانیداز چند سال بجناب معالی القاب......گرامی درعمدۃ الملک مھاراجہ بہادر کہ آفتاب ابد فروغ اقبالش بر بیت اشرف ترقی ھموارہ متصاعدو دولت وجلالش ھر روز در تزاید باد،کامیاب فراوان فیوضات و بھرہ اند و ز انواع احسان و پرداخت و احوال بفراغبال می گزراند۔مھاراجہ مستغنی التوصیف از ابتسام صبح دولت وکامرانی بہ بسیاری اشغال امور ملکت وجھان بانی کہ درعھد فرخندہ مھد حضرت فردوس آرام گاہ وبعد آن درزمان خلافت و اوان سلطنت احمد شاہ بادشاہ مربع نشین چار بالش دیوانی خالصہ شریفہ ودیوانی تن ومرجع ومآب اقاصی وادانی زمان وزمن و ازان باز کہ کوکب اقبال شان پیوستہ صاعد بمصاعد اجلالست،برتبہٴ عالی مرتبہ نائب الوزارہ کا مراوائ نامداران عالم وصاحب السیف والقلم شدند۔وبی اغراق تکلف کہ نام نامیش درعرصہ شش جھات بجھان جھان نیک نامی مشتھر وصیت اخلاق خوش واشفاق دلکش آن جناب در بلاد ربع مسکون مشھور تر، بنابر کثرت امور مملکت وقلت فرصت بتلاش شعر توجہ نفر مودند لیکن کمالات سخن دانی ومعنی یابی وبدیھہ رسی وخوبی ذھن رساودقت طبعیت عالی زائد الوصف است۔دفتر ہا باید کہ تحریر نمایدا ما......بقلم می آید کہ روزی در صحن چمن وخیابان گلشن با قبال جاودان خرام کنان بداھتۂ از بھارستان خاطر عاطر این گل مصراعی سرزد۔ع

چون غنچۂ سر بگر بیان عقدہ خویشم

بآن کہ اکثری بتلاش مصرع دویمش فکرھا کردند،خوب میسر نیامد۔میر مزبور مصرع ثانی را بآنکہ این ھم درتقابل رتبۂ مصرع اوّل دویم است بھم رسانید۔ع

کشادکارندانم چہ آورد پشیم

ھر چند میر دیوان مختصر دارد،اما غزل ھائ دردمندانہ وعاشقانہ می گوید۔'' (مجمع النفائس ۴۰)

غلام ہمدانی مصحفی نے اپنے تذکرے ''عقدِ ثریا'' میں میر کا احوال مندرجہ الفاظ میں درج کیا ہے:

''میر: محمد تقی میر، ھمشیر ہ زادۂ سراج الدین علی خان آرزو، درفن شعر ریختہ مرد صاحب کمال است کہ مثل او از خاک ھند دیگری سر بر نیاوردہ۔ چرخ پیر را سالھای دراز چرخ باید زد کہ ھچو شخصی را بررویی کار آورد۔شعرھندی را نسبت بہ دیگر شعرای ریختہ گویان بہ پاکیز گی وصفا گفتہ کہ فارسی گویان را از رشک ریختہ اش خون در دل افتادہ بلکہ اکثر اشخاص موزون طبع کہ ریختہ اش شنیدہ ومزۂ این زبان از زبان او دریافت کردہ، فارسی گوئی را بر طاق بلند گذاشتند ۔وتوجہ برریختہ اند۔درعھد فردوس آرامگاہ اکثر ارکان پایۂ تخت وکسانی کہ نسبت بہ سخن داشتند اوراتعظیم وتوقیر بہ مراتب بھتر از دیگران می کردند۔اکنون کہ درین خرابہ کسی درمیان نیست۔وزمانہ از قدردانان بکلّی خالی شدہ باوجود عیال داری توّکل اختیار کردہ وروی نیاز بہ این نوکیسہ ھای چندنمی آرد۔واز بسکہ از ابنای زمانہ کسی را مخاطب صحیح نمی پندارد وسخن بہ ھرکس و ناکس نمی کند۔از ین جھت اکثر اعزہ او را کج خلق و برخود غلط و انسان دشمن قرار می دھند۔صیت سخنوریش تمام اطراف ھندوستان را فرا گرفتہ ۔شعر ریختہ اش از کھنہ نامہ ھمہ برزبان دارند وصادر و وارداز دیاری بہ دیاری بہ طریق ازمغان می برند۔واز بسکہ از ابتدائ سخن گفتن نام بر یختہ گوئ برآوردہ ،دعوای شعر فارسی چندان ندارداگر چہ فارسی ھم کم از ریختہ نمی گوید۔می گفت کہ دو سال شغل ریختہ موقوف کردہ بودم دران ایام قریب درھزار بیت فارسی صورت تدوین یافتہ۔'' (عقد ثریا ۲۵۷۔۲۵۸)

تذکرہ ''مقالات الشعراء'' تالیف قیام الدین حیرت جو ہندستانی شعراء کا فارسی تذکرہ ہے۔اس میں میر کا ذکر بھی ملتا ہے۔حیرت کا بیان میر کے متعلق مندرجہ ذیل ہے:

''میر محمد تقی میر تخلص ،ہمشیرزادۂ خان آرزو مغفور است،اکثر اشعار ریختہ می گوید وتذکرہ متضمنّ احوال شعرای ریختہ گو نیز تالیف نمودہ، و ہر ہفتہ روزی بخانہ اش اجتماع ریختہ گویان ومشاعرات در ایشان می شود،آخر درشعر فارسی ہم مہارتی پیدا کردہ، چند شعر خود را بخط خود نگاشتہ بہ رائ صاحب خداوند دادہ بود کہ داخل تذکرہ نمایند از این جملہ است۔'' (مقالات الشعراء ۹۱)

یہاں ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ مصحفی کے مذکورہ بالا بیان کے مطابق میر کے فارسی دیوان میں اشعار کی کل تعداد تقریباً دو ہزار ہے۔لیکن مطبوعہ فارسی دیوان میں اشعار کی تعداد پونے تین ہزار سے بھی زیادہ ملتی ہے۔ اس بات کی چند وجوہات نظر آتیں ہیں۔اوّل میر کو اپنے فارسی اشعار کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔دوّم یہ کہ مصحفی نے شعروں کی تعداد نقل کرنے میں سہو کیا۔یا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ میر نے دو سال کی مدّت میں ایک فارسی دیوان مرتب کرلیا تھا مگر اس کے بعد بھی وہ وقتاً فوقتاً فارسی میں شعر کہتے رہتے۔

فارسی گوئی کا آغاز:

یہ بات قطعی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ میر کی فارسی گوئی کا آغاز کس زمانہ میں ہوا۔جیسا کہ مصحفی کا بیان ہے کہ میر دو سال تک اردو کے بجائے فارسی میں طبع آزمائی کرتے رہے۔اس کے برعکس خان آرزو نے اپنے تذکرے میں میر کے احوال میں رقم کیا ہے کہ ''ھر چند میر دیوان مختصر دارد''۔اس فقرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ''مجمع النفائس'' کی تالیفکے وقت تک میر کا فارسی دیوان مرتب ہو چکا تھا۔مگر خان آرزو کے قول پر ناقدین نے سوالیہ نشان لگایا ہے کہ یہ الحاقی ہے۔لہٰذا اس بیان سے بھی میر کی فارسی گوئی کے آغاز کا زمانہ تعین نہیں کیا جاسکتا۔

علاوہ ازایں میر نے ''فیض میر'' میں اپنا کوئی فارسی شعر نقل نہیں کیا جبکہ دیگر شعراء کے اشعار درج کئے ہیں لیکن ''ذکر میر'' میں انہوں نے اپنے فارسی اشعار کے ساتھ دوسرے شعراء کے ابیات بھی نقل کیے ہیں۔''فیض میر'' کا زمانہ تالیف واضح نہیں ہے۔مگر ''ذکر میر'' آصف الدولہ کے عہد حکومت میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔اسی کے ساتھ میر کے اس دیوان میں ایسے اشعار بھی ہیں جنکو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ دہلی میں کہے گئے ہونگے۔

بسکہ درھر کوچہ از جور کسی بیداد شد　　عاقبت شھر جھان آباد جور آباد شد

اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ شعر دہلی میں کہا گیا ہوگا۔مگر یہ مثنوی ''ای صبا گر سوی دہلی بگذری'' کے ابتدائی شعر سے صاف ہے کہ یہ مثنوی کسی دیگر شہر میں مکمل ہوئی ہوگی۔اس کے علاوہ انکے دیوان میں ایسے بھی اشعار ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑھاپے میں کہے گئے ہوں گے۔ذیل کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

☆ گفتم کہ پیر گشتہ ام اکنون کجا روم　　قد خمیدہ جانب خاکم اشارہ کرد

☆ پیری رسید و آمد نزدیک وقت رفتن　　تا چند میر صاحب ترک ہوا نکردن

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں اسی نتیجہ پر پہنچا جاسکتا ہے کہ میر نے اوّل تو اپنا فارسی دیوان مرتب کیا ہوگا لیکن اس کے بعد بھی فارسی میں شعر کہنا ترک نہیں کیا بلکہ عمر کے آخر زمانہ تک گاہے بگاہے فارسی میں شعر کہتے رہے اور انکے دیوان میں اضافہ ہوتا گیا اور شاید یہ ہی وجہ ہے کہ میر کے موجودہ دیوان فارسی میں اشعار کی تعداد مصحفی کی بتائی ہوئی تعداد سے

متجاوز ہے۔

میؔر کی فارسی شاعری:

عہد میؔر میں شعر و شاعری کو ہنر و علم اور فن کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ جو محض اہل علم حضرات کا شیوہ تھا۔ دوسرے الفاظ میں شاعری ایک قسم کا معیار قابلیت تھی یعنی اپنی صلاحیت و قابلیت کا بہترین ذریعۂ اظہار شاعری ہوا کرتی تھی۔ علاوہ ازآں شاعری کے ذریعہ سے بادشاہوں اور امیروں کے دربار کی راہ ہموار ہو سکتی تھی۔ اس لئے معاشرہ میں اس فن کو وسیلۂ بلندی درجات و حصول مال و منال سمجھا جاتا تھا۔ اور اکثر اشخاص خاص و عام اس فن میں دسترس کامل حاصل کرنے کی جد و جہد میں لگے رہتے تھے۔ روساء و امراء کے دربار میں بھی شعراء موجود رہتے تھے تاکہ انکی علم پروری و ہنر نوازی کا شہرہ ہو کیوں کہ شاعری امیروں اور رئیسوں کے نزدیک قابل افتخار تھی۔ اس وجہ سے عوام الناس بھی شعر و سخن سے غیر معمولی دلچسپی رکھتی تھی۔ اس لئے اٹھارویں صدی ہجری میں بھی گذشتہ صدیوں کی طرح غالبًا ہر کوئی شاعری کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ کسی امیر کا خدمت گار ہو یا کسی درگاہ کا جاروب کش یا کوئی معمولی حجّام، تمام معاشرہ شاعری کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ میر تقی میؔر نے اسی فضا میں اپنی شاعری کا آغاز کیا۔

اردو شاعری میں میؔر کو ''خدائے سخن'' کہا گیا ہے۔ وہ ایک مسلم الثبوت استاد مانے جاتے ہیں۔ ان کے زمانے سے لے کر آج تک بڑے بڑے شعراء و ناقدین نے انکی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ فارسی میں جب انکے جوہر طبع نکھرتے ہوئے معلوم ہوئے تو سعادت علی امروہوی نے ریختہ میں شعر کہنے کی ترغیب دی۔ بہر کیف، انکی فارسی شعر گوئی کی ابتداء پہلے ہوئی اور غالبًا گاہے بگاہے ریختہ کے دوش بدوش چلتی رہی۔ لیکن یہ بات روز روشن کی طرح صاف ہے کہ میؔر خدائے سخن اردو میں ہیں فارسی میں وہ صرف ایک خوش فکر شاعر ہیں۔

جس زمانے میں میؔر نے فارسی میں شعر کہنا شروع کیا، تب فارسی شاعری میں ظہوریؔ، بیدلؔ، فغانیؔ، طالبؔ اور کلیمؔ کا طرز مقبول عام تھا اور نکتہ یابی اور معنی آفرینی پر شعر کی خوبی کا انحصار تھا۔ میؔر نے زمانے کی اس روش کو اختیار نہیں کیا اور اپنے فطری اقتضا کو راہنما بنایا جو سادگی اور بے ریائی انکی طبعیت میں تھی وہی اشعار سے ٹپکتی ہے۔ جو انداز و اسلوب اردو میں ہے وہی فارسی کے لباس میں بھی جلوہ گر ہے۔ وہ دل برشتگی اور لب تشنگی جو میؔر کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ فارسی کے اشعار میں بھی نظر آتی ہے۔

بہ بزم عیش نہ داند کسی زبان مرا بہ جمع ماتمیاں حرف من اثر دارد

میؔر کی فارسی شاعری اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے ایک ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔ الفاظ کا صحیح استعمال اور انکی خاص ترتیب و ترکیب زبان میں موسیقی پیدا کر دیتی ہے۔ سادگی اور پیرایۂ زبان کی وجہ سے شعر کا رتبہ بلند ہو جاتا ہے۔ انکے

کلام میں تقریباً سب خوبیاں موجود ہیں۔انکی شاعری عاشقانہ ہے لیکن اخلاقی اور حکمانہ مضامین کو اپنے خاص رنگ میں سادگی وصفایی اور خوبی سے ادا کرتے ہیں۔انکا کلام انکی طبعیت وسیرت کی ہو بہو تصویر ہے اور یہ ہی وجہ ہے کہ وہ اصلیت اور حقیقت سے خالی نہیں۔دوراز کار استعارات، بعید از قیاس مبالغے اور خلاف امور عادات سے پاک ہے اور بھونڈے اور بے تکلف وتصنع اور فضول لفاظی کا نام تک نہیں۔قلبی واردات اور کیفیات کو نہایت سادہ،شستہ اور صاف زبان میں اپنے دلکش اسلوب میں بیان کرتے ہیں اس لیے جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں،وہ دل میں اتر جاتی ہے۔انکا کلام بہ لحاظ فصاحت و روانی سہل ممتنع ہے۔انکے اشعار سوز وگداز اور درد کی سچّی تصویریں ہیں۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میرؔ کی شاعری محض رنج وغم سے لبریز ہے۔میرؔ کی بڑائی اسی بات میں ہے کہ رنج وغم کے ساتھ ساتھ انہوں نے زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی اپنی شاعری میں اتنی خوبی سے جگہ دی ہے،جس خوبی سے وہ رنج وغم کی بات کرتے ہیں ان کو ہسنے کا فنبھی آتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ پر بھی ہنسنا جانتے ہیں۔انکی شاعری بہ ظاہر سادہ ہے لیکن اسکے اندر بہت گہرائی اور پیچیدگی بھی ہے۔

یہاں میرؔ کی فارسی شاعری کے متعلق ہمیں صفدر آہؔ کی مذکورہ رائے کو مدّنظر رکھنا ضروری ہے:

''میرؔ کی فارسی شاعری کے لئے مصحفؔی کا یہ دعوی کہ ''فارسیش ھم کم از ریختہ نیست'' کسی طرح درست نہیں مانا جا سکتا۔اردو ادب میں میرؔ کے ریختہ کا وہی مرتبہ ہے جو فارسی میں خواجہ حافظ کی غزلوں کا ہے۔میرؔ کی فارسی شاعری کو انکے ریختہ کا ہم مرتبہ قرار دے کر انہیں خواجہ حافظ کے برابر کا فارسی گو شاعر ماننا پڑے گا۔ظاہر ہے کہ یہ خیال کسی طرح قابل قبول نہیں۔بس ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میرؔ کی فارسی شاعری بھی ایک انفرادی رنگ کی ہے۔جس کا مرتبہ کافی بلند ہے۔'' (میرؔ اور میریات ۳۵۴)

میر کی فارسی غزل گوئی:

ویسے تو میرؔ نے فارسی نظم میں غزل کے علاوہ دیگر اصناف سخن مثلاً رباعی،مثنوی اور ترجیع بند میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن اردو کی ہی طرح فارسی میں بھی انکا اصل میدان غزل ہی ہے۔انہوں نے اپنی زندگی اور اپنے ماحول کا تمام درد و رنج اپنی غزلوں میں سمو دیا ہے۔میرؔ کا درد وغم انکی زندگی کی ناکامیوں اور محرومیوں کا بھی ہے اور دلّی کی تباہی و بربادی کا بھی۔یہی وجہ ہے کہ میرؔ کی شاعری کو اگر ''دل اور دلّی کا مرثیہ'' کہا جائے تو درست ہوگا۔میرؔ کی غزلوں میں جو سوز وگداز اور اثر وتاثیر ہے وہ اور شاعروں کے یہاں نظر نہیں آتا۔انکی بات دل سے نکلتی ہے اور دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔اپنی اسی کیفیت کی بدولت انکی غزلوں کے اشعار کو نشتر کہا گیا ہے۔دلی جذبات واحساسات کو انہوں نے سیدھی سادی زبان اور

عام لب و لہجے میں اس فن کاری کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان کی آپ بیتی، جگ بیتی اور انکا غم زمانے بھر کا غم معلوم ہوتا ہے۔ذیل میں میرؔ کی فارسی غزل گوئی کی خصوصیات ملاحظہ فرمائیں:

اردووفارسی کے ہم مضمون اشعار:

جومشابہت لسانی اردو اور فارسی کے درمیان ہے۔وہی مشابہت لسانی ہمیں میرؔ کی اردو اور فارسی غزلوں میں بھی نظر آتی ہے۔میرؔ کے فارسی کلام پر ان کے اپنے مزاج کی گہری چھاپ ہے وہ اردو شاعری کی طرح فارسی میں بھی کسی کی پیروی نہیں کرتے۔انکی فارسی غزلوں کا رنگ اردو غزلوں کے جیسا ہے۔بلکہ اکثر فارسی اشعار اردو کا چربہ یا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر ذیل کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

فارسی: میرؔ جائی کہ بہ نیزان محبت می سوخت — صبح دیدم بجا ماندہ کف خاک آنجا
اردو: آہوں کے شعلے جس جا اٹھے ہیں میرؔ شبکو — واں جا کے صبح دیکھا مشت غبار پایا

فارسی: دل می کشد بہ صحرا ھنگام کار آمد — شوریست در سر من شاید بہار آمد
اردو: اک موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئیں — شاید کہ بہار آئیں زنجیر نظر آئیں
فارسی: وی در سینہ من قطرہ خونی بود است — چون بچشم آمد از شیوۂ طوفان دیدم
اردو: جگر ہی میں یک قطرہ خون ہے رشک — پلک تک گیا تو تلاطم کیا
فارسی: منعم ای خانہ خراب این ھمہ شوق تعمیر — سالھا ساختۂ جاہ و مکان آخر ھیچ
اردو: منعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا — پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا
فارسی: خرامت بطرزی کلامت بطوری — تر اکم کسی میرؔ فھمیدہ باشد
اردو: تیری چال ٹیڑھی تیری بات انوکھی — تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسی نے

تغزل:

میرؔ نے اپنی فارسی غزلوں میں تغزل کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔انکی فارسی غزل گوئی میں تغزل کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔جن میں محبوب کے حسن ناز و انداز اور اسکی ہر ادا کو انتہائی دل چسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔میرؔ کے یہاں تکلف وتصنع کا احساس نہیں ہوتا۔اسی لئے دورازکار تشبیہات واستعارات سے میرؔ نے اپنے تغزل کو زیر بار نہیں ہونے دیا۔اسی وجہ سے میرؔ کی شاعری میں علم بدیع کے صنایع و بدایع کم ہی نظر آتے ہیں۔حدیث دل بیان کرنے کے لیے جس صاف وشفاف اور پیچیدگی سے پاک انداز بیان کی ضرورت ہوتی ہے، میرؔ نے اسکو اپنا اسلوب بنایا ہے۔میرؔ سوز و گداز کا

منبع ہیں۔اسکی ترجمانی فطری طور پراس انداز بیان سے نہیں ہوسکتی جوان کے ضروری تکلفات کے بوجھ تلے دبا ہو۔ذیل میں تغزل کی چند مثالیں ملاحظہ ہو۔

☆ ای کہ آن کہ از دیار غریبان رسید ہ ای — باری مگو کہ میرؔ در آن چہ حال داشت

☆ تا کجا شد میرؔ خاک افتادہ ازکوی تو آہ — خشت بالین ھست واودر سایۂ دیوار داشت

☆ این بی کسی نگر کہ کسی چشم تر نہ کرد — یک ابر بہ خاک غریبان گذر نہ کرد

☆ از ما حکایت غم دل می توان شنید — ما خوب می کنیم بیان این مقالہ را

حسن وعشق:

میرؔ نے اپنی عشقیہ شاعری خاص طور سے فارسی غزلوں میں غزل کے حقیقی معنی ومفہوم ''راز گفتن بہ معشوق'' کو بہت ہی سلیقہ اور ہنرمندی کے ساتھ ادا کیا ہے۔انکے متعدد اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ آدم بیزار، گوشہ نشین اور قنوطی شاعر نہیں بلکہ ہماری دنیا کے گوشت پوست سے بنے ایک انسان ہیں۔جس کے سینہ میں عشقیہ جذبات رکھنے والا ایک دل ہے۔ظاہر ہے کہ وہ اس انسانوں کی دنیا میں رہ کر کس طرح جذبہ عشق سے اپنے آپ کو روک سکتے تھے۔پس میرؔ بھی آتش عشق سے اپنا دامن بچا نہ سکے۔انکے یہاں یہ جذبہ اپنی تمام تر جلوہ آرایوں کے ساتھ از اوّل تا آخر موجود ہے۔بلکہ یہ کہا جائے تو بجا نہ ہوگا کہ ان کی ساری عمر عشق ہے اور اس پرخطر و پر پیچ و پرخار راہ عشق میں اسکا ایک ہی تجربہ ہے وہ ہے غم۔یہی وہ غم ہے جو عشق کا مرہون منت ہے۔وہی انکی شاعری کا سب سے بڑا محرک ہے جو انہیں قوت وتوانائی بخشتا ہے۔عشق مجازی کی وجہ سے ہی ان کے یہاں عشق حقیقی کا جذبہ پیدا ہوا ہے۔

☆ بیا ای میرؔ در راہ محبت خویش را گم کن — اگر خواہی کہ در یابی نشان بی نشانان را

☆ بامیدی کہ عشق آتش زند بر جان غمناکم — بسان شمع یک جا کردہ ام رگھای گردن را

☆ خطر در عشق ہر گام است جان بیقرارم را — عجب رہ آہ پیش آمد دل ناکردہ کامم را

☆ در عشق کس نگشت حریف نبرد ما — بر روی ما نیامدہ جز رنگ زرد ما

☆ زانچہ درد شت رفت بر مجنون — چہ خبر پردگیٔ محمل را

تصوف:

میرؔ کے والد ایک درویش تھے اور انکے موں بولے چچا سید امان جو انکے والد کے مرید تھے، وہ خود بھی ایک صوفی تھے۔میرؔ کی پرورش بھی انہی دو حضرات کے زیر سایہ ہوئی تھی۔میرؔ کو لڑکپن سے ہی درویشوں کی مجلسوں میں حاضری اور انکے گرانقدر ملفوظات سننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔جس نے انکو صوفیانہ رنگ میں رنگ دیا اور ان کا یہ رنگ تادم حیات انکی

شخصیت پر غالب رہا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ میرؔ کی فارسی غزلوں میں بھی وحدت الوجود کا نظریہ، جبر کا فلسفہ اور قناعت و درویشی کا رویہ جا بجا نظر آتا ہے۔ انکے فارسی دیوان پر صوفیانہ رنگ نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

☆ بجویم ترا ھر کجا تا کجا بجا ی رسان جستجوی مرا
☆ رفتۂ شوق شود دیر و حرم را بگذار طوف کن میرؔ بھر در بسجود آمدہ را
☆ گل و آئینہ و مہ خورشید ھر کسی رو بسوی تو دارد
☆ جلوہ ہا داریم واز ھر جلوہ بخود گشتہ ایم خود تماشا ئیم و خود محو تما شا گشتہ ایم
☆ بند گی کیشم نیم زنھار در بند جھت رو بھر جانب کہ می آرم سجود ی می کنم

عیش ونشاط:

عام طور پر میرؔ کو قنوطی شاعر کہتے ہیں اور یہ تصوّر کیا جا تا ہے کہ انکی شاعری میں صرف رنج وغم کا رنگ طاری وساری ہے۔ مگر یہ دیکھ کر بے حد تعجب ہوتا ہے کہ جب کبھی ان کی خستہ طبیعت پر انبساطی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو اس قدر شوخ و شنگ ہو جاتے ہیں کہ ان کی عمومی شناخت مشکل ہو جاتی ہے اور ان کا رنگ یکسر بدل جا تا ہے لیکن یہ میرؔ کی پائیدار کیفیت نہیں ہے۔ اور ایسے اشعار جو عیش ومستی کے رنگ سے لبریز ہیں انکی تعداد بھی بے حد کم ہے مگر اس کے باوجود میرؔ کی فارسی شاعری میں ایسے اشعار بھی ہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

☆ باتو برھنہ خفتہ ام سینہ بہ سینہ لب بلب راز نھان بشنفتہ ام سینہ بہ سینہ لب بلب
قوت وصل می کشد میرؔ مران درین غزل فی زھوا شگفتہ ام سینہ بہ سینہ لب بلب
☆ گر عاشق آن دلبری دیوانہ شود دیوانہ شو خواھی وصال آن پری دیوانہ شود دیوانہ شو
☆ دل می کشد بصحرا ھنگام کا رآمد شوری است در سرمن شاید بہار آمد

دنیا کی بے ثباتی:

میرؔ نے اپنے کلام میں جس شدّت کے ساتھ اس جہان ناپائیدار کی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ وہ جذبہ دیگر شعراء کے یہاں مفقود ہے۔ اسکی وجہ انکے عہد کی سیاسی واقتصادی بدحالی اور خود انکی ذاتی پریشانی ہے۔ مذکورہ عناصر نے میرؔ کو اس قدر دل شکستہ ومایوس کر دیا تھا کہ وہ موت میں سکون اور زندگی میں دکھ دیکھتے تھے۔ اسی لیے وہ لمحہ بھر کو بھی اس جہان کی بے ثباتی و ناپائیداری کو فراموش نہیں کرتے تھے۔ میرؔ، احمد شاہ ابدالی کی فوج کی خونریزی وغارتگری کے عین شاہد تھے اور انہیں حالات کو انہوں نے بار بار اپنے اشعار میں نظم کیا ہے۔

☆ طور و طرز رفتن اہل جہانم داغ کرد عالمی بگذشت ازین راہ ونشان معلوم نیست

☆ غافل مشوزرفتن ،کین طاق چرخ نیلی از گر د راہ یاران بر خاستہ غیار ی
☆ وقت آن کس خوش کہ گلزار جہان را دید ورفت ھم چوگل بر بی ثباتی تیہائ خود خندید ورفت
☆ رفتۂ شوق شود دیر و حرم را بگذار طوف کن میرؔ بھر در بسجود آمدہ را
☆ وقت رحیل آہ بخواب گران گزشت تاچشم و اکنم ز نظر کاروان گزشت

رنج وغم:

جس زمانہ میں میرؔ کی شاعری عروج کی منزلیں طے کررہی تھی، ہندستان میں قدیم جاگیردارانہ زنظام زوال پذیر ہورہا تھا۔معشیت پوری طرح برباد ہوچکی تھی۔جس کے اثر سے غریبی تیزی کے ساتھ پھیل رہی تھی جس سے امراء وعوام کے ساتھ ساتھ شعراء وادباء بھی بدحالی کا شکار ہورہے تھے۔اس بدحالی کے نتیجہ میں معاشرے میں ایک قسم کی یاس وحراص کی فضاء بن گئی تھی۔اسی لیے میرؔ کے کلام میں احساس غم پوری طرح غالب نظر آتا ہے۔رنج والم کے اس مضمون کی کثرت نے انکے کلام میں ایک قسم کی ناگوار یکسانیت پیدا کردی ہے۔بے شک میرؔ کے کلام میں جذبہ غم طاری ہے لیکن رنج وغم زندگی کی حقیقت میں سے ایک ہے۔اوراس کے اثر سے انسان کی شخصیت میں بردباری پیدا ہوتی ہے۔میرؔ کی شاعری درد انگیز ضرور ہے لیکن زہرناک یامردم بیزار نہیں۔میرؔ نے یاس وحراس کے مضامین کو کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے،اس کی چند مثالیں ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

☆ بہ جمع ماتمیان حرف من اثر دارد بہ بزم عیش نہ داند کسی زبان مرا
☆ لب را گھی بخندہ نیا آلودہ ایم ما تا بودہ ایم گریہ کنان بودہ ایم ما
☆ بس کن اشعار ماتم دل میرؔ بر مخوان واقعات متصل را
☆ ھمچو میرؔ آزردہ جانی دیر پیدا می شود مغتنم دانید روز چند این درویش را

میرؔ کے فارسی دیوان میں ایک اور چیز کافی دلچسپ ہے،وہ یہ کہ بعض غزلوں میں انہوں نے اپنا تخلص غزل کے پہلے ہی شعر میں استعمال کیا ہے۔یعنی میرؔ نے غزل کے آخری شعر میں تخلص لانے کے بجائے پہلے شعر میں ہی اپنا تخلص رکھا ہے۔یہ بات کافی دلچسپ ہے جو عام طور پر دیگر ہمعصر شعراء کے یہاں نظر نہیں آتی۔البتہ فارسی میں شیخ سعدیؔ کی غزلوں میں کہیں کہیں یہ چیز دیکھائی دیتی ہے۔ذیل میں چند اشعار بطور مثال ملاحظہ ہوں۔

☆ میرؔ دنیا رہ گزار ی بیش نیست آسمان گرد و غباری بیش نیست
☆ میرؔ آن کہ چشم شوق بہ ابروی یار داشت ھر دم جگر فگار بہ شمشیر کار داشت
☆ می گفت میرؔ،گریہ کنان چون زھم گذشت کاین پنج روزہ عمر بہ صد درد غم گذشت

رباعیات:

میرؔ نے جہاں دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، وہیں رباعی کی صنف میں بھی ان کے تخلیقی جوہر نمایاں ہوئے ہیں۔ گو ان کے فارسی دیوان میں رباعیات کی تعداد زیادہ نہیں، صرف ایک سو چار رباعیاں ہی ہیں۔ مگر ان میں میرؔ کا شعری آہنگ اس درجہ نمایاں ہے کہ ان کا مطالعہ کئے بغیر ہم میر کی فارسی گوئی کو نہیں سمجھ سکتے۔ میرؔ کے دور تک اور ان کے بعد تک بھی رباعی کو اخلاقی مضامین کا اظہار ہی سمجھا گیا۔ واعظانہ موضوعات کے سانچے میں ڈھلی ڈھلائی رباعیاں زندگی کے دوسرے تجربوں سے دامن بچائے رہیں اور اس راسخ عقیدے پر ہمیشہ قائم رہیں کہ ان میں جو کچھ ہے وہ فقط واعظ و محتسب کی کہانی، دنیا کی بے ثباتی اور موت و زندگی کے مضامین ہیں۔ لیکن میرؔ کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے رباعی میں وہ مضامین بھی باندھے جو آگے چل کر جنس و جمالیاتی کی تفسیر بنے۔

رباعی جیسی مشکل صنف سخن میں ایک جہان معنی کو سمونا اور مخصوص بحروں کے حدود میں رہ کر شعری محاسن کو برقرار رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے مگر میرؔ نے اپنی تخلیق قوّت اور فنی صلاحیت کے سہارے اس صنف میں بھی اپنا اعتبار قائم رکھا ہے۔ میرؔ کی فارسی شاعری میں یہ رباعیاں محض اس لئے اہم نہیں ہیں کہ انہیں میرؔ نے کہا ہے بلکہ ان کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ میرؔ نے ان میں وہ مضامین بھی باندھے ہیں جو اس دور کے رباعی گو شعراء کی لائق التفات نہیں تھے۔ میرؔ کے ذہنی سفر میں رباعیات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ہر وہ تجربہ جو شعر بن سکتا ہے وہ کسی صنف کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق شاعری سے ہے۔ میرؔ جیسا شاعر اگر ہو تو رباعی میں یہ مضمون و معنی آفرینی بھی پیدا کر سکتا ہے۔ میرؔ کی فارسی رباعیاں بھی کم و بیش انکی اردو رباعیوں کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔

اردو و فارسی کی ہم مضمون رباعیاں۔

فارسی:	طفلی ھمہ ای میرؔ بہ غفلت بگذشت	برنائ من بہ عیش و عشرت بگذشت
	در شیب جز افسوس کنون نتوان کرد	مھلت کم ماند و وقت فرصت بگذشت
اردو:	ایّام لڑکپن کے کٹے غفلت میں	اوقات جوانی کی گئ عشرت میں
	پیری میں جز افسوس کیا کیا جاے	یک بار کمی آہی گئ طاقت میں
فارسی:	من وز کوی تو عزم سفر دروغ دروغ	مرا دماغ کجا این قدر دروغ دروغ
	تو و خیال وفا کذب و افترا و غلط	من و تو ہم مہر دگر دروغ دروغ
اردو:	ہم اور تیری گلی سے سفر دروغ دروغ	کہاں دماغ ہمیں اس قدر دروغ دروغ
	تم اور ہم سے محبت تمہیں خلاف خلاف	ہم اور الفت خوب دگر دروغ دروغ

دنیا کی بے ثباتی کا مضمون۔

بود انچہ نہ دیدنی درین جا دیدیم مکر وہ کشیدیم و بلا ہا دیدیم
اکنون ای میرؔ چشم باید پوشید دنیا دیدیم و اہل دنیا دیدیم

اپنے فقر کی تعریف۔

عزّت طلبم وقار خود خواہانم سر کردۂ فرقۂ دل آگاہا نم
بر ظاہر فقر من نگاہی نہ کنی من صدر نشین مجلس شاہانم

عاشقانہ مضمون۔

بر قد دل آرائ تو پر می نازم سرو د شمشاد را خجل می سازم
از شام گرفتہ تا سحر در گلزار بالای ترا بلند می اندازم

شہر آشوب:

میرؔ کے مذکورہ دیوان میں مثنوی کی صورت میں ایک شہر آشوب بھی شامل ہے۔ میرؔ کے فارسی دیوان میں رباعیات کے بعد ۱۱۱۶ اشعار کی ایک مثنوی بغیر کسی عنوان درج ہے۔ یہ غالباً نا تمام ہے۔ نسخہ ادبیات اردو، حیدرآباد میں اس کا نام ''درفراق شہر ہند'' لکھا گیا ہے۔ جناب صفدر آہ نے اپنی کتاب میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ میرؔ نے یہ مثنوی غالباً کمبھیر یا کاماں کے قیام کے دوران کہی ہوگی۔ (میرؔ اور میریات، ص:۳۵۹) اگر ہم میرؔ کے اس شہر آشوب جو مثنوی کی شکل میں کہا گیا ہے، کو صحیح طور پر سمجھنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ پہلے ہم دہلی سے میرؔ کے تعلق کو جاننے کی کوشش کریں کیوں کہ اس کے بغیر کسی نتیجہ پر پہنچنا ممکن نہیں۔

میرؔ کا دلّی سے تعلق:

میرؔ بچپن میں ہی روزگار کی تلاش میں آگرہ سے دلّی چلے آئے تھے۔ ہر چند انکا وطن و مولد تھا لیکن انہوں نے اس شہر میں ہوش سمبھالا، میرؔ نے اپنے دلّی میں قیام کے طویل زمانہ میں اس دور کی دلّی کا بے حد قریب سے مشاہدہ کیا اور وہ یہاں کی سیاسی، سماجی اور ادبی فضا سے متاثر بھی ہوئے جس کے نتیجہ میں انہیں اس شہر سے ایک خاص قسم کا جذباتی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔

میرؔ کے زمانہ میں سیاسی و اقتصادی زوال کے باوجود بھی دلّی کو وہی اہمیت حاصل تھی جو عہد سلطنت و مغلیہ میں اسکی شان تھی۔ ادبی و تہذیبی اعتبار سے دہلی ہی ہندستان کا واحد مرکز تھا جہاں کی زبان و تمدن مستند مانے جاتے تھے۔ میرؔ نے اپنی مذکورہ مثنوی میں جو دلّی کے لیے یا دو فریاد کی ہے اس میں دلّی انکی شخصیت کی داخلی فضاء کا استعارہ ہے اور دلّی گویا اس

عہد کی تہذیبی ماحول کی ایک علامت ہے جس نے ہندستان کے حکمراں مسلمانوں کا ایک خاص ہند وایرانی مزاج مرتب کیا تھا اور ایک ایسی تہذیب وضع کی تھی جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے بہت مقبول ومعروف رہی۔ میرؔ نے اس مثنوی میں صرف دلّی کو ہی نہیں بلکہ اسکی بربادی، اس کی تہذیب، اس کی عمارات، باشندوں اور اس کی زبان کا بھی ماتم کیا ہے۔ گو دلّی لاکھ اجڑ چکی تھی لیکن وہ ایک عظیم تہذیب کی نشانی تھی۔ چوں کہ تمام ملک اس کے ماتحت رہ چکا تھا اور اسی کی صحبت کے تربیت یافتہ تمام صوبوں کے حاکم اور ادب آموز ہوا کرتے تھے۔ اس لئے دلّی ہی ہر شہر اور قریہ کی معاشرت کا مرجع اور اصول تہذیب کا مرکز تھی۔

مثنوی ''درفراق شہر ہند'':

میرؔ نے اپنی اس مثنوی میں زور تخیل سے زیادہ، درد دل اور خون جگر سے زیادہ لالہ کاری کی ہے۔ اس مثنوی کے ہر مصرعے سے حب وطن کے جذبات جھلکتے ہیں۔ میرؔ نے اس مثنوی میں غربت وطن کے دل گداز جذبات کو ایسے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے کہ اس کو پڑھ کر دل تڑپ جاتا ہے، اس مثنوی کے تمام اشعار ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہو۔

مثنوی کی ابتداء ان اشعار سے ہوتی ہے۔ جن میں میرؔ کی قلبی کیفیت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ دلّی سے جدایی کے غم میں وہ خون کے آنسوں رو رہے ہیں۔

ای صبا گر سوی دہلی بگذری — ھمچو صرصر آہ مگذر سرسری
بوسہ دہ بر ہر قدم از سوی من — بو د بر آن خاک عمری روی من
بر مقابر آیۂ رحمت بخوان — در مساجد خدمتی از من رسان
ہم بکن پیدا جبین تازۂ ای — سجدۂ بر ہر سر دروازۂ ای
وقفۂ ای بر ہر سر کو ساعتی — بر در و بامش نگاہ حسرتی

دلّی سے دوری کے عالم میں اپنی بے کسی کا حال یوں بیان کرتے ہیں۔

بی کس ام ہر دم ملامت می کشم — کس چہ داند من چہ حالت می کشم
زرد گشتم زار گشتم دل گداخت — آب فرقت با مزاج من نہ ساخت
یاد یاران وطن از دل نہ رفت — تختہ ام زین وورطہ بر ساحل نہ رفت

دلّی کی عظمت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

شہر از بس خوش عمارت بودہ است — ہر مکانش قصر جنّت بودہ است

کو چہ اش دامان دل بگذاشتی راستہ یک شہر رونق داشتی
رونق و خوبی بہ ہر سو دیدہ ام صدر دولت بہ یک کودیدہ ام
زان بنا ہا مطلقاً آثار نیست از عزیزان ھیچ کس دیار نیست

مندرجہ شعر پر یہ مثنوی تمام ہوتی ہے۔جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نا تمام ہے۔

این بگفت وخضر جا بگذاشتہ شاہ شد درویش ودل برداشتہ

میرؔ کی منقبتی شاعری:

میرؔ کے فارسی دیوان میں منقبتی کلام زیادہ نہیں صرف دوازدہ بند کا ایک ترجیع بند شامل ہے۔میرؔ کی یہ منقبت گومختصر ہے مگر جتنی بھی ہے ان کے عقائد اور مؤدت اہلبیت سے سرشار ہے۔ثواب دارین کی خاطر میرؔ نے عشق محمدؐ وآل محمدؐ کی مدح سرائی میں جو اشعار کہے ہیں وہ عقیدت ووابستگی کی اس کیفیت سے مملو ہیں جو سمندر سے زیادہ گہری ہے۔اس ترجیع بند میں جو امیر المومنین سیدنا علیؑ کی مدح میں ہے۔ جناب امیرؑ کے فضائل کو عنوان بنایا ہے اور اپنا حال زار بیان کر ان سے دستگیری ومدد کی فریاد کی گئی ہے۔منقبت کا آغاز اس بند سے ہوتا ہے۔

تاثیر شد زنالہ نفس بی سرایت است دل تنگیم ز چرخ بہ اقصای غایت است
کی از کسم بغیر تو چشم حمایت است از خاک برگرفتنم اکنون رعایت است
یا مرتضٰی علیؑ کرمت بی نہایت است ہنگام دست گیری و وقت عنایت است

دراصل میرؔ کی منقبتی شاعری اسی احساس وادراک کا سرچشمہ ہے جس کے بارے میں حضرت شاہ شمس تبریز نے فرمایا ہے۔

مست وائ حیدریم دم ہمہ دم علیؑ علیؑ ہر دو جہان زدلبرم دم ہمہ دم علیؑ علیؑ

ان منقبت میں مولای کائناتؑ کی شان اس طرح بیان کی ہے۔

☆ آن ای کہ بعد ختم رسلؐ جانشین تو ای نور سپہر و رونق روی زمین تو ای
قیوم عرش و حامی شرع متین تو ای یعنی کہ جرم پوش ونیایش گزین تو ای
یا مرتضٰی علیؑ کرمت بی نہایت است ہنگام دست گیری و وقت عنایت است
☆ ختم است بر تو بعد نبیؐ خوبی صفات ذات تو یاد می دہد از جلوہ ہای ذات
سہل است پیش قدرت تو حلّ مشکلات عاجز نوازئ کہ بیایم زغم نجات
یا مرتضٰی علیؑ کرمت بی نہایت است ہنگام دست گیری و وقت عنایت است

میرؔ جناب امیرؑ کے حضور میں اپنی بے کسی کا حال اسطرح بیان کر کے مدد مانگتے ہیں۔

دل داغ وسینہ چاک وجگر خون زغم مراست ہنگامۂ عجب زفلک بر سرم بپاست
نالم اگر نہ پیش تو پس دادرس کجا ست مگذار نا امید کہ از تو امید ہا ست
یا مرتضٰی علیؑ کرمت بی نہایت است ہنگام دست گیری و وقت عنایت است

مندرجہ بند پر اپنی منقبت تمام کرتے ہیں۔

کوہ وقار بود کہ ممنون ہر خسی ست
بہر تلاش نان بہ درنکس و کسی ست
ذلت پی تنبّہ میرؔ این قدر بسی ست
بخشایشی کہ بی دل و بی یار و بی بسی ست
یا مرتضٰی علیؑ کرمت بی نہایت است
ہنگام دست گیری و وقت عنایت است

حاصل کلام:

خواہ میرؔ نے اپنی اردو شاعری کی طرح اپنی فارسی شاعری کے لیے بھی دعویٰ کیا ہے۔

گزشت نوبت قدسیؔ و صائبؔ و طغرا
در این زمان ہمہ دیوان میرؔ می خوانند

مگر انکے فارسی کلام کا باغور مطالعہ کرنے پر یہ دعویٰ درست ثابت نہیں ہوتا۔ میرؔ کے فارسی کلام کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کی رائے ایک حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے: ''میرؔ نے یہ (فارسی گوئی) ایک تجربہ کیا تھا کہ اگر اپنے اردو اشعار اور اپنے مخصوص شعری مزاج کو فارسی میں ڈھلا جائے تو شاید اس کا اثر بھی اردو شاعری جیسا ہو، لیکن یہ تجربہ کامیاب نہیں رہا اور انہوں نے دو سال بعد فارسی گوئی ترک کر دی۔'' (محمد تقی میر، ص: ۷۵)

☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر عارف نوشاہی
ادارۂ معارف نوشاہیہ
اسلام آباد، پاکستان

سیّد علی رضا نقوی (۱۹۳۳-۲۰۱۷ء)

(پاکستان کے ایک لائق فارسی تذکرہ شناس اور فائق لُغت نگار) ☆

I

پاکستان و ہند اور ایران میں جو لوگ فارسی تذکروں اور زبان و لغات سے دل چسپی رکھتے ہیں ان کے لیے ڈاکٹر سید علی رضا نقوی (اس کے بعد: ڈاکٹر صاحب) کا نام نہ صرف جانا پہچانا ہے بلکہ معتبر بھی ہے۔ پاکستان کا یہ لائق فارسی تذکرہ شناس اور فائق لغت نگار ۹ دسمبر ۲۰۱۷ء کو لاہور میں ایسی خاموشی سے ہم سے رخصت ہوا[۱] کہ مجھ ناچیز تک کو، جسے ان کی شاگردی اور نیازمندی کا تقریباً نصف صدی شرف حاصل رہا ہے، بروقت خبر نہ ہو سکی! اس پر ستم ظریفی یہ کہ جس روز (۱۲ دسمبر ۲۰۱۷ء) سماجی ذرائع ابلاغ پر ان کی وفات کی خبر نشر ہوئی تو ان کے کچھ جاننے والے مجھے فون کر کے پوچھ رہے تھے کہ آیا یہ خبر درست ہے؟ کاش یہ خبر درست نہ ہوتی۔ مجھے ۱۴ مارچ ۲۰۰۶ء کا واقعہ یاد آ گیا جب ایران سے ایک تذکرہ **خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار (بخش کاشان)** چھپ کر میرے پاس آیا۔ تذکرے کے بے خبر مرتّب نے ڈاکٹر شہریار نقوی اور ڈاکٹر علی رضا نقوی کی شخصیات کو گڈ مڈ کر کے مقدمے میں یہ حاشیہ چڑھا دیا کہ ڈاکٹر نقوی مولفِ کتاب **تذکرہ نویسی** ''چند سال پہلے رحمت ایزدی سے جا ملے ہیں۔ خدا ان پر رحمت کرے''۔[۲] ڈاکٹر علی رضا نقوی ان دنوں اسلام آباد ہی میں مقیم تھے۔ میں نے فوراً فون اٹھایا۔ مجھے ان سے بے تکلفی سے بات کرنے کی جو اجازت اور رعایت حاصل تھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، از راہ تفنن کہا کہ استادِ محترم میرا آج کا فون آپ کی وفات پر آپ ہی سے تعزیت کے لیے ہے! وہ ہنسے اور صورت حال جان کر محظوظ ہوئے۔ ۱۲ دسمبر ۲۰۱۷ء کو بھی میں نے ان کی خبر سن کر فوراً فون اٹھایا اور وہی نمبر ملایا، لیکن صدائے برنخاست۔ وہ آواز اب واقعی خاموش ہو چکی تھی۔

II

۲۳ ستمبر ۱۹۷۱ء کو خانۂ فرہنگ ایران، ۳۴-بی سیٹلائٹ ٹاؤن، راول پنڈی میں فارسی سیکھنے کے لیے ہماری دوسری جماعت کا وہ پہلا دن تھا۔ ہم چند طلبہ و طالبات کمرے میں بیٹھے نئے استاد کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک انجانی شخصیت کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک غیبی قوت نے ہم سب حاضرین کو تعظیماً کھڑا کر دیا۔ وہ شخصیت اپنے لیے مخصوص کرسی

پر تشریف فرما ہوئی اور ان کی زبان سے پہلا جملہ یہ ادا ہوا'' بہ کلاس دوّم خوش آمدید''۔ یہی ڈاکٹر سید علی رضا نقوی تھے ۔خوش شکل، خوش گفتار، خوش لباس، خوش قامت۔ انھوں نے تدریس کے حوالے سے ایک مختصر نصیحت آمیز تقریر کی جس کا ایک نکتہ یہ تھا کہ پہلی جماعت میں ہمیں جو چیزیں بتائی گئی ہیں، اگر دوسری جماعت میں وہ ان کو کسی دوسرے انداز میں بتائیں تو انھیں سابقہ استاد کے انداز پر آنے کے لیے نہ کہا جائے بلکہ جو چیز جیسے وہ بتائیں اسی کو درست جان کر استعمال کریں۔ یہ نکتہ ان کے خود پر اعتماد کی علامت تھا۔

ڈاکٹر صاحب سے تعلق کا جو سلسلہ ۱۹۷۱ء میں ان کی شاگردی اختیار کرنے سے شروع ہوا وہ ۱۹۸۴ء میں ان کے ساتھ کچھ عرصے (۱۹۸۹ء تک) کے لیے ہمکاری میں بدل گیا جب میں رسالہ **دانش**، اسلام آباد کا مدیر اور وہ اعزازی مشیر مقرر ہوئے اور اس دوران بھی ان سے سیکھنے کا موقع ملتا رہا۔ ان سے نیازمندی کا یہ رشتہ ان کے آخری ایام تک برقرار رہا۔ یہ کوئی ۴۶ سال کا عرصہ بنتا ہے۔ اس عرصے میں نہ وہ مجھ سے اور نہ میں ان سے بے خبر رہا۔ آخری چند سالوں کو چھوڑ کر جب وہ کینیڈا اور بعد میں لاہور جا کر رہنے لگے، ہم ۱۹۷۱ء سے جڑواں شہروں راول پنڈی اسلام آباد میں رہ رہے تھے اور موقع مناسبت سے یہاں تہاں ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں نے ان کی ذاتی زندگی کو تو نہیں، البتہ علمی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی دو کتابوں کو چھوڑ کر، جو میرے علمی شعور سے پہلے پہلے تہران سے چھپ چکی تھیں، ان کا بقیہ سارا کام میرے سامنے ہی منصۂ شہود پر آیا اور میں ان کی تمام علمی سرگرمیوں کا عینی شاہد ہوں۔ خانۂ فرہنگ ایران راول پنڈی میں فارسی تدریس ہو یا مثنوی مولانا کا درس، رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران اسلام آباد اور مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد میں تقریبات ہوں یا فارسی/انگریزی ترجمہ کاری، ادارۂ تحقیقات اسلامی میں شعبۂ فقہ شیعہ کی ملازمت ہو یا سبک دوشی کی زندگی کے بعد قوانین فقہ شیعہ کے تراجم، ڈاکٹر صاحب کی مصروفیات کا مجھے علم رہتا تھا، بعض کا از خود اور بعض کا ان کی زبانی۔ ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر فارسی زبان و ادب کے آدمی تھے۔ لیکن وہ بقول خود، ادارۂ تحقیقات اسلامی جا کر فقہ کے صحرائے اعظم میں گم ہو گئے۔ ایران سے پلٹنے کے بعد ان کی زندگی کا بڑا حصّہ فقہی قوانین پر مبنی کتب تصنیف یا ترجمہ کرتے گذر گیا اور آخری وقت تک وہ اسی موضوع کو نبھاتے رہے۔ فقہی اور قانونی موضوعات پر کام کرنے کے باوجود وہ ''زاہد خشک'' نہ تھے۔ فارسی ادب کی شیرینی نے ان کے مزاج میں فقہی خشکی کو داخل ہونے نہیں دیا تھا ۔ان کی خوش گفتاری میں اردو اور فارسی کے اشعار اور برمحل ضرب الامثال شامل رہتے تھے۔ آخری مہینوں میں جب وہ کچھ اونچا سننے لگے تو برسبیل مزاح کہتے تھے:

بہرا ہوں میں، تو چاہیے دُونا ہوا التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

ڈاکٹر صاحب کی طرف سے میرے لیے توشۂ زندگی دوبیش قیمت چیزیں ہیں۔ایک انھوں نے میری فارسی تعلیم کی پختہ بنیاد رکھی اور دوسرا عمر بھر وہ میرے خیر خواہ اور دعا گو رہے۔مجھ پر انھیں جو معنوی حقوق حاصل ہیں، میں ان کی مادّی قیمت تو کبھی چکا نہیں سکا، اب ان کی وفات کے بعد خود پر ایک قرض واجب سمجھتے ہوئے یہ مضمون، ادائے دَین کے طور پر قلم بند کر رہا ہوں۔اس کے ابتدائی حصّے میں ڈاکٹر صاحب کے وہ ذاتی اور علمی حالات شامل کیے ہیں جو مجھ تک پہنچے ہیں اور دوسرے حصّے میں ڈاکٹر صاحب سے وابستہ اپنی کچھ یادیں بیان کی ہیں۔

III.حالات

ڈاکٹر صاحب ۱۴ مئی ۱۹۳۳ء کو امروہہ (ریاست اتر پردیش، بھارت) کے محلّہ گذری میں پیدا ہوئے۔ان کے والد سید صفدر حسین نقوی کی پانچ اولادیں ہیں، تین بیٹے اور دو بیٹیاں۔نرینہ اولاد میں ڈاکٹر صاحب منجھلے ہیں۔ان کے بڑے بھائی سید خوشتر حسن نقوی (مرحوم) اور چھوٹے بھائی کا نام سید نقی رضا نقوی (مرحوم) تھے۔اوپر آپ کا شجرۂ نسب مخدوم سید شرف الدین واسطی ملقب بہ شاہ ولایت (وفات: ۲۱ رجب ۷۸۳ھ/۱۳۸۱ء مدفون امروہہ) سے ملتا ہے۔آپ دسویں امام، حضرت علی نقی کی اولاد سے ہونے کی وجہ سے ''نقوی'' کہلاتے ہیں۔امروہہ نقوی سادات کا قدیم مرکز ہے۔ڈاکٹر صاحب کے خاندان کا ذریعہ معاش تھوڑی سی زرعی زمین تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے میٹرک کی تعلیم امام المدارس ہائی اسکول امروہہ میں حاصل کی۔۱۹۴۷ء میں انٹرمیڈیٹ کے لیے علی گڑھ چلے گئے اور وہاں داخلہ لیا۔۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بننے پر ان کے خانوادے نے پاکستان ہجرت کرنے کو ترجیح دی اور ڈاکٹر صاحب اپنے خاندان کے ساتھ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کو کراچی آ گئے۔کراچی میں اسلامیہ کالج سے ۵۲-۱۹۵۱ء میں انٹرمیڈیٹ مکمل کیا۔۱۹۵۳ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی اے (تاریخ اور سیاسیات مضامین کے ساتھ) پاس کیا۔اس کے بعد آپ نے گورنمنٹ کالج [یونیورسٹی] لاہور میں ایم اے انگریزی میں داخلہ لیا لیکن خاندانی ذمہ داریوں کے باعث لاہور چھوڑ کر واپس کراچی چلے گئے اور اسے مکمل نہ کیا۔کراچی میں ایس ام لا کالج سے ایل ایل بی مکمل کرنا چاہا لیکن امتحان میں نہ بیٹھے۔آخر جامعہ کراچی میں ایم اے فارسی میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۵ء میں امتیازی حیثیت میں امتحان پاس کیا۔ڈاکٹر غلام سرور (۱۹۰۹-۱۹۹۸ء) ان کے اساتذہ میں سے تھے۔ڈاکٹر سرور، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور پروفیسر ہادی حسن (۱۸۹۶-۱۹۶۳ء) کے شاگرد تھے۔ہادی حسن صاحب کا اپنے زمانے میں جدید ایرانی فارسی کے تلفظ اور فارسی تحقیق کے حوالے سے طوطی بولتا تھا۔ڈاکٹر نقوی نے ۱۹۵۳ تا ۱۹۵۶ء سہ سالہ بی اے (قانون) کراچی یونیورسٹی سے پاس کیا۔۱۹۵۶ء میں وہ وظیفہ پا کر ایران چلے گئے اور تہران یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔تہران یونیورسٹی میں فارسی زبان و ادب میں ڈاکٹریٹ کے لیے ایرانیوں اور غیر ایرانیوں کے لیے الگ الگ نظام تعلیم

ہے۔ایرانیوں کے لیے پڑھائی سخت اور دورانیہ طویل ہے جب کہ غیر ایرانیوں کے لیے پڑھائی نرم اور دورانیہ کم تر ہے ۔ڈاکٹر صاحب نے ایرانیوں کے لیے مخصوص ڈاکٹریٹ میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۳ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔تہران یونیورسٹی میں اُس زمانے کے جن نامور اساتذہ سے انھوں نے کسب فیض کیا ان میں عبدالعظیم قریب، بدیع الزمان فروزانفر، جلال الدین ہمائی، مدرّس رضوی، ابراہیم پور داود، محمد مقدّم، پرویز ناتل خانلری، صادق کیا، احسان یار شاطر، محمد معین، منصور اختیار، آیت اللہ سنگلجی شامل ہیں ۔ پاکستان واپس آ کر ایک بار پھر ایران گئے اور ادارۂ تحقیقات اسلامی میں اپنی نئی ملازمت کے تقاضے کے پیش نظر ۱۹۶۶ء میں تہران یونیورسٹی کے دانشکدۂ حقوق (لا کالج) اور دانشکدۂ الٰہیات سے شیعہ فقہ اور قوانین کا ایک سالہ کورس کیا۔تہران میں پی ایچ ڈی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ ایران کے انگریزی اخبارات ''تہران جرنل'' اور ''ایکو آف ایران'' میں بطور انگریزی مترجم کام کرتے رہے اور ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۴ء تک ایک انگریزی جریدے ''تہران اکونومسٹ'' کے ایڈیٹر رہے۔

۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر صاحب پاکستان واپس آئے اور اسی سال ادارۂ تحقیقات اسلامی میں ان کا فارسی زبان اور شیعہ فقہ کے ماہر کے طور پر ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے پر تقرر ہوا۔ یہ ادارہ کراچی میں قائم تھا۔جب دارالحکومت، اسلام آباد منتقل ہوا تو یہ ادارہ اسلام آباد منتقل ہو گیا اور ڈاکٹر صاحب بھی۔۱۹۹۳ء میں ڈاکٹر صاحب اس ادارے سے بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر ہی سبک دوش ہوئے۔اس ملازمت کے ساتھ ساتھ مختلف اداروں میں فارسی کی تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔چنانچہ ابتدا میں ایک سال تک انسٹی ٹیوٹ [اب یونیورسٹی] آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد میں پڑھاتے رہے۔۱۹۷۱ء میں خانۂ فرہنگ ایران، راول پنڈی میں نوآموزوں کو فارسی سکھانا شروع کیا اور یہ سلسلہ تقریباً ۲۷ سال تک جاری رہا۔اسی دوران تین سال تک وہاں مثنوی مولانا روم کا درس بھی دیتے رہے۔مثنوی فہمی میں وہ اپنے ایرانی استاد بدیع الزمان فروزانفر (۱۹۰۴-۱۹۷۰ء) کے مرہون منت تھے جن کا مولانا جلال الدین رومی اور **کلیات شمس** کی تدوین کے حوالے سے بڑا نام اور کام ہے۔

دوران ملازمت ڈاکٹر صاحب ادارۂ تحقیقات اسلامی کے جرائد **فکر ونظر** اور **اسلامک اسٹڈیز** (Islamic Studies) کی مجلس ادارت میں شامل رہے اور رایزنی فرہنگی سفارت ایران اسلام آباد کے سہ ماہی فارسی جریدے **دانش** کے اعزازی مشیر رہے۔

ڈاکٹر صاحب ایران میں اپنے پہلے طویل قیام کے بعد بھی مختلف کانفرنسوں میں شرکت کے لیے وہاں جاتے رہے۔چنانچہ ۱۹۸۴ء، ۱۹۹۳ء، ۱۹۹۴ء اور ۲۰۱۲ء میں وہاں تشریف لے گئے۔۱۹۹۳ء کا سفر شیخ مفید کانفرنس میں شرکت کے لیے تھا۔۲۰۱۲ء کا سفر اپنی کتاب **فرہنگ جامع** پر ایوارڈ وصول کرنے کے لیے تھا۔مختصر سفر پر دو بار عراق اور ایک بار کویت

گئے۔ڈاکٹر صاحب سال ۲۰۰۰ تا ۲۰۱۵ء وقفوں وقفوں سے اپنے بیٹیوں کے پاس کینیڈا میں بھی مقیم رہے۔انھوں نے زندگی اسلام آباد میں گذاری لیکن آخری آرام گاہ لاہور میں قرار پائی۔

IV. تصانیف وتراجم

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر صاحب کی فارسی علمی وراثت پر گفتگو کی جائے، بہتر معلوم ہوتا ہے ان کے فارسی سیکھنے کے شوق کا ذکر کیا جائے۔اگر چہ وہ بچپن ہی سے فارسی زبان سیکھنے کی طرف مائل تھے لیکن ان کے اس شوق کو مہمیز اس وقت لگی جب ۱۹۴۹ء میں سوویٹ یونین سے ایک علمی وفد پاکستان آیا، جس میں تاجکستان کے معروف شاعر میرزا تورسون زادہ (۱۹۱۱-۱۹۷۷ء) بھی شامل تھے اور انھوں نے کئی تقاریب میں فارسی کے تاجکی لہجے میں تقریریں کیں۔ڈاکٹر صاحب، جو اس وقت سولہ سال کے نوجوان تھے، تقاریر سنتے رہے۔انھیں محسوس ہوا کہ وہ ان تقریروں کو اچھی طرح سمجھ پائے ہیں لیکن اس زبان (فارسی) کو مزید سیکھنا چاہیے۔چنانچہ انھوں نے ''منشی فاضل'' کا امتحان دیا جو ہندو پاکستان میں فارسی زبان و ادب سے مخصوص ہے۔۱۹۵۵ء میں جب وہ جامعہ کراچی سے ایم اے فارسی کے امتحان میں اوّل آئے تو انھیں فارسی کے میدان میں آگے بڑھنے کی لگن لگی۔اس زمانے میں ایرانی سفارت خانہ کراچی میں تھا۔سفارت خانے کے ثقافتی قونصلر ڈاکٹر روستائیان نے ڈاکٹر صاحب کو اعلیٰ تعلیم کے لیے حکومت ایران کی طرف سے وظیفے کی پیش کش کی جسے ڈاکٹر صاحب نے قبول کرلیا اور وہ ایران چلے گئے اور تہران یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔وہاں ان کی ملاقات اپنے ہم وطن ڈاکٹر شہریار نقوی (۳) سے ہوئی جو تہران یونیورسٹی سے فارسی ادب میں ان سے پہلے ڈاکٹریٹ مکمل کر چکے تھے۔ان کی ہدایات کی روشنی میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی آیندہ تحقیق کا رخ متعین کیا۔شہریار نقوی نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے حافظ محمود خان شیرانی (۱۸۸۰-۱۹۴۶ء) کا یہ نظریہ دُھرایا کہ برّعظیم کے لوگوں نے فارسی زبان میں فرہنگ نویسی اور تذکرہ و تاریخ نگاری میں جو خدمات انجام دی ہیں، ایرانیوں کو ان سے کماحقہٗ متعارف نہیں کیا گیا، ایران جانے والے طلبہ کو چاہیے کہ وہ مقدور بھر اس ذمہ داری کو پورا کریں۔محمود شیرانی کی خواہش کی تکمیل میں، شہریار نقوی پہلے ہی **فرہنگ نویسی فارسی در ہند و پاکستان** لکھ چکے تھے جو ۱۹۶۲ء میں تہران سے شائع ہوئی۔ڈاکٹر صاحب نے تذکرہ نویسی پر تحقیق کو اپنے لیے چنا۔(۴)

ڈاکٹر صاحب نے تصنیف، تحقیق اور ترجمے کا کام ایران میں دوران تعلیم ہی شروع کر دیا تھا۔ان کا پہلا کام اردو کے ۱۵ جدید شعرا کے کلام کے فارسی ترجمے اور مختصر حالات زندگی پر مشتمل ایک کتابچہ **ہیمالیا (برگزیدۂ شعر پانزدہ تن از شاعران اردو زبان)** تھا جو انھوں نے اپنے ایک اصفہانی دوست ڈاکٹر جلیل دوست خواہ کی مدد سے تیار کیا اور ۱۹۶۳ء میں کتابخانۂ طہوری، تہران سے شائع ہوا۔اس میں حسب ذیل شعرا کو شامل کیا گیا ہے: الطاف حسین حالی، محمد اقبال، جوش ملیح آبادی، ن م راشد، اسرار الحق مجاز، علی سردار جعفری، فیض احمد فیض، جان نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، فارغ بخاری، جگن

ناتھ آزاد، قتیل شفائی، ساحر لدھیانوی، ادا جعفری، خاطر غزنوی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب اوائل عمری میں خود بھی اردو شعر کہتے رہتے ہیں اور ان کا یہ کلام ان کی ڈائریوں میں محفوظ ہے۔ کچھ نمونۂ کلام ان کے تعزیتی جلسے (منعقدہ ۲۶ دسمبر ۲۰۱۷ء ادارۂ فروغ قومی زبان، اسلام آباد) میں سننے کا اتفاق ہوا۔

جس کام نے ڈاکٹر صاحب کو علمی شہرت دی وہ ان کا پی ایچ ڈی کا تھیسز **تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان** (ہند و پاکستان میں فارسی تذکرہ نگاری) ہے جو ان کے فارغ التحصیل ہوتے ہی اگلے سال ۱۹۶۴ء میں تہران کے ناشر مؤسسۂ مطبوعاتی علمی نے شائع کیا۔ یہ اشاعت ۸۷۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ برّعظیم میں فارسی شعرا کی تذکرہ نگاری کی روایت کی تاریخ قلم بند کرنے کی پہلی علمی کوشش ہے۔ اس میں تاریخی طور پر برّعظیم کے علاقوں میں تقریباً ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء میں تصنیف ہونے والے پہلے فارسی تذکرے **لباب الالباب** سے لے کر ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء میں لکھے جانے والے **تذکرۂ شعرائے یزد** تک فارسی تذکروں کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد میں ایک اور تذکرے **برگزیدہ از پارسی سرایان کشمیر** کا تعارف بطور ضمیمہ شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح اس کتاب میں کل ۹۳ تذکروں کا تذکرہ ہوا ہے۔ کتاب کے آخر میں ۹ ضمیمے لگا کر مزید کئی تذکروں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ جس زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے ان تذکروں پر کام کیا تھا، بہت کم تذکرے شائع ہوئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے پاکستانی اور ایرانی کتب خانوں میں ان تذکروں کے مخطوطات دیکھ کر اور ہندوستان سے مخطوطات کی تفصیل منگوا کر اپنا کام راست مآخذ دیکھ کر مکمل کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا اس کتاب میں طریقۂ کار یہ رہا کہ ہر زیر بحث تذکرے کی ابتدائی سطور، مصنف کے حالات، کتاب پر تبصرہ، قلمی نسخوں کی تفصیل اور فہرست شعرا (یا اس کے لیے کوئی دوسرا حوالہ) درج کرتے ہیں۔ (۵)

ایران میں پہلوی دور سے ہر سال شائع ہونے والی مختلف موضوعات پر بہترین کتابوں کا چناو ہوتا ہے اور حکومت ایران کی طرف سے توصیفی سند کے ساتھ خطیر رقم انعام میں دی جاتی ہے۔ چنانچہ جب ڈاکٹر صاحب کی کتاب **تذکرہ نویسی** ایران میں شائع ہوئی تو اسے ۱۳۴۳ شمسی (۱۹۶۴ء) سال میں ''جایزۂ شہنشاہی'' (شاہی انعام) کے لیے فارسی ادب میں بہترین کتاب قرار دیا گیا اور نوروز (مارچ) ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر صاحب نے شاہ ایران محمد رضا پہلوی (عہد سلطنت: ۱۹۴۱-۱۹۷۹ء) کے ہاتھوں انعام اور شاہ کے دستخط کے ساتھ توصیفی سند حاصل کی۔ یہ ایران میں پاک و ہند کے کسی بھی فارسی محقق کو اس کی کتابی تحقیق پر ملنے والا پہلا انعام تھا۔ (۶)

ڈاکٹر صاحب ایران میں قیام کے دوران فارسی کے جدید لہجے اور جدید اصطلاحات سے آشنا ہوئے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ، ذاتی دوستوں، رفقاے کار، شرارتی بچوں اور باتونی بڑھیاوں سے فارسی کی نئی نئی اصطلاحات سنیں۔ اسی دوران انھیں جدید فارسی الفاظ و محاورات کی فرہنگ تدوین کرنے کا خیال گذرا۔ پاکستان واپس پہنچ کر انھوں نے اس

فرہنگ پر کام شروع کر دیا۔لیکن ڈاکٹر صاحب کی دیگر دفتری مصروفیات کے باعث اس کی تکمیل میں وقت لگا اور یہ **فرہنگ جامع فارسی بہ انگلیسی واردو/** *Standard Dicionary Persian into English & Urdu* نام سے پہلی بار ۱۹۹۴ء میں رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران، اسلام آباد اور نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد کے اشتراک سے شایع ہوئی۔اس ایڈیشن میں اسّی ہزار الفاظ شامل ہیں۔اس اشاعت کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب نے اس فرہنگ پر مزید کام جاری رکھا اور کئی اصلاحات اور اضافات کے بعد اس کی نظر ثانی شدہ اشاعت ۲۰۰۳ء میں رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران، اسلام آباد کی طرف سے عمل میں آئی۔لیکن ڈاکٹر صاحب اس اشاعت سے مطمئن نہ تھے کیونکہ طباعت کے دوران چھاپہ خانے نے عجلت میں کئی الفاظ کی تختیاں گم کر دیں اور وہ چھپنے سے رہ گئیں (مثال: صفحہ ۵۸۱ لفظ ''سمپوزیوم'' اور ''سیاست کردن'' کے درمیانی الفاظ)۔نیز کاغذ اور طباعت بھی غیر معیاری تھی۔چنانچہ ڈاکٹر صاحب اس کا تیسرا ایڈیشن مزید اصلاحات، تکمیل اور اضافات کے ساتھ ۲۰۱۱ء میں مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد کی طرف سے لائے اور اب یہی اس کا مستند ایڈیشن ہے۔اس فرہنگ کی خصوصیات حسب ذیل ہیں: فارسی لفظ کا اندراج، ایک اختصاری حرف کے ذریعے قواعد زبان کے لحاظ سے اس لفظ کی حیثیت کا تعیّن، رومن تلفظ، اردو اور انگریزی معنی، انگریزی لفظ کا بذریعہ اختصار اس کی حیثیت کا تعیّن۔بعض فارسی الفاظ کے ساتھ ستارے کی علامت لگائی گئی ہے۔اس کا مطلب ہے کہ یہ لفظ اردو میں بھی اسی طرح رائج ہے۔پاکستان میں موضوع کے اعتبار سے یعنی جدید فارسی الفاظ اور محاورات کے لیے مرتّب ہونے والی یہ دوسری فرہنگ ہے۔پہلی ایف ڈی رازی کی **فرہنگ نامۂ جدید فارسی-اردو-انگلیسی** (لاہور ۱۹۵۲ء طبع اول) تھی جس میں بیس ہزار الفاظ ہیں۔لیکن **فرہنگ جامع** کے تیسرے ایڈیشن میں تقریباً ایک لاکھ الفاظ ہیں اور اس کی جہات بہت وسیع ہیں۔**فرہنگ جامع** کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اردو ضمیمہ ''**فارسی املاء تلفظ قواعد (گرامر) کے بعض بنیادی اصول**'' بھی شامل ہے۔

اس فرہنگ کے تیسرے ایڈیشن کو ایران میں ''انتیسویں کتابِ سال'' کمیٹی نے سال ۲۰۱۱ء میں ایران سے باہر شائع ہونے والی فارسی زبان سے متعلق بہترین کتاب قرار دیا اور مصنف کو فروری ۲۰۱۲ میں ایران بلوا کر ایرانی صدر محمود احمدی نژاد (عہد صدارت: ۲۰۰۵-۲۰۱۳ء) کے ہاتھوں انعام دیا گیا۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ حروف نگاری اور صفحہ آرائی کے نقطۂ نظر سے **فرہنگ جامع** کے تینوں ایڈیشنوں میں کمزوریاں ہیں اور کوئی ایڈیشن بھی عالمی معیار طباعت کا نہیں ہے اور نہ ہی اُس محنت کو نمایاں کرتا ہے جو مصنف نے اس فرہنگ کی تیاری میں کی ہے۔بہتر ہوتا یہ فرہنگ، اوکسفورڈ جیسے اشاعتی ادارے سے شائع ہوتی جو فرہنگیں چھاپنے کا وسیع تجربہ رکھتا ہے۔

جیسا کہ بیان ہوا ڈاکٹر صاحب نے راول پنڈی کے ایرانی ثقافتی مرکز میں ۲۷ سال تک پاکستانیوں کو فارسی سکھائی۔ پہلے ایرانی ثقافتی مراکز میں ایرانی وزارت تعلیم کی تیار کردہ وہی درسی کتب پڑھائی جاتی تھیں جو ایرانی مدارس میں بھی رائج ہیں۔ڈاکٹر صاحب اوران کے رفیق کار ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی (۱۹۲۷ - ۱۹۹۷ء) مصنف **فارسی گویان پاکستان** نے جب ایرانی نصاب کو پاکستانی فارسی آموزوں کے لیے ناموزوں پایا تو خود درسی کتاب تیار کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ ۱۹۸۸ء میں ان دونوں کی مشترکہ کوشش سے **گلشن فارسی** تخلیق ہوئی جو سرورق کی تصریح کے مطابق ''کتاب درسی فارسی امروز برائے غیر فارسی زبانان'' (غیر فارسی زبانوں کے لیے جدید فارسی کی درسی کتاب) ہے اور یہ پاکستان میں قائم تمام ایرانی ثقافتی مراکز میں تدریس کے لیے تھی۔اس کتاب کی تین جلدیں تین مختلف درجوں کے لیے تیار ہوئیں اور خانۂ فرہنگ ایران راول پنڈی اور رایزنی فرہنگی سفارت ایران اسلام آباد کی طرف سے چند بار شائع ہو چکی ہیں۔ (۷)

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد کے لیے انھوں نے ڈاکٹر سبط حسن رضوی، ڈاکٹر محمد صدیق شبلی اور ڈاکٹر محمد ریاض (۱۹۳۵-۱۹۹۴ء) کے ساتھ مل کر ایک فارسی نصاب **فارسی انٹرمیڈیٹ یونٹ ۱۸-اکوڈ ۳۶۱** مرتب کیا۔ یہ کتاب ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مذہبی پس منظر، ادارۂ تحقیقات اسلامی سے وابستگی، ادارے کے تقاضوں اور تہران کے دانشکدۂ حقوق اور دانشکدۂ الٰہیات سے حاصل کردہ تخصص کی بنا پر بہت سا کام ملکی قوانین اور شیعہ فقہ اور عائلی قوانین پر تحقیق و تراجم کے ذریعہ کیا۔اس سلسلے میں ان کا پہلا کام انگریزی کتاب ***Judicial System of Pakistan*** کا فارسی ترجمہ **دستگاہ قضائی پاکستان** تھا جو وزارت قانون حکومت پاکستان نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔اگلے سال ۱۹۷۱ء میں ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد سے ان کی دوسری کتاب ***Family laws of Iran*** انگریزی میں شائع ہوئی۔ ۱۹۷۸ء میں ایران میں اسلامی انقلاب برپا ہوا، وہاں اسلامی قوانین پنپنے لگے اور قانونی طور پر فقہ شیعہ کا اطلاق ہو گیا تو ڈاکٹر صاحب کی توجہ وہاں کے قوانین کی طرف منعطف ہوئی۔ سب سے پہلے انھوں نے اسلامی جمہوریہ ایران کی مجلس شورائے اسلامی کی قانون ساز کمیٹی کا ۱۲ جولائی ۱۹۸۲ء کو منظور کردہ **مجموعۂ قوانین جزائی اسلامی ایران** کا انگریزی ترجمہ ***Islamic Penal Code of Iran*** کیا جسے مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد نے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔اردو میں انھوں نے **حدود و قصاص و دیات شیعہ** لکھی جو ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد ۱۹۸۵ء سے شائع ہوئی۔ روح اللہ خمینی (۱۹۰۲-۱۹۸۹ء) کے فتووں اور فقہی آرا پر مشتمل کتاب **تحریر الوسیلہ** کا عربی سے انگریزی میں ترجمہ ***Tahrir Al-vasilah*** کیا۔ یہ ترجمہ، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، تہران سے چھپ چکا ہے۔ جلد اول ۲۰۰۱ء، جلد دوم ۲۰۰۲ء، جلد سوم ۲۰۰۷ء، جلد چہارم ۲۰۱۱ء۔

ڈاکٹر صاحب نے شیعہ فقہی احکام اور قوانین پر چار کتابیں انگریزی زبان میں بہت محنت سے تیار کیں جو پاکستان اور ایران سے طبع ہو چکی ہیں۔ان کی تفصیل یہ ہے:

Shia Divorce Law (شیعہ قانون طلاق)،۲۰۱۲ء (پہلا ایڈیشن مجمع العالمی اہل البیت)،۲۰۱۶ (تیسرا ایڈیشن مرکز بین المللی ترجمہ ونشر المصطفیٰ قم)

Shia Inheritance Law (شیعہ قانون وراثت)،۲۰۱۲ء (پہلا ایڈیشن مجمع العالمی اہل البیت)،۲۰۱۶ء (دوسرا ایڈیشن مرکز بین المللی ترجمہ ونشر المصطفیٰ قم)

Shia Marriage Law (شیعہ قانون نکاح)،۲۰۱۵ء،۲۰۱۶ء (دوسرا اور تیسرا نظر ثانی شدہ ایڈیشن مرکز بین المللی ترجمہ ونشر المصطفیٰ قم)

Shia Wills Law (شیعہ قانون وصایا)،۲۰۱۷ء (مرکز بین المللی ترجمہ ونشر المصطفیٰ قم)

ڈاکٹر صاحب نے عراقی عالم دین اور شیعہ مرجع محمد باقر الصدر (۱۹۳۵-۱۹۸۰ء) کی اسلامی معیشت پر معروف کتاب **اقتصادنا** کا انگریزی ترجمہ بھی کیا جو پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اکنامکس (P.I.D.E) قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد سے شائع ہونا قرار پایا تھا لیکن اس کی اشاعت کی تصدیق نہیں ہو سکی۔

انھوں نے اسلامی جمہوریہ ایران و پاکستان کی سرکاری ثقافتی پالیسی (علی الترتیب منظور شدہ ۱۱ اگست ۱۹۹۲ء، ۱۹ فروری ۱۹۹۵ء) کا انگریزی ترجمہ ***Principles of the Cultural Policy of the Islamic Repbubic of Iran & the Islmic Republic of Pakistan*** کیا جو ۱۹۹۶ء میں مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد نے شائع کیا۔

تراجم کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی چند اور کتب بھی ہیں۔

ö اسلامی پردے کے موضوع پر زہرا رہنورد کی فارسی کتاب **زیبائی حجاب وحجاب زیبائی** کا انگریزی ترجمہ ***Beauty of Concealment and Consealment of Beauty*** کیا۔اسے رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران، اسلام آباد، نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔کتاب کی مصنفہ، سابق ایرانی صدر میر حسین موسوی کی اہلیہ ہیں۔

ö جواد منصوری کی فارسی کتاب **فرہنگ استقلال** کا اردو ترجمہ انھوں نے ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی کے ساتھ مل کر کیا جو رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران، اسلام آباد نے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔جواد منصوری ۱۹۸۹ تا ۱۹۹۳ء پاکستان میں ایرانی سفیر رہے تھے۔

ö ابوریحان بیرونی کی معروف عربی کتاب **آثارالباقیہ** کا اردو ترجمہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے ۲۰۰۲ء میں شائع کیا۔

مقالات:

ڈاکٹر صاحب کے اردو، فارسی اور انگریزی میں کئی مقالات ایرانی اور پاکستانی جرائد میں چھپتے رہے ہیں جن کی فہرست تیار ہونا باقی ہے۔ بعض مجلّاتی اشاریوں میں ڈاکٹر صاحب کے مطبوعہ مقالات کا اندراج ہوا ہے۔ یہاں ان اشاریوں کا ذکر کر کے چیدہ چیدہ مقالات کا ذکر کیا جاتا ہے:

اشاریوں میں مقالات کا اندراج:

ایرج افشار، **فہرست مقالات فارسی**، تہران، ۱۹۹۵ء، جلد ۵، ص ۷۰۸ (۸ مقالات)؛ تہران، ۲۰۰۴ء، جلد ۶، ص ۳۳۷ (مرتّب فہرست نے علی رضا اور شہریار نقوی کو خلط ملط کر کے دونوں کے مقالات کا یکجا ذکر کیا ہے، اس میں اندراج ۲۷۲۹ شہریار سے متعلق اور باقی ۱۳ اندراجات علی رضا سے متعلق ہیں)

ایران ناز کاشیان، **فہرست مقالات فارسی در زمینۂ تحقیقات ایرانی**، تہران، ۲۰۰۹ء، ج ۷، ص ۱۲۶۰ (۱ اندراج)؛ تہران، ۲۰۱۳ء، ج ۹، ص ۶۱۱ (۱ اندراج)

شیر نوروز خان، **اشاریہ فکر و نظر جولائی ۱۹۷۸ - جون ۱۹۹۳ء**، ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۴۶ (۴ اندراجات)

محمد شاہد حنیف، **پیغام آشنا ۱۰ سالہ اشاریہ/پیغام آشنا کے دس سال [فروری ۲۰۰۰ تا ۲۰۱۰ء]**، ضمیمۂ پیغام آشنا، شمارہ ۴۰، اسلام آباد۔ ۲۰۱۰ء، ص ۹۰ (۱ اندراج بسلسلہ فرہنگ جامع)

مرتضی موسوی و شگفتہ یسین عباسی، **فہرست موضوعی مقالات علمی فصل نامہ ی دانش درسی سال (از ۱۳۶۴ تا ۱۳۹۳ خورشیدی-۱۹۸۵ تا ۲۰۱۵ میلادی) از شمارہ ی ۱ تا شمارہ ی ۱۱۹**، دانش، اسلام آباد، شمارہ ۱۲۱، تابستان ۱۳۹۴/۲۰۱۵ء، ص ۲۱۹-۲۲۰ (۱۲ اندراجات)

چیدہ چیدہ مقالات:

۱۔ پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے زیر اہتمام **تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند** (لاہور، ۱۹۷۱ء)، کی تیسری، چوتھی اور پانچویں جلدیں فارسی ادب سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے چوتھی جلد کے نویں باب میں مضمون ''شعرا کے تذکرے ۱۵۲۶-۱۷۰۷ء'' (ص ۵۷۰-۶۱۹) اور پانچویں جلد کے چوتھے باب میں مضمون ''شعرا کے تذکرے ۱۸۵۷-۱۹۷۰ء'' (ص ۵۴۱-۵۵۴) قلم بند کیا۔

۲۔ جب **دانش** کا شمارہ ۵-۷ (۱۹۸۷ء) ڈاکٹر غلام سرور کے عین حیات ان کے لیے مخصوص کیا گیا تو ڈاکٹر نقوی نے اپنے اس استاد کا حق ادا کرنے کے لیے مضمون ''سیری در آثار استاد سرور'' (ص ۳۹-۵۷) لکھا۔ اس کے ابتدائیہ میں والہانہ طور پر یہ جملہ لکھا: ''میرے لیے یہ امر بے حد فخر و مباہات کا موجب ہے کہ میں استاد بزرگوار (غلام سرور) کے علم و فن کے باغ کا خوشہ چین ہوں اور مجھ بے مایہ پودے کی جڑ بھی دانش و ہنر کے اسی پُر گل و ثمر باغ سے جُڑی ہوئی ہے۔'' (ترجمانی)

۳۔ جب **دانش** نے افغانستان کے معروف شاعر استاد خلیل اللہ خلیلی (۱۹۰۷-۱۹۸۷ء) کی یاد میں خصوصی شمارہ ۱۲ (۱۹۸۷ء) نکالا تو ڈاکٹر صاحب نے خلیلی کی تمام دستیاب تصانیف کو سامنے رکھ کر ایک تعارفی مقالہ ''مختصری از شرح حال و آثار استاد خلیلی'' سپرد قلم کیا (ص ۹-۶۷)۔ استاد خلیلی کی تصانیف کے تعارف کے لیے ڈاکٹر صاحب کا یہ فارسی مقالہ اس قدر مفید اور معلوماتی ہے کہ جداگانہ شائع ہونے کے لائق ہے۔

۴۔ انھوں نے پاکستانی شاعر عطاء اللہ خان عطا (وفات: ۲۵ مارچ ۱۹۹۱ء ڈیرہ اسماعیل خان) کے فارسی مجموعۂ کلام **بزم سخن** (نشر: خانۂ فرہنگ ایران، پشاور، ۱۹۹۵ء) پر مختصر مقدمہ بھی لکھا۔

۵۔ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد نے جب مختلف زبانوں میں پاکستانی ادب کے تراجم کا اہتمام کیا تو معاصر اردو شاعری اور افسانوں کے تراجم پر مشتمل ایک مجموعہ **ادبیات پاکستان** نام سے اسلام آباد، ۱۹۹۵ء سے شائع ہوا۔ مترجمین میں ڈاکٹر علی رضا نقوی بھی شامل تھے۔

V. یادیں

مضمون کے اس حصّے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں ڈاکٹر علی رضا نقوی مرحوم سے متعلق اپنی یادوں کا کچھ حصّہ قلم بند کروں جس سے ان کے اخلاق جلیلہ اور نیک کردار پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

ö ۱۹۷۱ء میں جب ڈاکٹر صاحب کی شاگردی میں آیا تو میری عمر سولہ سال تھی۔ جماعت میں عمر اور قد و قامت کے لحاظ سے میں سب سے چھوٹا ''بچہ'' تھا۔ جماعت میں داخلے کے لیے عمر کی کوئی قید نہ تھی اور فارسی کے شوق میں ہماری جماعت میں چالیس پچاس سالہ افراد بھی موجود تھے۔ میں نے کوشش کی کہ اپنی خردی کے باوجود استاد محترم پر ذمہ دار اور محنتی طالب علم ہونا ثابت کروں۔ اس کے لیے ایک طالب علمانہ کوشش یہ کی کہ جو کچھ ڈاکٹر صاحب جماعت میں پڑھاتے تھے میں اسے الگ دفتر (کاپی) میں ایک خاص نظم و ضبط کے ساتھ، عمدہ لکھائی میں لکھتا جاتا تھا۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۷۱ء سے ۱۹ جنوری ۱۹۷۲ء تک انھوں نے ہمیں کل ۲۳ درس دیے۔ یہ سب کے سب میں نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ایک خاص ترتیب سے اس دفتر میں نقل کر لیے۔ ہر درس کی یادداشتوں میں ایک عنوان ''فرمودۂ آموزگار'' ہوتا جس میں ڈاکٹر صاحب کی نصاب سے ہٹ کر بتائی ہوئی کوئی ایک خاص بات یا نصیحت قلم بند کر لیتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے پرانے

واقعات بھی بتاتے رہتے تھے۔ایک دفعہ بتایا کہ جب وہ علی گڑھ میں پڑھتے تھے تو ان کے ایک استاد کا نام ''مسعود'' تھا۔وہ جلدی جلدی پڑھا کر فارغ ہو جاتے اور چلے جاتے۔اس عادت کی بنا پر سب لڑکے انھیں ''مسعود گھوڑا'' کہتے تھے،مگر جب ڈاکٹر صاحب نے پڑھنے میں دلچسپی ظاہر کی تو اس کے بعد مسعود صاحب ہمیشہ دل جمعی سے پڑھانے لگے۔

ö ہماری فارسی کی جماعت دوم جاری تھی کہ دسمبر ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ شروع ہوگئی۔سقوط مشرقی پاکستان کا المیہ بھی ہوگیا۔جنگ کے دوران تدریس ایک ماہ کے لیے روک دی گئی۔۶ جنوری ۱۹۷۲ء کو جب دوبارہ تدریس شروع ہوئی تو اس روز ڈاکٹر صاحب نے تمام حاضر طلبہ و طالبات سے خیریت دریافت کی اور استحکام پاکستان کی دعا کی۔اگرچہ گذشتہ جنگ کے نتائج کی وجہ سے وہ کچھ پریشان دکھائی دیتے تھے لیکن ان کا جذبہ اور حوصلہ بلند تھا اور مستقبل کے مسائل سے نمٹنے کے لیے دل میں بے پناہ جوش اور عزم کارفرما تھا۔ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ یہ جنگ صرف سرحدوں پر ہی نہ لڑی گئی بلکہ تمام قوم ہر جگہ اور ہر محاذ پر ملک و ملّت کے تحفظ کے لیے مصروف کار تھی۔

ö ۱۹ جنوری ۱۹۷۲ء کو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہماری آخری کلاس تھی۔اس روز انھوں نے دردمندی سے کچھ باتیں کیں جو میں نے قلم بند کر لیں۔یاد رہے کہ یہ ۱۹۷۲ء کی من وعن تحریر ہے اور لکھنے کا چنداں سلیقہ نہ تھا۔استادِ محترم نے فرمایا:

> ''فارسی کی یہ جماعت منعقد کرنے سے میرا مقصد دولت کمانا نہیں بلکہ علم و ادب سے والہانہ لگن مجھے یہاں تک کھینچ لاتی ہے۔اگر میں پیسے کمانا چاہتا تو میں ریڈیو یا ٹیلی ویژن میں بھی فارسی جماعت منعقد کروا سکتا ہوں۔خانۂ فرہنگ ایران راول پنڈی والے مجھے خریدنا چاہتے ہیں مگر میری قیمت ادا نہیں کر سکتے۔میری قیمت تو شاہ ایران بھی ادا نہیں کر سکے اور نہ ہی وہ مجھے خرید سکے۔وہ مجھے اپنا مشیر رکھنا چاہتے تھے،مگر میرے دل میں اپنے وطن اور ملّت کی محبت موجزن تھی اور میں اپنی قوم کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔میں اپنے وطن واپس لوٹ آیا۔اِس ملک میں بڑے بڑے درخشندہ و تابندہ ہیرے پڑے ہوئے ہیں مگر ناقدری کا شکار ہیں۔میرے پاس علم کا جو خزانہ ہے،اُسی قدر و قیمت کے ایک خزینے کے مالک جناب وزیرالحسن عابدی صاحب ہیں اور میں ان کی خاکِ پا ہوں۔''(۸)

میں نے جب ڈاکٹر صاحب کو ان کے دروس پر مشتمل اپنی تیار اور تحریر کردہ کاپی دکھائی تو وہ بے حد خوش ہوئے۔ڈاکٹر صاحب بار بار جماعت میں ہم شاگردوں کو حاضر رہنے اور دل چسپی سے فارسی سیکھنے کی نصیحت کرتے رہتے تھے۔اس طالب علمانہ کاوش سے میں تھوڑا بہت یہ تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ میں نے فارسی سیکھنے میں دل چسپی لی ہے۔

ö ۱۹۷۱ء سے ڈاکٹر صاحب ایک فرہنگ کی تیاری میں مصروف تھے۔ہر لفظ کے لیے وہ ایک پرچی یا کارڈ بنا

رہے تھے۔۔ڈاکٹر صاحب ان کارڈوں کو تہجی ترتیب میں لگانے کے لیے اپنے پسندیدہ شاگردوں سے مدد لیتے تھے۔اُس زمانے میں مجھے بھی یہ خدمت کرنے کا موقع ملا اور ڈاکٹر صاحب کے گھر جا کر ان کارڈوں کو ترتیب دیتا رہا۔اس فرہنگ کی تیاری طول کھینچ گئی۔۱۹۹۰ء کے بعد کہیں جا کر اس کی کتابت شروع ہوئی اور پروف تیار ہوئے۔۱۹۹۲ء میں جب میں تہران میں تھا تو ڈاکٹر صاحب ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے تہران تشریف لائے۔فرہنگ کے پروف ان کے پاس تھے۔وہ پروف میرے حوالے کر گئے اور میں نے اس کے ابتدائی پانچ سو صفحات کے پروف پڑھے۔۱۹۹۴ء میں یہ **فرہنگ جامع** کے نام سے شایع ہوئی۔ڈاکٹر صاحب نے فرہنگ کے دیباچے میں بغیر نام لیے اپنے ''شاگردوں'' کی معاونت کا شکریہ ادا کیا ہے۔

ö جب ۱۹۸۴ء میں رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری ایران ،اسلام آباد سے فارسی سہ ماہی **دانش** کا اجرا ہوا تو ڈاکٹر صاحب کو اعزازی مشیر اور مجھے اس کا مدیر مقرر کیا گیا۔اشاعت سے پہلے مقالات ایک نظر ڈاکٹر صاحب بھی دیکھتے اور ان پر کبھی کبھی قلم لگا دیتے تھے جسے میں غور سے دیکھتا کہ ڈاکٹر صاحب نے کس لفظ کو بدلا ہے۔مرکز تحقیقات فارسی یا رایزنی فرہنگی ایران میں کسی علمی تحریر یا دیباچے کو اردو یا انگریزی سے فارسی میں منتقل کرنا ہوتا تو ڈاکٹر صاحب کی خدمات لی جاتیں کیونکہ ان کی فارسی تحریر نہ صرف پختہ،سالم اور فصیح تھی بلکہ ایرانی محاورے کے مطابق ہوتی۔ڈاکٹر صاحب بولتے بھی ایرانی لہجے میں تھے۔بلکہ لہجے سے آگے کی ایک چیز،آواز کا اتار چڑھاو اور ایرانی ادا بھی ہے،یہ سب چیزیں ڈاکٹر صاحب کی مکالماتی فارسی میں موجود تھیں۔(۹)

ö ڈاکٹر صاحب ہم طالب علموں کو اپنی دو باتیں فخر سے بتایا کرتے اور ان کا فخر بجا تھا۔پہلی یہ کہ،تہران یونیورسٹی کی تاریخ میں اب تک صرف دو غیر ایرانی ایسے طالب علم ہیں جنھوں نے ''دتا'' یعنی ایرانیوں کے لیے مخصوص ڈاکٹریٹ لی ہے،ایک وہ اور دوسرے کلکتہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر عطا کریم برق (۱۹۲۲-۱۹۹۹ء)۔دوسری بات یہ کہ،برّصغیر کے وہ پہلے فارسی نویس مصنف ہیں جن کی کتاب **تذکرہ نویسی** کو ایران میں سال کی بہترین کتاب کا ایوارڈ ملا ہے۔ڈاکٹر صاحب کے محضر میں مجھ جیسے نوعمر فارسی آموز کو یہ باتیں مہمیز لگانے والی تھیں۔میں نے ۱۹۷۱ء میں ہی اپنے لیے فارسی کا راستہ چُن لیا تھا۔جب علمی زندگی میں فارسی کے حوالے سے اپنے لیے ترقی کی کوئی منزل طے کرنے کا وقت آیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب کی ذات کو اپنا تخیل اور محور بنایا۔یہ حقیقت ہے کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کی کامیابیوں کو مدّنظر رکھ کر انھی دو خواہشات کو اپنا علمی مقصد بنایا۔ایک تہران یونیورسٹی سے فارسی ادب میں ڈاکٹریٹ کی وہی ڈگری حاصل کرنا جو انھوں نے لی تھی اور دوسرا فارسی کے حوالے سے ایسی تحقیق کرنا جسے ایرانی بھی تسلیم کریں۔ڈاکٹر صاحب کی دعاوں سے یہ دونوں خواہشات اللہ تعالیٰ نے پوری کر دیں۔اگرچہ تہران یونیورسٹی سے ایرانیوں کے لیے مخصوص ڈگری لینے کی میری آرزو اُس

طرح پوری نہ ہوسکی لیکن غیر ملکیوں کو ڈاکٹریٹ کی جو ڈگری دی جاتی ہے وہ وہاں سے لے لی۔ دوسری خواہش بدرجۂ اتم پوری ہوئی اور ایران میں ۲۰۰۲ سے لے کر ۲۰۱۴ء تک میری پانچ کتابوں اور ایک مقالے کو ''بہترین'' کا ایوارڈ ملا۔ ۲۰۱۲ء میں جب میری تالیف **کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ**، تہران سے شائع ہوئی اور میں نے ڈاکٹر صاحب کو دکھائی تو وہ جبھی دعا گوئی کے لہجے میں اس کی پسندیدگی کا اظہار فرما چکے تھے۔ جب ۱۱ فروری ۲۰۱۴ء کو اس کتاب کو ایران میں ''بین الاقوامی کتاب سال'' ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا تو ڈاکٹر صاحب کینیڈا میں تھے۔ میں نے انھیں اس واقعہ کی تصویری خبر دی تو ۷ افروری کو ان کا تہنیت وتبریک سے لبریز ایمیل بزبان انگریزی ملا۔ جی چاہتا ہے ان کے اپنے الفاظ یہاں بھی محفوظ کردوں جو میرے لیے یادگار ہیں:

Best and Heartiest Congratulations on your Great Achievement, on behalf of myself and all members of my family to you and all members of your family. Thanks Allah, the Rahman and Rahim, You have made us all Pakistanis proud and happy. Long Live Pakistan-Iran Friendship. Thank you for sending the pictures of that Great Event in your life that you will always remember.You look so bright and impressive as you are in the pictures.

With best wishes and prayers for a successful and healthy life in future.

Ali Raza Naqvi

(تمہاری اس عظیم کامیابی پر اپنی اور اپنے گھر والوں کی طرف سے، تمہیں اور تمہارے سب گھر والوں کو بہترین اور دل کی گہرائیوں سے تبریکات۔ اللہ رحمان اور رحیم کا شکر کہ تم نے ہم سب پاکستانیوں کو سربلند اور شاد کیا۔ پاکستان ایران دوستی زندہ باد۔ اس بات پر بھی شکریہ کہ تم نے اپنی زندگی کے اس عظیم موقع کی، جسے تم ہمیشہ یاد رکھو گے، تصاویر مجھے بھیجیں۔ تم تصاویر میں بھی بہت نمایاں اور متاثر کن دکھائی دے رہے ہو۔ مستقبل میں کامیاب اور صحت مند زندگی کی خواہشات اور دعاوں کے ساتھ۔ علی رضا نقوی)

ö ۲۰۱۳ء میں مرکز تحقیقات فارسی کے ایک ٹائپ نویس مرتضی علی کا اچانک انتقال ہوگیا جسے ڈاکٹر صاحب اچھی طرح جانتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان دنوں کینیڈا میں تھے۔ میں نے انھیں مرتضی کی وفات کی خبر دی تو انھوں نے ایک طویل تعزیت نامہ مجھے بھیجا۔ اس میں ایک تجویز بھی تھی کہ پاکستان میں تمام ایرانی مراکز کو اپنے اس طرح کے ملازمین کے

لیے رفاہی فنڈ قائم کرنا چاہیے۔ جو پاکستانی اساتذہ یا فارسی کتب کے ناشرین ایرانی حکومت سے اپنی کتابوں پر نقد انعام پاتے ہیں وہ بھی اپنے انعام کا کچھ حصہ اس فنڈ میں دیں۔ اگر مرکز یا رایزنی یہ قدم اٹھائے تو ابھی سے وہ اپنی طرف سے مبلغ دس ہزار روپے کا عطیہ اس فنڈ میں جمع کرانے کے لیے تیار ہیں تاکہ مرتضی کی بیوہ اور بچوں کی بروقت امداد ہو سکے۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب کی یہ تجویز عمل پذیر نہ ہو سکی لیکن ان کی خیر خواہی بالکل عیاں تھی۔

ö ۹ مارچ ۲۰۱۴ء کو جب میں محکمۂ تعلیم عالیہ پنجاب کی طرف سے گورڈن کالج، راول پنڈی میں ملازمت سے سبک دوش ہوا تب بھی ڈاکٹر صاحب کینیڈا میں تھے۔ میں نے انھیں اپنی سبک دوشی کی اطلاع دی تو اللہ سبحانہ وتعالی کا شکر ادا کرتے ہوئے اسے میری باعزّت ریٹائرمنٹ قرار دیا اور میرے لیے آگے کامیاب، باآرام اور متحرّک زندگی کی دعا کی۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تینوں دعائیں مستجاب ہیں۔

ö ڈاکٹر صاحب کا معمول تھا کہ وہ عیدین کے موقع پر خود مجھے فون کرتے، عید کی مبارک باد کہتے، اہل خانہ کی خیریت دریافت کرتے۔ بچوں کا پوچھتے کہ کیا پڑھتے اور کیا کرتے ہیں، ان کی شادی ہوئی یا نہیں؟۔ مجھ سے میری علمی مشغولیت کا سوال کرتے۔ ایران اور ہندوستان میں مشترکہ دوستوں بالخصوص ڈاکٹر سید حسن عباس کی خیریت دریافت کرتے اور ڈھیر ساری نیک تمناوں اور دعاوں کے ساتھ فون بند کر دیتے۔ مجھے شرمندگی ہوتی کہ عید کے موقع پر مجھے فون کرنا چاہیے تھا لیکن وہ پہل کر جاتے۔ **الفضل للمتقدمین.**

ö جس زمانے میں ڈاکٹر صاحب تہران میں مقیم تھے، فرانسیسی کمپنی BIC کے بنائے ہوئے بال پوائنٹ استعمال کرتے تھے۔ یہ بال پوائنٹ کئی دہائیوں سے اب بھی ایران میں استعمال ہوتے چلے آ رہے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے پسندیدہ تھے۔ جب بعد کے زمانوں میں میرا ایران آنا جانا شروع ہوا تو ڈاکٹر صاحب فرمائش کر کے ایران سے اپنے لیے بِک کے بال پوائنٹ منگواتے۔ میں کئی اسفار میں ان کی یہ چھوٹی سی فرمائش پوری کر کے بہت بڑی خوشی حاصل کرتا رہا۔

ö مجھے تو یاد نہیں ہے لیکن میری اہلیہ نے یاد دلایا کہ بہت پہلے ایک بار ڈاکٹر صاحب ہمارے مکان (۶۹ ماڈل ٹاون، ہمک) پر تشریف لائے تھے اور بڑی شفقت اور اپنائیت سے گھوم پھر کر سارا گھر دیکھا۔ ویسے تو کئی بار ڈاکٹر صاحب کی اسلام آباد میں اقامت گاہ (مکان ۲۲۷، گلی ۳۲، سیکٹر جی/۸-۲) پر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا لیکن ایک بار ڈاکٹر صاحب نے میری اہل خانہ سمیت اپنے گھر پر دعوت کی تھی۔ وہ میری اہلیہ کو اپنی آبائی تہذیب کے مطابق ''دلھن'' کہہ کر مخاطب کرتے اور جب بھی فون پر ان کا پوچھنا ہوتا، یوں پوچھتے: ''دلھن کیسی ہیں؟''

ö ڈاکٹر صاحب کو اپنے پرانے احباب کا خیال رہتا تھا۔ ۱۹۹۳ء میں وہ شیخ مفید کانفرنس میں شرکت کے لیے

تہران گئے اور پورا ایک ہفتہ (۲۲ تا ۲۸ اپریل) وہاں قیام کیا۔ اتفاق سے ان دنوں میں بھی بسلسلۂ تعلیم تہران ہی میں مقیم تھا۔ میں یہ تمام وقت ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ ان کی خدمت میں رہا۔ انھوں نے اپنے چند پرانے دوستوں کا ذکر کیا کہ وہ ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ جو ہنوز زندہ تھے ان سے براہ راست مل لیا اور جو مرحوم ہو چکے تھے ان کے خاندان والوں سے ملے۔ یہ غالباً ۱۹۶۴ء کے بعد ڈاکٹر صاحب کی پرانے دوستوں سے پہلی تجدیدِ ملاقات تھی۔ چنانچہ میں نے انھیں ڈاکٹر علی نقی منزوی مرحوم، احمد منزوی مرحوم، ڈاکٹر حسن سادات ناصری مرحوم کے خاندان، ڈاکٹر حسین گونیلی مرحوم کے خاندان، رمضان صلاح الصاوی مرحوم (۱۰)، ڈاکٹر مظاہر مصفا اور ڈاکٹر مہدی محقق وغیرہ سے ملوایا۔ ہندوستان سے ڈاکٹر سید حسن عباس صاحب (موجودہ ڈائریکٹر رضا لائبریری رام پور) سے بھی ملوایا جو ان ایام میں تہران میں رہتے تھے اور میر غلام علی آزاد بلگرامی پر کام کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی کتاب **تذکرہ نویسی** سے بھرپور استفادہ کر چکے تھے اور ڈاکٹر صاحب کے غائبانہ مدّاح تھے۔

ڈاکٹر صاحب قیام تہران (۱۹۵۶-۱۹۶۳ء) کے دوران انگریزی اخبار ''تہران جرنل'' میں کام کر چکے تھے۔ ۱۹۹۳ء میں یہ اخبار ''تہران ٹائمز'' کے نام سے شائع ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنا پرانا دفتر دیکھنے کا شوق چرایا تو میں انھیں وہاں بھی لے گیا۔ اخبار کے ایڈیٹر کا دفتر چوتھی منزل پر تھا اتفاق سے ان دنوں اخبار کے ایڈیٹر اردو بولنے والے ایک پاکستانی تھے۔ ہم ہانپتے ہانپتے سیڑھیاں چڑھ کر چوتھی منزل پر ایڈیٹر صاحب تک پہنچے۔ بیٹھتے ہی ڈاکٹر صاحب نے ایڈیٹر صاحب کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا:

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے
زمین جس کی چہارم آسماں ہے

ایڈیٹر صاحب باذوق تھے، اس حسب حال شعر سے بہت محظوظ ہوئے۔

ö مرکز تحقیقات فارسی کے ایرانی مدیر قہرمان سلیمانی نے مرکز کی ادارت سنبھالتے ہی ڈاکٹر صاحب کی علمی خدمات کے اعتراف کے لیے ایک جشن نامہ تیار کر کے ان کی خدمت میں پیش کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی۔ میں نے اس کے لیے اپنے احباب سے مقالات جمع کیے اور ۱۵ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو ڈاکٹر صاحب کے علمی آثار کی فہرست مرتّب کرنے اور ان سے ذاتی حالات معلوم کرنے کے لیے ان کے گھر واقع اسلام آباد گیا۔ ان کی تمام تصانیف و تراجم کے سرورق کی تصاویر بنائیں اور تقریباً بیس منٹ کا ایک صوتی مصاحبہ محفوظ کیا۔ فروری ۲۰۱۴ء میں سلیمانی صاحب کے واپس ایران چلے جانے کے باعث جشن نامے کی ترتیب و اشاعت کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اس جشن نامے کی تیاری ڈاکٹر صاحب کے علم میں تھی لیکن انھوں نے کبھی اس کا تذکرہ نہ کیا اور نہ ہی مجھ سے پوچھا کہ اس کا انجام کیا ہوا؟ اس سے ڈاکٹر صاحب کا خود

نمائی سے گریز اور اخفا پسندی کا تاثر ملتا ہے۔

ö ڈاکٹر صاحب کے گھر پر میں نے ان کا ذاتی ذخیرۂ کتب دیکھ رکھا تھا جو اکثر و بیشتر ایرانی کتب پر مشتمل تھا۔ کتب کی کثرت اور جگہ کی قلت کے باعث ان کتابوں کی نگہداشت اچھی طرح نہیں ہو پا رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب خود بھی اس بارے میں تشویش رکھتے تھے۔ میں نے انھیں کتابیں کسی مناسب لائبریری کو عطیہ کر دینے کا مشورہ دیا اور ملک کے تین کتب خانوں کے نام تجویز کیے: ادارۂ تحقیقات اسلامی، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اور مسعود جھنڈیر لائبریری، سردار پور جھنڈیر۔ آخر انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی کتب تین حصوں میں تقسیم کریں گے۔ چنانچہ ۲۰۱۶ء میں ایک حصہ جو مذہبی کتب پر مشتمل تھا جامعہ صادق، اسلام آباد کو دیا، عربی ادب کی کتب ادارۂ تحقیقات اسلامی کو اور فارسی ادب پر کتب مرکز تحقیقات فارسی کو عطیہ کر دیں۔ (۱۱)

ö ۲۰۰۰ء سے ڈاکٹر صاحب نے اپنے بیٹوں سلمان رضا نقوی اور عدنان رضا نقوی کے پاس کینیڈا جانا اور وہاں رہنا شروع کیا۔ وہ قانون کے مطابق چند ماہ وہاں گذارتے اور واپس اسلام آباد آ جاتے اور پھر کینیڈا چلے جاتے۔ وہ مجموعی طور پر دس سال کینیڈا میں رہے۔ اس دوران وہ حسب ضرورت ایمیل کے ذریعے مجھ سے رابطہ رکھتے۔ ان کے تمام برقی خطوط میرے پاس محفوظ ہیں، جن سے ان کی شفقت، محبت اور دور دَستوں کو یاد رکھنے کا وصف عیاں ہے۔ آخری بار وہ ۶ ستمبر ۲۰۱۵ء کو کینیڈا سے واپس وطن آئے اور اپنے منجھلے بیٹے بریگیڈیئر عمران رضا نقوی کے پاس کھاریاں اور بعد میں مستقل لاہور میں رہنے لگے۔ اپنی پنشن لینے اور اسلام آباد والے گھر کی دیکھ ریکھ کے لیے وہ جب لاہور سے اسلام آباد کا قصد کرتے تو کبھی کبھار مجھے پیشگی اطلاع کر دیتے اور ان سے ملاقات ہو جاتی۔ انھوں نے آخری بار ۱۴۳۹ ہجری کا ماہ محرّم (اکتوبر ۲۰۱۷ء) شروع ہونے پر مجھے لاہور سے فون کیا کہ وہ اسلام آباد آ رہے ہیں اور عاشورا کے ایام میں اسلام آباد میں رہیں گے، میں ان سے مل لوں۔ وائے افسوس کہ میں نے اس ملاقات کو کسی اگلے وقت پر ٹال دیا جواب کبھی نہیں آئے گا۔

غنیمتی شمر ای شمع وصلِ پروانه

که این معامله تا صبحدم نخواهد ماند

(حافظ)

(اے شمع! پروانے کے وصل کو غنیمت جانو، یہ معاملہ صبح ہونے تک نہیں رہے گا۔)

öööö

☆ **مقالہ ہذا کی اس سے پہلے مجلّہ تحصیل، جلد ا، شمارہ ۲، جنوری۔ جون ۲۰۱۸ء، ص ۳۱۔۵۰، کراچی میں اشاعت ہو چکی ہے، موصوف مقالہ نگار نے میری دلی خواہش پر یہ مقالہ دوبارہ اشاعت کے لئے دبیر کو ارسال کیا میں ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ (مدیر)**

حواشی:

۱۔ڈاکٹر صاحب کی وفات کا واقعہ ان کے بیٹے برگیڈیئر عمران رضا نقوی صاحب نے مجھ سے اس طرح بیان کیا کہ وہ ۹ دسمبر کی عصر کو حسب معمول لاہور کینٹ کے گولف کلب میں سیر کو گئے تھے۔ عمران نقوی اور ان کے بچے بھی ان کے ساتھ تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو وہاں کا منظر اور سیر کے لیے وہ جگہ بے حد پسند تھی۔ اس روز چلتے چلتے وہ تھک کر اچانک ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور وہ کچھ بول بھی نہیں پا رہے تھے۔ کچھ دیر یہی کیفیت رہی اور وہیں بیٹھے بیٹھے ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ انھیں لاہور چھاؤنی کے کیولری گراونڈ کے شہدا قبرستان میں دفن کیا گیا۔

۲۔عبدالعلی ادیب برومند، **خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار (بخش کاشان)** تالیف میر تقی الدین کاشانی، تہران، میراث مکتوب، ۲۰۰۵ء، مقدمہ، ص ۲۷

۳۔سید باحیدر شہریار نقوی (۱۹۲۴-۱۹۸۰ء)، پاکستان سے اعلیٰ تعلیم کے لیے تہران یونیورسٹی گئے اور بعد میں وہیں کے ہو کر رہ گئے اور ایران ہی میں شادی اور انتقال کیا۔ پہلے تہران یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے رہے۔ پھر اصفہان یونیورسٹی میں شعبۂ اردو قائم کر کے وہاں تدریس کی۔ انھوں نے **فرہنگ اردو فارسی** بھی تالیف کی جو پاکستان (۱۹۹۱ء، ۱۹۹۳ء) اور ایران (۱۹۹۴ء) سے شائع ہو چکی ہے۔

۴۔آگے چل کر ڈاکٹر آفتاب اصغر (۱۹۴۰-۲۰۱۵ء) جب تہران یونیورسٹی گئے تو انھوں نے ۱۹۷۲ء میں برّعظیم میں فارسی تاریخ نویسی پر کام کیا۔ ان کا تھیسز **تاریخ نویسی فارسی در ہند و پاکستان** (لاہور، ۱۹۸۵ء) مغلیہ دور (بابر تا اورنگ زیب عالمگیر) میں فارسی تاریخ نویسی پر محیط ہے۔ اس طرح حافظ محمود شیرانی نے جن تین بڑے موضوعات پر کام کرنے کی نشان دہی کی تھی، تین پاکستانی طالب علموں نے ایران جا کر کم و بیش اس کو نبھا دیا۔ اگرچہ ان تینوں موضوعات پر تکمیلی نوعیت کے کام کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔ میں ڈاکٹر نقوی صاحب کو ان کی کتاب **تذکرہ نویسی** کا تکملہ لکھنے یا اس کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن لانے کے لیے گاہے بگاہے درخواست کرتا رہتا تھا، لیکن وہ یہ میدان چھوڑ چکے تھے اور اس طرف ملتفت نہ ہوئے۔ مشفق خواجہ مرحوم کو بھی ڈاکٹر صاحب سے یہی ''گلہ'' رہا کہ کاش ڈاکٹر صاحب فارسی ادب کے میدان میں ہی رہتے۔ ان کی کتاب **تذکرہ نویسی** کو شائع ہوئے اب نصف صدی سے زائد عرصہ گذر چکا ہے۔ اس دوران نہ صرف کئی نئے تذکرے (بطور مثال **حدیقۂ ہندی**) دستیاب ہوئے جو **تذکرہ نویسی** میں شامل نہیں ہیں بلکہ متعدد تذکروں کی تنقیدی اشاعتیں ہو چکی ہیں جن کی روشنی میں **تذکرہ نویسی** پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

۵۔فارسی شعرا کے تذکروں کی تاریخ پر کام میں ڈاکٹر علی رضا نقوی صاحب کو اولیّت حاصل ہے۔ بعد میں ایرانی محقق احمد گلچین معانی (۱۹۱۶-۲۰۰۰ء) کی **تاریخ تذکرہ ہای فارسی** دو جلدوں میں منظر عام پر آئی (تہران، ۱۹۶۹-۱۹۷۱ء) جو اپنے موضوع پر بہت عمدہ

کام ہے۔اس میں کہیں کہیں ڈاکٹر صاحب کے کام پر تعریض بھی کی گئی ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری (۱۹۲۶-۲۰۱۳ء) کی کتاب **اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری** (کراچی، ۱۹۹۸ء طبع دوم) بنیادی طور پر اردو شاعروں کے تذکروں سے متعلق ہے لیکن اس میں اردو شعرا کے وہ تذکرے بھی شامل ہوئے ہیں جو فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔

۶۔پاکستان کے چند اور محققین کو فارسی ادب پر مجموعی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایرانی حکومت کی طرف سے ''نشان سپاس'' ملتے رہے ہیں یا تہران یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈاکٹریٹ دی گئی یا دیگر اداروں (جیسے بنیاد موقوفات دکتر محمود افشار، جشنوارۂ بین المللی فارابی) کی طرف سے اعزازات دیے گئے۔ اس وقت مولوی محمد شفیع، پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی، ڈاکٹر غلام سرور، ڈاکٹر عبدالشکور احسن، ڈاکٹر ظہور الدین احمد اور ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے نام ذہن میں آرہے ہیں جن کی خدمات کا اعتراف ایران میں کیا گیا ہے۔ جہاں تک کتابی تحقیق پر سالانہ مقابلے میں بہترین ''عالمی کتابِ سال ایوارڈ'' کا تعلق ہے، ڈاکٹر علی رضا نقوی کے بعد دو پاکستانیوں کی تحقیقات کو یہ اعزاز مل چکے ہیں۔۲۰۱۳ میں ڈاکٹر انجم حمید کو ان کی کتاب **مخزن الاسرار نظامی گنجوی و استقبال آن در شبہ قارہ و ایران** (اسلام آباد، ۲۰۱۱ء) اور ۲۰۱۴ء میں راقم السطور (عارف نوشاہی) کو **کتابشناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ** (تہران ۲۰۱۲ء) پر۔دل چسپ نکتہ یہ ہے کہ ایران میں مسلسل تین سال ۲۰۱۲، ۲۰۱۳ اور ۲۰۱۴ء میں یہ اعزاز پاکستانیوں کو حاصل ہوتا رہا جس کی بازگشت پاکستانی ذرائع ابلاغ میں کم ہی سنائی دی!

۷۔کچھ اشاعتوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے: عارف نوشاہی، **کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ**، تہران، ۲۰۱۲ء، ج ۲، ص ۱۰۵۵-۵۴

۸۔عارف نوشاہی، **درس ہاے فارسی**، کلاس دوم (غیر مطبوعہ)، ص ۱۲۵، ۱۹۱، ۲۲۰

۹۔۱۹۷۱ء سے لے کر اب تک میں کئی پاکستانی، ہندوستانی اور بنگلہ دیشی اساتذہ سے مل چکا ہوں جو دانشگاہ تہران کے فارغ التحصیل ہیں لیکن ان کی تحریر اور تقریر میں ایرانی رنگ نہیں ہے۔ان کی تحریر کا اسلوب ہو یا تقریر کا لہجہ، خود ''سبک ہندی'' ہونے کا اعلان کر رہا ہوتا ہے۔اگر چہ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔لیکن یہاں بات ایرانی لہجے میں مہارت کی ہو رہی ہے۔میں نے شعبۂ فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے استاد سید وزیر الحسن عابدی (۱۹۱۴-۱۹۷۹ء) کو نہ دیکھا نہ سُنا، لیکن ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جدید لہجے کی ایرانی فارسی بہت عمدہ بولتے تھے۔ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر آفتاب اصغر میں بھی وہی خوبی پائی جاتی تھی۔انھیں تو کئی بار سنا ہے۔ایران سے فارغ التحصیل ہونے والی نئی پاکستانی نسل میں ڈاکٹر فائزہ زہرا میرزا (شعبۂ فارسی، جامعہ کراچی) عمدہ ایرانی لہجے کی فارسی بولتی ہیں۔ایرانی لہجے کے ساتھ ساتھ جدید اور رائج الوقت ایرانی محاورات کا استحضار اور استعمال اضافی خوبی ہے۔

۱۰۔رمضان صلاح الصاوی مصری شاعر اور دانشور تھے۔مصر کے صدر جمال عبدالناصر (عہد صدارت: ۱۹۵۴ -۱۹۷۰ء) کی پالیسیوں سے تنگ آکر مصر چھوڑ چکے تھے۔گذشتہ تیس چالیس سال سے تہران میں مقیم تھے۔عربی لہجے میں فارسی بولتے تھے۔علامہ اقبال کی شاعری کا عربی ترجمہ کیا تھا۔بہت اچھے عربی شاعر تھے۔کئی پرانے پاکستانی طالب علموں نے دانشگاہ تہران میں ان سے عربی پڑھی ہے۔ڈاکٹر علی رضا نقوی نے ان سے شیعہ فقہ پر کوئی عربی کتاب تلفظ کی درستی کے لیے زمانۂ طالب علمی میں پڑھی

تھی۔جس روز ہم ان سے ملنے گئے وہ شدید بیمار تھے اور ایک کھولی میں تک وتنہا پڑے ہوئے تھے۔صاف معلوم ہو رہا تھا کہ آفتاب لبِ بام آچکا ہے۔چنانچہ وہی ہوا،ڈیڑھ سال بعد ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۴ کو غربت در غربت،ارز روم ترکی میں انتقال کیا۔غریب الوطنی میں بھی اپنی سفید پوشی اور وضع داری کا بھرم قائم رکھے ہوئے تھے۔ڈاکٹر نقوی کو وقتِ رخصت عطر میں بھیگا روئی کا بُڑا (پنبہ) پیش کیا اور کہا مہمان کو تحفہ دینا چاہیے خواہ وہ خوشبو کی مہک ہو۔میں قیام تہران کے دوران جس ادارے (بنیاد دائرۃ المعارف اسلامی) میں جز وقتی کام کرتا تھا استاد صلاح الصاوی اس کے دیوار بہ دیوار ہمسائے میں واقع انجمن فلسفہ وحکمت اسلامی کے کوارٹرز میں رہتے تھے اور گاہ بگاہ ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔زندگی درویشانہ تھی لیکن علمی صلابت موجود تھی۔

۱۱۔کتب خانۂ گنج بخش مرکز تحقیقات فارسی میں مطبوعہ کتب کے اندراج کے مہتمم محمد صفدر صاحب نے بتایا کہ ۲۰۱۶ء میں ڈاکٹر صاحب نے ان کو اپنے گھر اسلام آباد میں بلوایا اور تمام کتب کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے کہا۔محمد صفدر الماری سے کتاب نکال کر ڈاکٹر صاحب کو دکھاتے اور ڈاکٹر صاحب کہتے کہ فلاں حصّے میں رکھ دو۔چنانچہ مرکز تحقیقات فارسی کے حصے میں کل ایک ہزار ایک سو چالیس [۱۱۴۰] نسخے (بشمول کتب و جرائد) آئے۔جامعہ صادق کے حصے میں آنے والی کتب اس سے کم اور ادارۂ تحقیقات اسلامی کے حصے میں آنے والی کتب اس سے بھی کم تر تھیں۔کتبِ حوالہ بشمول فرہنگیں اور وہ کام جو ابھی زیرِ تالیف تھے ان سے متعلق کتب ڈاکٹر صاحب نے اپنے گھر میں ہی رکھیں جو بقول محمد صفدر اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔یہ کتب تادمِ تحریر ان کے گھر میں ہی پڑی ہیں۔مرکز تحقیقات فارسی کے کتاب خانۂ گنج بخش میں ڈاکٹر صاحب کی عطیہ کردہ صرف ۳۷۸ کتب داخل کی گئیں (شمارۂ اندراج ۴۸۵۴۰-۴۸۹۱۸) باقی ۱۰۶۲ کتب اور جرائد چونکہ مکرّر تھے،انھیں تقسیم اور تبادلے کے لیے الگ رکھ دیا گیا ہے۔

مآخذ:

یہ مضمون اپنی ذاتی یادداشتوں،ذہنی محفوظات،ڈاکٹر صاحب کے بیٹے سلمان رضا نقوی سے برقی مراسلت اور ڈاکٹر صاحب کی تعزیتی تقریب منعقدہ ۲۶ دسمبر ۲۰۱۷ء باہتمام ادارۂ فروغ قومی زبان،اسلام آباد میں پڑھے گئے مقالات سے اخذ معلومات کے علاوہ مندرجہ ذیل تحریری مواد کی مدد سے تیار کیا گیا ہے:

عارف نوشاہی،''نقوی،علی رضا''،مشمولہ:**دانش نامۂ ادب فارسی (ادب فارسی در شبہ قارہ: ہند،پاکستان،بنگلادش)** بخش سوم: غ-ی،بہ سرپرستی حسن انوشہ،تہران،۱۳۸۰ شمسی [۲۰۰۱ء]

علی رضا نقوی،''پیشگفتار'' مشمولہ:**تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان**،تہران،مؤسسہ مطبوعاتی علمی،۱۹۶۴ء،صفحہ ۱۷-۱۹

علی رضا نقوی،"Preface to the second edition" مشمولہ:**فرہنگ جامع فارسی بہ انگلیسی واردو**،اسلام آباد،رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران،اشاعت دوم،۲۰۰۳ء

علی رضا نقوی،''**خلاصۂ شرح حال دکتر علی رضا نقوی**''،ڈاکٹر صاحب کا خود تیار کردہ کوائف نامہ بزبان فارسی (غیر مطبوعہ) جس میں بعض سنین غلط کتابت ہوئے ہیں اور قیاس سے ان کی درستی کی گئی ہے۔

نیز دیکھیے:

آئینۂ حقیقت، سید امان علی نقوی شجر، کراچی، ۲۰۰۰ء، (ڈاکٹر نقوی کے جدّ اعلیٰ شاہ ولایت مخدوم سید شرف الدین کے حالات کے لیے۔)

تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱ء، پانچویں جلد (فارسی ادب: سوم) ص ۶۷۷-۶۷۸

ثمرات القدس من شجرات الانس از میرزا لعل بیگ لعلی بدخشی (۹۶۸-۱۰۲۲ھ)، مقدمہ، تصحیح و تعلیقات سید کمال حاج سید جوادی، پژوہشگاہ علوم انسانی و مطالعات فرہنگی، تہران، ۱۹۹۷ء، ص ۶۷-۹۷، یہ غالباً بر عظیم کا پہلا فارسی ماٰخذ ہے جس میں ڈاکٹر علی رضا نقوی کے جدّ اعلیٰ شاہ ولایت مخدوم سید شرف الدین کے حالات درج ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں امروہہ اور شاہ ولایت کے اخلاف سے دیگر سادات کا تذکرہ بھی ہوا ہے۔

سبط حسن رضوی، ''فارسی در شبہ قارہ پس از سال ۱۳۲۶ خ (سال تجزیہ)''، ترجمۂ مریم ناطق شریف، **نامۂ پارسی**، تہران، سال پنجم، شمارۂ ۳، پاییز ۱۳۷۹ش [۲۰۰۰ء] ص ۱۱۶

فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ از محمد صدیق شبلی و محمد ریاض، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۴ء، ص ۲۹۹

فارسی پاکستانی و مطالب پاکستان شناسی از محمد حسین تسبیحی، راول پنڈی، مصنف، ۱۹۷۴-۱۹۷۷ء، ج ۱، ص ۱۵۷-۱۵۸؛ ج ۲، ص ۳۶۷-۳۶۵

گنج شایگان از محمد مہدی ناصح، تہران، دبیرخانۂ شورای گسترش زبان و ادبیات فارسی، ۱۳۷۴ش [۱۹۹۵ء] ص ۷۱-۷۲

ماہ نامہ **مجلّہ**، کراچی، انجمن سادات امروہہ، مارچ-اپریل ۱۹۶۶ء، جلد ۱، شمارہ ۹، ص ۲۲-۲۳

مجموعۂ سخنرانی ہای نخستین سمینار پیوستگی ہای فرہنگی ایران و شبہ قارہ، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ج ۱، ص ۳۵۷-۳۵۶

https://en.wikipedia.org/wiki/Amrohi_Syed

☆☆☆

پروفیسر طاہرہ وحید عباسی
صدر شعبہ فارسی
برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال

انسان دوست۔بسمل سعیدی

کسی ادیب، فن کار یا شاعر پر کچھ تحریر کرنے سے قبل از حد ضروری ہے کہ پہلے اس کے پس منظر پر بھی نظر ثانی کی جائے اس لئے بسمل سعیدی کے متعلق کچھ قلم بند کروں تو پہلے جس ریاست سے انکا تعلق تھا اسکی تاریخ پر اور انکے معزز خانوادوں کا ذکر کروں میری مراد ٹونک سے ہے۔

ٹونک کی دوسوسالہ تاریخ کا اگر اجمالی جائزہ لیا جائے تو جناب مولوی عمران صاحب، صاحب زادہ ادریس علی خان، صاحب زادہ شوکت علی خان، مولوی سید احمد علی سیماب اور مولوی سید سعید احمد کا شمار ٹونک کے نامی گرامی خاندانوں میں ہوتا ہے۔

سید سعید احمد کا خاندان دو بیٹوں اور ایک بیٹی پر مشتمل ہے بڑے صاحبزادے سید یحییٰ جو ایک مشہور و معروف طبیب تھے دوسری بیٹی صاحبزادی مریم جو خود شاعرہ تھیں اور رازؔ تخلص اختیار کرتی تھیں انکا یہ شعر بھی بہت شہور ہوا۔

رازؔ کو بھلا دیجئے خاک میں مل گئی وہ خانہ خراب

اور اسکے بعد چھوٹے بیٹے سید عیسیٰ جو بسمل سعیدی کے نام سے شعر و ادب کی دنیا میں روشن و تابناک ستارہ بن کر مشہور ہوئے سراپائے محبت و ایثار بسمل سعیدی کی پیدائش ٹونک میں ۱۹۰۱ء میں ہوئی انکی پرورش اور ابتدائی تعلیم اپنے دادا سید احمد علی سیماب اور والد سید سعید احمد کے زیر نگرانی میں ہوئی اور کچھ وقت تعلیم کے سلسلہ میں رامپور میں گزرا۔علم و ادب کے ماحول میں پروردہ بسمل سعیدی کی ذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ انکی فکر و آگہی کو بسمل کافی جلا ملی خیالات کی گہرائی و گیرائی میں روز بروز ترقی ہوتی گئی شعر گوئی کا شوق ورثے میں ملا تھا جسکی بنا پر اس فن میں عروج کمال حاصل کیا۔بسمل صاحب کے چار مجموعۂ کلام شائع ہوئے۔

(۱) نشاطِ غم (۲) کیف الم (۳) مشاہدات (۴) اوراقِ زندگی

چاروں مجموعۂ کلام مختفم شعری اصناف پر مشتمل ہیں ان میں انکی فارسی غزلیات بھی شامل ہیں انکے یہاں الفاظ کا جو بیش بہا ذخیرہ ہے اسکے ذریعہ وہ اپنے احساسات و جذبات، محبت و مسرت حزن و ملال، غم و الم کی کیفیت اپنے نظریہ فکر کو بہت وسعہ اور متنوع انداز میں پیش کیا ہے۔زندگی کے نشیب و فراز کو پیش کرنے کا وہ سلیقہ کہ طبیعت حیران ہو جائے۔

اور قاری مسحور ہو جاتا ہے الفاظ کا جادو اپنے دائرے میں قید کر لیتا ہے۔

محبت معاذ اللہ محبت دل نہ پھٹ جائے
اگر محسوس ہو اتنی جتنی کہ دل میں ہوتی ہے

بسمل صاحب کی شاعری میں زندگی کے نشیب و فراز میں محبت کا وہ عکس نظر آتا ہے جہاں خود اپنا احساس وجود معدوم نظر آنے کے ساتھ ساتھ در و دیوار و سائبان کا احساس بھی ماند پڑ جاتا ہے جسکو انھوں نے شعر کے قالب میں اسطرح ڈھالا ہے۔

میں نے دیکھا ہے ان کی محفل میں
کچھ زمان و مکان نہیں ہوتا
عشق رکھتا ہے جس جگہ دل کو
میں بھی اکثر وہاں نہیں ہوتا

بسمل صاحب نے اسکو غم کا شکوہ نہیں کیا اور نہ اسکو اپنے مدِّ مقابل سمجھ کر اس سے انحراف کیا بلکہ اسکو زندگی کی اقدار اور برتری کی بنیاد سمجھتے تھے لوگوں اور وقت کی ستم ظریفوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی غیروں سے شکوہ کیا کرتے جبکہ خود اپنوں نے زخم پر نمک پاشی کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور اس کارگزاریوں میں پیش پیش رہے اسکے باوجود اپنے مثبت اندازِ بیان اور فکر کو کسی منفی اور غلط سوچ کو اپنی تحریروں اور قلم کی روانی میں حائل نہیں ہونے دیا۔

کبھی تو چھیڑا کر مضرابِ غم سے سازِ ہستی کو
نشاطِ زندگی ہے دل اگر بیدار ہو جائے
شاعر جذبات ہوں جب و جد میں آتا ہون
روح کو بیدار کرتا ہوں دل کو گرماتا ہوں
جب زمانہ میں مبتا کی کمی پاتا ہوں
ساری دنیا میں محبت بن کر چھا جاتا ہوں

بسمل صاحب نے اپنی شاعری میں مذہبی اور سیاسی ہستیوں سے متاثر ہو کر انکو بھی اپنی گفتگو کا موضوع بنایا اور شعری جامہ پہنایا واعظ و نصیحت سے انکو کوئی تعلق نہیں تھا لیکن بے عمل زندگی، منافقت و تنگ نظری سے وہ بہت دل برداشتہ ہوتے تھے ان خیالات کو اسطرح قلم بند کرتے ہیں۔

☆مرشد نے دعا جو بہر سائل فرمائی

نخوت وہ دعا میں اپنی شامل فرمائی
اللہ نے جبریل سے گھبرا کے کہا
دیکھو تو یہ وحی کس نے نازل فرمائی
☆معاذ اللہ شیخ و برہمن کا ظاہر و باطن
گناہوں نے پہن رکھا ہے جامہ پارسائی کا

بسمل صاحب کی شاعری کو ہمہ صفات کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ انکی شاعری میں رومانیت تو ہے ہی لیکن عشقِ حقیقی سے بھی بھرپور ہے الفاظ کے پیراہن میں انھوں نے اس انداز کو اسقدر دلکش انداز میں پیش کیا ہے عشق الٰہی سے لبریز اور اسکی رحمتوں سے پراُمید ہوکر کچھ اسطرح رقم طراز ہیں۔

☆بنا ہے آج محشر میں جو دریا رحمت حق کا
کل آنسو گرا تھا میری چشم تر سے داماں میں
☆وہ جوارضِ پاک حجاز ہے مری آرزو ہے کہ بسمل اب
ہو نصیب سجدۂ آخری اسی خاکِ عرش وقار پر

بسمل صاحب کی شاعری میں انسان اور انسانیت کے لئے ایک درد پنہاں ہے انسانیت کو مجروح ہوتے دیکھتے تو انکی روح تک زخمی ہوتی تھی اور اس درد کو انھوں نے اسطرح بیان بھی کیا ہے۔

ہوس کی دنیا میں رہنے والوں کو محبت سکھا رہا ہوں
جہاں یہ دامن بچھے ہوئے ہیں وہاں پر آنکھیں بچھا رہا ہوں
سرودِ غم پر بھی زندگی میں طرب کے دھارے بہا رہا ہوں
میں انکے سازِ جفا پر اپنی وفا کے نغمے سنا رہا ہوں
الٰہی دنیا میں اور کچھ دن ابھی قیامت نہ آنے پائے
ترے بنائے ہوئے بشر کو ابھی میں انسان بنا رہا ہوں

بسمل سعیدی طبعاً بہت محتاط اور خوددار طبیعت کے مالک تھے گفتگو میں بھی بہت احتیاط سے کام لینے کے ساتھ حلقہ احباب بھی محدود تھا لیکن اسکے باوجود اپنے دوست کے اسرار پر مخمور سعیدی کو انھوں نے شاگردی کا درجہ دیا اور اسی اعتبار سے مخمور اپنے نام سے سعیدی مسنوب کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور کلیات بسمل سعیدی مرتب کرنے کا کارہائے نمایاں انجام بھی دیا۔ اپنے استاد ذی کے لئے اسطرح رقم طراز ہیں۔

'' بسمل سعیدی کے ذخیرۂ الفاظ میں جو کلیدی اہمیت کی حامل ہیں وہ محبت اور غم ہیں جو انکے ہاں باہم مترادف بھی ہیں یہ انکی پوری شاعری میں بالخصوص غزل میں جہاں جہاں آئے ہیں انھوں نے ایک ایسی معنوی فضا تخلیق کی ہے جس سے آگاہی بسمل صاحب کی شاعرانہ شخصیت سے شناشائی کے مترادف ہے'' (کلیات بسمل سعیدی)

☆جس شخص کی بسمل سے ملاقات ہوئی ہے
وہ شخص محبت کے پیمرل سے ملا ہے

☆مشکلیں میری محبت کی الہیٰ تو بہ
ان کے کوچے سے جنازہ بھی مشکل سے اٹھا

ایک اور جگہ انکے اندازِ بیاں کو ملاحظہ کیجئے

کبھی صبح مسرت میں کبھی شام مصیبت میں
سمائے جارہے ہیں وہ میرے ذوقِ محبت میں
یہی ہے جزوِ اعظم تیرے اجزائے محبت میں
تمنا کی حفاظت کر محبت کی حفاظت میں

محبوب کی بےالتفانی اس کی جدائی کے احساس تاثر کو یوں بیان کرتے ہیں۔

کسی کے دل کی دھڑکن تک کوئی محسوس کرتا ہے
محبت میں یہ اک عالم بھی ہوتا ہے جدائی کا

بسمل صاحب کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں سے قلبی لگاؤ و جذباتی تعلق تھا فارسی زبان میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اس سلسلہ میں بھوپال شہر کے نامور اعلیٰ پایۂ کے شاعر اختر سعید صاحب کا قول تھا اچھا شاعر ہونے کے لئے لازمی ہے کہ اسکے اردو کلام کی پانچ چھ غزل میں ایک فارسی کی بھی غزل شامل ہے چند اشعار بطور مثال پیش ہیں۔بسمل سعیدی کے فارسی کلام کے چند اشعار بطورِ نمونہ درج ہیں:

رخ و زلفِ بارِ دلأ رم دارم
عجیب صبح دارم عجیب شام دارم
اگر عشق تو دشمن ننگ و نام است
نہ من ننگ دارم نہ من نام دارم

اگر صدہزار انقلاب است و عالم
ہمیں صبح دارم ہمیں شام دارم

محبوب سے فرقت و جدائی، میں اسکے لئے بہار بھی خزاں کی مانند ہے اور ہر شے بے معنی نظر آتی ہے اور اس احساس کو اسطرح بیان کرتے ہیں:

تازہ بہارِ چمنم آرزو ست
رنگ کہن در و طنم آرزوست
بسترِ گل راچہ کنم اے بہار
خواب بہ آن گلبدنم آرزوست
کاش بود مدفنِ من کو ئے دوست
خاکِ درِ او کفنم آرزو ست

بسمل سعیدی ایک دردمند دل، سوز و گدار سے لبریز خوش اخلاق اور صلہ رحیمی کے پاسدار تھے۔ محبت کا جو پیغام الگ الگ پیرایہ اور مختلف عنوان سے دیا ہے وہ درحقیقت انکو محبت کا پیامبر، محبت کا مسیحا، دردمند دل کی صدا اور اخلاق کا پیکر جس نام سے بھی موسوم کیا جائے وہ انکی شخصیت کی صداقت کا مظہر ہے۔

ابھی تو آیا ہی تھا وہاں سے کبھی نہ جانے کا عہد کر کے
مگر محبت ز ہے محبت ابھی و ہیں سے پھر آ رہا ہوں

۲۶/اگست ۱۹۴۶ء کو اس محبت کے مسیحا پیامبر محبت نے دہلی میں اپنی تمام کرب و اذیت کو خیر باد کیا اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

☆☆☆

پروفیسر رضوان اللہ آروی
پٹنہ، بہار

بہار کے فارسی اساتذہ سیریز۔۳

فارسی ادب اور اسلامی تاریخ کا حسین امتزاج :ڈاکٹر خواجہ افضل امام

چکیدہ : بہار کے فارسی اساتذہ میں خواجہ افضل امام صاحب پر بہت کم لکھا گیا اور ان کے علمی و تحقیقی کارناموں کو بھی مورد توجہ قرار نہیں دیا گیا۔ حالانکہ فارسی اساتذہ میں ان کا تخصص و امتیاز یہ ہے کہ وہ فارسی ادب کی تاریخ کے ساتھ اسلامی تاریخ پر بھی عبور رکھتے تھے اور ان کی تدریس کا موضوع بھی یہی تھا۔ لیکن ان کی علمی شخصیت کا یہ پہلو بھی سامنے نہ آسکا۔ خواجہ صاحب، فارسی ادب کے اُن اساتذہ میں تھے جو اردو، فارسی زبانوں کے ساتھ انگریزی پر بھی یکساں عبور رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے سلیم تہرانی پر اپنا تحقیقی مقالہ (برائے پی۔ایچ۔ڈی) انگریزی میں ہی لکھا تھا۔ فارسی ادب کے اس ممتاز استاد اور محقق کے علمی و ادبی کارناموں کا تعارف اس مقالے کا مقصد و مدعا ہے۔

کلیدی الفاظ :خواجہ افضل امام۔ سلیم تہرانی۔ خلافت عباسیہ۔ فائز پھلواروی۔ زیب النسا مخفی

میں نے پٹنہ میں دو اساتذہ کو جب بھی دیکھا، سائیکل کے ساتھ دیکھا۔ پروفیسر سید حسن عسکری اور ڈاکٹر خواجہ افضل امام۔ لیکن دونوں میں فرق یہ تھا کہ حسن عسکری صاحب سائیکل پر سوار کبھی نظر نہیں آئے۔ وہ ہمیشہ اپنی سائیکل کے ساتھ چلتے نظر آئے۔ ان کا ہاتھ سائیکل کے ہینڈل پر ضرور ہوتا تھا لیکن یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ سائیکل کو سنبھالے ہوئے ہیں یا سائیکل انہیں سنبھالے ہوئے ہے۔ دوسری طرف خواجہ صاحب نے سائیکل کو ہمیشہ اپنے زانوؤں کے نیچے دبا کر رکھا۔ سائیکل ان کی ہمسفر ضرور رہی لیکن ان کے ہمقدم ہونے کی گستاخی کبھی نہ کرسکی۔ ہم پٹنہ کالج کے شعبۂ فارسی میں ان کے کلاس کے انتظار میں بیٹھے ہوتے اور ٹھیک دس بجے سائیکل کی گھنٹیوں کی آواز ان کی آمد کا پتہ دیتی۔ گھڑی کی سوئیوں اور سائیکل کی گھنٹیوں میں ایسا غضب کا تال میل، خواجہ صاحب کے بعد پھر میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

صاحبو! یہ قصّہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا۔ حیرت بھی اور حسرت بھی، ۱۹۸۲ء کا قصّہ یوں لگ رہا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ پٹنہ کالج بھی وہی ہے، شعبۂ فارسی بھی وہی ہے اور اس کی دیواروں کا بوسہ لیتی ہوئی گنگا کی لہریں بھی وہی

ہیں۔بس نہیں ہیں تو خواجہ صاحب، ان کی سائیکل اور خلافت عباسیہ کی تاریخ۔ جی ہاں خواجہ صاحب جب بھی آئے ،اپنی سائیکل کے کیریئر میں خلافت عباسیہ کی تاریخ کو دبا کر لائے۔کلاس میں داخل ہونے کے بعد،ان کے ہاتھوں میں تاریخ کے بکھرے ہوئے یہ اوراق ان کے لکچر میں حیرت انگیز طور پر پورے نظم وترتیب کے ساتھ سمٹ آتے۔ایک خشک اور غیر رومانی تاریخ ان کے درس کا بھی حصّہ تھی اور ان کے وجود کا بھی حصّہ تھی۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ خواجہ صاحب کو تاریخ سے خصوصی دلچسپی تھی اور ان کی اسی دلچسپی کی بناء پر ان کے استادمحترم اور ممتاز مؤرخ پروفیسر حسن عسکری انہیں بیحد عزیز رکھتے تھے۔چنانچہ ان کے تین نمایاں شاگردوں میں ڈاکٹر قیام الدّین احمد اور پروفیسر وید پرکاش کے علاوہ خواجہ صاحب کا بھی نام آتا ہے۔

فارسی کی ادبی تاریخ کے ساتھ اسلامی تاریخ بھی ہمارے نصاب کا حصّہ تھی۔خواجہ صاحب نے ادبی تاریخ پر اسلامی تاریخ کو کیوں ترجیح دی، اس کا ذکر آگے آئے گا،لیکن ان کے انداز تدریس سے صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ رزم پڑھانے کے لئے ہی بنے ہیں۔ پاٹ دار آواز، کسرتی جسم، کردار میں صلابت، انداز میں پختگی اور ان سب پر مستزاد ان کی پہلوانی شخصیت۔خواجہ صاحب ہمارے اساتذہ میں واحد ایسے شخص تھے جو ملازمت میں آنے سے قبل باضابطہ کشتیاں لڑتے اور ورزش کرتے تھے۔اور نئی نسل کو بھی وہ ان مجاہدانہ صفات سے متّصف دیکھنا چاہتے تھے۔چنانچہ انہوں نے اپنے بچوں کے لئے ورزش کرنے کا سامان بھی خرید رکھا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ ادب، رومان اور بزم کی طرف آتے بھی تو اسے بھی رزم بنا کر رکھ دیتے۔

دو سال تک ہم اُن سے خلافت عباسیہ کی تاریخ پڑھتے رہے جس میں رومانیت نام کو نہیں تھی۔نہ غم فراق کے قصّے اور نہ ہی نشاط وصل کا ذکر۔نصابی ضرورتوں کے تحت ہم نوٹس بھی لیتے رہے اور اس تاریخ میں دلچسپی کا اظہار بھی کرتے رہے۔خواجہ صاحب بھی شفقت فرماتے رہے، اس تاریخ کے ہر گوشہ و کنار سے ہمیں آشنا کرتے رہے اور ہم لوگوں کی بظاہر دلچسپی کو دیکھ کر خوش بھی ہوتے رہے۔لیکن یہ سامنے کا سچ تھا۔اندر کا سچ تقریباً بیس سال بعد اُس وقت سامنے آیا جب ۲۰۰۱ء میں ان کی کتاب ''مضامین افضل'' چھپ کر منظر عام پر آئی۔اس کے پیش لفظ میں ان کا وہ درد چھلک کر سامنے آیا جو ہم لوگوں کی ظاہر بیں نگاہ نہ تو دیکھ سکی اور نہ دیکھ سکتی تھی۔انہوں نے لکھا :

''تیس، بتیس برس پٹنہ کالج میں درس وتدریس کی زندگی میں ہم نے محسوس کیا کہ ایم۔ اے۔فارسی کے اکثر لڑکے سیرت نبوی، حیات خلفا اور تاریخ اسلام سے نا آشنا ہوتے ہیں۔ حالات کا کتنا رونا رویا جائے ؎

اندکے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است '' (۱)

خواجہ افضل امام ۳ ستمبر ۱۹۲۴ء میں پھلواری شریف (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ان کی ابتدائی تعلیم ان کے پھوپھا مولانا تمنا عمادی کی سرپرستی ونگرانی میں ہوئی جنہیں خانقاہ عمادیہ پٹنہ سیٹی کے صاحب سجادہ مولانا شاہ رشید الحق صاحبؒ نے 'حسان الہند' کا خطاب عطا فرمایا تھا۔چنانچہ خواجہ صاحب نے اپنی کتاب 'مضامین افضل' کا انتساب بھی انہی کے نام کیا ہے۔

''میں اس حقیر تصنیف کو اپنے قابل صد احترام پھوپھا حضرت حسان الہند تمنا عمادی مجیبی پھلواروی کے نام سے منسوب کرتا ہوں جن کی گود میں میں نے پرورش پائی اور جن کے بے شمار احسانات مجھ پر ہیں۔''(۲)

خواجہ صاحب کی تعلیمی راہ آسان نہیں رہی۔معاشی مجبوریوں کے تحت ان کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہوتا رہا۔کسی طرح کھگول ریلوے اسکول (داناپور) سے ہائی اسکول کا امتحان پاس تو کرلیا لیکن اس کے بعد تعلیم بھی چھوٹا اور پٹنہ بھی۔وہ کلکتہ کو سدھارے اور وہاں چھری کانٹے کی تجارت میں مشغول ہوگئے اور اسی کے ساتھ ملازمت کے حصول کی کوشش بھی کرتے رہے۔لیکن اعلا تعلیم نہ ہونے کے سبب بہتر ملازمت کا حصول مشکل تھا۔ہر جگہ سے نفی میں جواب ملا تو ان کے ایک عزیز ایس۔جی۔معین الدّین، جو اُس زمانے میں ڈھاکہ میں ڈپٹی مجسٹریٹ ہوا کرتے تھے، نے طنز کرتے ہوئے کہا کہ ملازمت چاہئے تو پہلے ڈگری حاصل کرو۔یہ بات خواجہ صاحب کے دل کو لگ گئی۔انہوں نے اپنی دکان بڑھائی، پٹنہ واپس آئے اور تعلیم کے اُس سرا کو پکڑنے میں کامیاب ہوگئے جو میٹرک کے بعد اُن سے چھوٹ گیا تھا۔پٹنہ کے معروف بی۔این۔کالج میں ۱۹۴۳ء میں اُن کا داخلہ ہوا جہاں سے انہوں نے انٹر اور گریجویشن کے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔اس کے بعد پٹنہ یونیورسٹی سے فارسی میں ماسٹرس کیا اور ۱۹۵۹ء میں سلیم تہرانی کی حیات وخدمات پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔اس تحقیقی مقالے کے نگراں پروفیسر سید حسن تھے اور ممتحن میں ڈاکٹر اے۔جے۔آربری ،کیمبرج یونیورسٹی،لندن اور پروفیسر اسحٰق صاحب،کلکتہ یونیورسٹی شامل تھے۔ درس وتدریس سے وابستہ ہونے سے قبل پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں مہتمم کی حیثیت سے انہوں نے خدمات انجام دیں۔۱۹۶۴ء میں فارسی لکچرر کی حیثیت سے ان کا باضابطہ تقرر،بی۔این۔کالج کے اُسی شعبۂ فارسی میں ہوا جہاں وہ کبھی طالب علم ہوا کرتے تھے۔ ۱۹۷۲ء میں ان کا تبادلہ پٹنہ کالج میں ہوگیا جہاں ان کے استاد محترم اور اُس وقت کے صدر شعبہ سید حسن صاحب نے انہیں ''اسلامک ہسٹری'' پڑھانے کی ذمہ داری دی۔اس ذمہ داری کو انہوں نے آخر وقت تک بحسن وخوبی انجام دیا۔پٹنہ کالج سے وہ صدر شعبۂ فارسی کے عہدہ سے ۱۹۹۰ء میں سبکدوش ہوئے۔جیسا کہ عرض کیا گیا،خواجہ صاحب کی پیدائش تصوف کے ایک اہم مرکز پھلواری شریف میں ہوئی تھی۔خواجہ صاحب کے مزاج میں مذہب اور تصوف کا امتزاج اسی مقدس سر

زمین سے وابستگی کا نتیجہ ہے۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے خواجہ صاحب کے اس مزاج کی طرف یوں اشارہ کیا ہے :

''خواجہ افضل امام مذہبی ذہن کے مالک تھے۔صوم وصلوٰۃ کی پابندی،خوش اخلاقی اور مہمان نوازی ان کی شخصیت کے نمایاں اجزاء تھے''(۳)

خواجہ صاحب نے اپنے دور صدارت میں شعبۂ فارسی پٹنہ کالج کے زیر اہتمام چار روزہ سیمینار کا انعقاد کیا تھا جس میں ملک و بیرون ملک سے ممتاز استادان فارسی مثلاً امیر حسن عابدی صاحب اور عطا کریم برق صاحب وغیرہ نے شرکت کی تھی۔ یہ سیمینار نہ صرف شعبۂ فارسی یا پٹنہ کالج بلکہ پٹنہ یونیورسٹی کی تاریخ میں ایک یادگار سیمینار ثابت ہوا۔خواجہ صاحب ۱۹۹۷ء میں حج کی سعادت سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔ان کا انتقال ۱۲/اکتوبر ۲۰۰۶ء میں پٹنہ میں ہوا۔

خواجہ صاحب کی تصنیفات کے ذیل میں نذیر الحق فائز پھلواروی کے **دیوان فارسی** کی تدوین واشاعت ان کا ایک اہم علمی کارنامہ ہے۔تمنا عمادیؒ کے والد محترم فائز پھلواروی کے دیوان کے قلمی نسخے انہیں پھلواری شریف کے کتبخانے میں ہی دستیاب ہوئے جسے انہوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے ترتیب وتدوین کے بعد ۱۹۶۴ء میں پٹنہ سے شائع کیا ۔کلام کی ندرت کے اعتبار سے اس دیوان کی اہمیت اور قدر و قیمت اپنی جگہ مسلّم ہے ہی لیکن اس کی افادیت میں خواجہ صاحب کے مبسوط اور تحقیقی دیباچے کی وجہ سے بہت اضافہ ہوگیا ہے۔تقریباً ۸۰/صفحات پر مشتمل اس دیباچے میں فائز پھلواروی کے حالات زندگی، خاندانی پس منظر،اور تعلیم وتربیت کے ساتھ اُس دور کا پورا شعری منظر نامہ سامنے آ گیا ہے۔ خواجہ صاحب نے اتنے پر ہی اکتفا نہیں کیا۔انہوں نے فائز پھلواروی کے معاصرین پر بھی جامع گفتگو کی ہے اور ان کی عرفانی شاعری کے حوالے سے اُس دور کے شاعرانہ امتیازات کو واضح کیا ہے۔ فائزؔ کے معاصرین میں حضرت بدرؔ پھلواروی،حضرت نصرؔ پھلواروی،حضرت وصّیؔ،امین احمد ثباتؔ،فرزند علی صوفی منیری، وزیر علی عبرتی،صفیر بلگرامی،شاہ اکبر داناپوری،خواجہ فخر الدّین سخنؔ دہلوی،نواب امداد امام اثر اور احمد کبیر حیرتؔ پھلواروی جیسے نابغۂ روزگار اور اساتذۂ فن شامل ہیں۔فائزؔ کے موضوعات سخن پر گفتگو کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے ان کی مذہبی رواداری اور فقر وتوکل جیسے موضوعات کی نشاندہی کی ہے جو،ظاہر ہے فائزؔ کے صوفیانہ خانوادے کا فکری ورثہ تھا ۔

ہمچو نقش پا براہ فقر مسکن کردہ ام دیدۂ بینا باصل خویش روشن کردہ ام

فکر کے ساتھ فنی لحاظ سے بھی خواجہ صاحب نے کلام فائز کا جائزہ لیا ہے اور صنائع و بدائع کے ساتھ اُن تمام مصطلحات کے حوالے سے دیوان فائزؔ کے امتیازات کو نمایاں کیا ہے جس کا استعمال بڑی خوبی اور قادر الکلامی سے انہوں نے کیا ہے ۔ایک طرف دیوان فائزؔ کی تدوین سے کلام فائزؔ محفوظ ہوگیا ہے تو دوسری طرف خواجہ صاحب کے تنقیدی و تجزیاتی دیباچے سے اُس دور کا پورا شعری ادب بھی سامنے آ گیا ہے۔

'مضامین افضل' خواجہ افضل امام صاحب کے ۱۵ مضامین کا مجموعہ ہے۔علمی،ادبی،تحقیقی اوراصلاحی نوعیت کے یہ مضامین خواجہ صاحب کی وسعت نگاہ کے ساتھ متنوع موضوعات پران کی قدرت کا بھی پتہ دیتے ہیں۔یہ مجموعہ پٹنہ سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا جس کا انتساب انہوں نے اپنے پھوپھا علامہ تمنا عمادی مجیبی پھلواروئیؒ کے نام کیا ہے۔جن کی شخصیت اورعلمی کارناموں پرخواجہ صاحب کا ایک مفصّل مضمون اس کتاب کی زینت ہے۔اس مضمون کا اختصاص یہ ہے کہ اس میں چشم دید واقعات کے علاوہ ایسی زبانی روایتیں بھی شامل ہیں جو علامہ تمنا کے تعلق سے کسی اور کتاب میں نہیں ملتیں۔علامہ تمنا عمادی کی کتابوں 'قصیدۃ الزہرا'اور'ایضاح سخن' کے تصنیفی پس منظر کا بیان کرتے ہوئے خواجہ افضل امام نے لکھا ہے کہ کسی نے ان کے دوشعر کے جواب میں دس شعراسی ردیف وقافیہ میں شائع کردیئے تھے۔علامہ تمنا نے محض دو ماہ کی مختصر مدت میں اسی ردیف وقافیہ میں آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ایک کتاب 'قصیدۃ الزہرا' لکھ ڈالی۔یہ علامہ کی قادرالکلامی کا بین ثبوت ہے جس کا اعتراف علامہ نیاز فتحپوری اورحضرت جوش ملیح آبادی جیسے ماہرین فن نے بھی کیا ہے۔ڈھاکہ مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران خواجہ افضل امام صاحب بھی وہیں مقیم تھے۔انہوں نے علامہ تمنا عمادی کے ساتھ بابائے اردومولوی عبدالحق،جگر مرادآبادی اورعندلیب شادانی وغیرہ کی نجی محفلوں اورعلمی نشستوں کی جو چشم دید روداد بیان کی ہے ،اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ علامہ تمنا کے بیحد معترف اورمدّاح تھے۔

فارسی ادبیات کے حوالے سے''زیب النساء اور دیوان مخفی'اس مجموعہ کا ایک اہم مضمون ہے۔جس میں خواجہ صاحب نے اس دیوان کے اشعاراورکچھ داخلی شواہد سے اس کو زیب النساء کا دیوان تسلیم کرنے میں تامل کیا ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے ہندوستان اورایران کے اُن تمام تذکروں کو دیکھا ہے جس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پرزیب النساء کا ذکر آیا ہے۔مثلاً'مجمع الغرائب'(ملاسعیداشرف مازندرانی)'تذکرہ مخزن الغرائب'(احمد علی سندیلوی)اور'کلمات الشعراء'(افضل سرخوش)وغیرہ۔واضح رہے کہ ان تمام تذکروں میں زیب النساء کوایک شہزادی کی حیثیت سے توتسلیم کیا گیا ہے لیکن ایک شاعرہ کی حیثیت سے نہیں اورنہ ہی دیوان مخفی کواس کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔خواجہ صاحب نے دیوان مخفی مطبوعہ نول کشور کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تو درج ذیل حقائق ان کے سامنے آئے۔

۱۔یہ ایران کے کسی قادرالکلام کا دیوان ہے جس کی شاعری حافظؔ کی شاعری کے ہم پلہ ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے حافظؔ اورمخفیؔ کے اشعار کا موازنہ بھی کیا ہے۔

۲۔دیوان میں بیشتر اشعار ایسے ہیں جن میں مالی زبوں حالی کا ذکر کیا گیا ہے جس کی ایک شہزادی سے توقع نہیں کی جاسکتی۔

۳۔کئی اشعار ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کا وطن ہندوستان نہیں تھا بلکہ خراسان تھا۔

زروئے لطف بہ تقصیرمن قلم درکش   کہ باتو ہست مرانسبت خراسانی

واضح رہے کہ یہ شعر اُس قصیدہ سے مأخوذ ہے جو خواجہ صاحب کے بقول مخفی نے فیروز خان کی مدح میں لکھا تھا۔

۴۔دیوان کے اشعار سے شاعر کے بنگال جانے کا ثبوت بھی ملتا ہے ؎

جستجو کردم بسے مخفی چو در گرداب ہند نشہ آسودگی جائے بجز بنگالہ نیست

جبکہ خواجہ صاحب کے بقول، شاہی بیگمات کو کبھی بنگال کے سفر کا موقع ملا ہی نہیں۔ یہ تمام شواہد اس بات کی نفی کرتے ہیں کہ یہ دیوان زیب النساء مخفی کا ہے۔خواجہ صاحب نے صرف ایک شعر پیش کیا ہے جو اس دیوان کو زیب النساء سے منسوب کرتا ہے ؎

دختر شاہم ولیکن رو بہ فقر آوردہ ام زیب و زینت بس ہمینم نام من زیب النسا است

اس شعر کے بارے میں خواجہ صاحب کا خیال ہے کہ 'کسی مفتری نے اس غزل کو دیوان مخفی رشتی میں شامل کر دیا ہے۔'(۴) خواجہ صاحب اس دیوان کو زیب النساء مخفی کا دیوان نہیں مانتے بلکہ مخفی رشتی کا دیوان قرار دیتے ہیں۔خواجہ صاحب کا یہ مضمون ۱۹۵۴ء میں 'مہر نیمروز' کراچی میں شائع ہو چکا ہے۔

ایران سے فارسی شعراء کی ہندوستان آمد کا سلسلہ دراز رہا ہے لیکن ہندوستان ان کی شاعری میں کس طرح منعکس ہوا ہے اس پر خواجہ صاحب نے تفصیل سے نظر ڈالی ہے۔'ہندوستان، شعراء ایران کے کلام میں' کے زیر عنوان ان کا اہم مضمون اس کتاب کی زینت ہے۔اس مضمون کے مقصد تالیف کی وضاحت کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے لکھا ہے

''زیر نظر مقالے میں بعض ایرانی شعراء کے اُن اشعار کو یکجا کر دینا مقصود ہے جس میں ہندوستان کے متعلق کوئی رائے دی گئی ہو۔خواہ وہ ہجو نویسی ہو یا کلمۂ تحسین و ستائش۔'' (۵)

اس سلسلے میں انہوں نے خاص طور پر سلیم تہرانی ،لسانی شیرازی، مسیح کاشی، صائب، قدسی مشہدی، ملا سعید اشرف، کلیم اور شیخ علی حزیں وغیرہ کے اشعار کے حوالے سے اس دور کے ہندوستان کا منظر نامہ بیان کیا ہے۔ان میں سے بیشتر شعراء نے ہند کی قدر دانی کا اعتراف کیا ہے۔تاہم چند شعراء کو ہندوستان سے شکوہ بھی رہا ہے۔یہ مضمون اس لحاظ سے افادیت کا حامل ہے کہ ایران سے ہجرت کرنے والے شعراء کا یکجا ذکر اس میں پڑھنے کو مل جاتا ہے۔۔۔فارسی ادبیات کے علاوہ 'مضامین افضل' میں کئی اہم شخصیات کی حیات و خدمات پر مقالات کے علاوہ تاریخی مقامات کے بارے میں بھی کئی تحقیقی مضامین شامل ہیں۔جن کا مأخذ ،ظاہر ہے، عہد وسطیٰ کی فارسی تاریخیں ہیں۔ایسے ہی مضامین میں 'نالندہ اور بختیار خلجی' بھی شامل ہے۔

'مضامین افضل' میں شامل مضامین کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔تاہم خواجہ صاحب کے دو اہم مضامین اس کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئے جو بعد میں خدا بخش لائبریری جرنل میں بالترتیب ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۳ء میں شائع

ہوئے۔ان میں سے پہلا مضمون سوہنی صاحب کی سیرت وشخصیت پر ہے جس کا عنوان ہے۔ ''سوہنی صاحب: چند یادیں''۔سوہنی صاحب کی شخصیت پر خواجہ صاحب کے مضمون سے قبل ادارہ کی طرف سے ایک نوٹ دیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے خدا بخش لائبریری مینیجنگ کمیٹی کے چیئر مین کی حیثیت سے لائبریری کے لئے گرانقدر خدمات انجام دی تھی۔عربی اور فارسی مخطوطات کے توضیحی کیٹلاگ کی تین جلدیں (جلد: اطبع دوم، جلد ۲۷ اور ۲۸) انہی کے زمانے میں شائع ہوئیں۔۱۵ر جولائی ۲۰۰۲ء کو پونا میں ان کا انتقال ہوگیا۔لہذا ان کی خدمات کے اعتراف میں اور انہیں خراج عقیدت کے طور پر خواجہ صاحب کا یہ مضمون شائع کیا گیا۔

خواجہ صاحب کے اس مفصل مضمون سے سوہنی صاحب ایک عالم ودانشور، کتاب دوست اور سیکولر مزاج شخص کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔انہیں مخطوطات اور نوادرات سے بیحد دلچسپی تھی اور وہ ان کا پتہ لگا کر ہر ممکن کوشش کرتے کہ انہیں لائبریری میں محفوظ کر دیا جائے۔خواجہ صاحب ان سے اپنی ملاقات کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے پٹنہ یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ فرامین اور مہروں پر انگریزی میں ایک مضمون لکھا تھا جو سوہنی صاحب سے ملاقات کا سبب بنا۔اس مضمون سے متاثر ہوکر سوہنی صاحب نے انہیں بلایا اور اس کے حوالے سے نوادرات پر کافی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔خدا بخش لائبریری کے لئے سوہنی صاحب کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے کئی ایسے واقعات بیان کئے ہیں جن سے اس لائبریری سے ان کی قلبی وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔انہوں نے گاؤں اور قصبوں سے بہت سارے ذاتی ذخیروں کو اپنی دلچسپی اور کوششوں سے خدا بخش لائبریری میں منتقل کرایا اور اس طرح یہ قیمتی کتابیں لائبریری میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگئیں۔

تصوف سے دلچسپی اور صوفیہ کرام سے سوہنی صاحب کی عقیدت وشیفتگی کا بیان کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے لکھا ہے کہ وہ صوفیہ کرام سے عقیدتمندانہ وابستگی ہی کے سبب وہ اکثر خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف میں حاضر ہوتے، زیب سجادہ حضرت مولانا سید شاہ محمد امان اللہ قادریؒ کی خدمت میں حاضری دیتے اور ۱۲ر ربیع الاول کو موئے مبارک کی زیارت بھی کرتے تھے۔

سوہنی صاحب کے سیکولر مزاج اور تاریخ پر ان کی گہری نظر کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ افضل امام صاحب نے لکھا ہے کہ وہ تاریخ کو مسخ کرنے کی کسی بھی کوشش کی سخت مخالفت کرتے تھے اور مدلل جواب دیتے تھے۔چنانچہ ڈاکٹر تریویدی نے اپنے ایک مضمون میں قطب مینار کو ایک ہندو عمارت قرار دینے کی جرأت کی تو اسی مجلس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود سوہنی صاحب نے نہ صرف اس کی تردید کی بلکہ قطب مینار کی اصل تاریخی حیثیت کو بھی لوگوں کے سامنے رکھا۔

خواجہ صاحب کا یہ مضمون، بہترین خراج عقیدت ہے ایک ایسے شخص کو جن سے خالص علمی بنیاد پر ان کے

تعلقات استوار ہوئے تھے اور جنہوں نے انتظامی عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود علم وادب اور کتابوں سے اپنا رشتہ برقرار رکھا۔ بہار ریسرچ سوسائٹی جرنل میں سوہنی صاحب کے مضامین اور ان کی مطبوعہ کتابوں کی جو فہرست شائع ہوئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انتظامی امور سے بچ رہنے والے ایک ایک لمحے کو انہوں نے مطالعہ اور تصنیف وتالیف کے لئے وقف کر دیا تھا۔

خدا بخش لائبریری کے حوالے سے ہی خواجہ صاحب کا ایک اور مضمون نہایت معلوماتی ہے جو خدا بخش لائبریری جرنل کے شمارہ نمبر ۱۳۰ (۲۰۰۲ء) میں شائع ہوا ہے۔ ''خدا بخش لائبریری: چند یادیں'' کے زیر عنوان لکھا گیا یہ مضمون خواجہ صاحب کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ یہ مضمون اس لحاظ سے اہمیت اور انفرادیت کا حامل ہے کہ یہ ایک ایسے دور کے چشم دید حالات و واقعات کے بیان پر مشتمل ہے جب علم وادب کے ساتھ کتاب دوستی کی روایت بھی زندہ وتابندہ تھی۔ مطالعات اور مشاہدات دونوں پر مبنی خواجہ صاحب کے ایسے ہی بیانات میں صلاح الدّین خدا بخش کے حوالے سے ان کا بیان بھی شامل ہے جس سے صلاح الدّین خدا بخش کی شخصیت کے کئی دلچسپ گوشے سامنے آئے ہیں اور ان گوشوں میں کتابوں کی جستجو کا وہ اہم پہلو بھی شامل ہے جو ظاہر ہے ان کے والد خدا بخش خاں سے انہیں وراثت میں ملی تھی۔ خواجہ افضل امام، اُن مصنفین میں غالباً آخری کڑی تھے جنہوں نے صلاح الدّین خدا بخش کے حوالے سے آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔ ان کے بعد وہ نسل ختم ہوئی۔

خدا بخش لائبریری تو صرف ایک حوالہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خواجہ صاحب کے اس مضمون میں وہ پورا عہد روشن و منور ہوا ہے جب اہل علم کتابوں کی پناہ میں زیست کرتے تھے اور خدا بخش لائبریری کی کتابیں جن کے لئے زیست کا سامان ہوا کرتی تھیں۔ ان میں قاضی عبدالودود، مولانا ریاست علی ندوی اور پروفیسر سید حسن جیسے عربی و فارسی کے دانشور اور حسن عسکری جیسے عہد وسطیٰ کے ممتاز مؤرخ شامل ہیں۔ یہ خدا بخش لائبریری کی بھی خوش قسمتی ہے کہ اسے ایسے قارئین میسّر آئے۔

خدا بخش لائبریری سے اپنی وابستگی کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے خوجہ صاحب نے وہ دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جب انہوں نے پہلی بار لائبریری میں حاضر ہو کر 'کلیات انیس' نکلوائی تھی اور اُس وقت وہ ساتویں کلاس کے طالب علم تھے۔ اُس دن لائبریری کے کارکنان نے انہیں ہدف تمسخر بھی بنایا تھا کہ یہ عمر اور یہ کتاب! لیکن انہیں کیا پتہ تھا کہ ساتویں کلاس کا یہ طالب علم آنے والے دنوں میں خدا بخش لائبریری کا مؤرخ بن کر سامنے آئیگا۔ خدا بخش لائبریری میں مسلسل مطالعات کے حوالے سے خواجہ صاحب نے اپنی پی ایچ ڈی کے موضوع کا واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں انہوں نے اپنے استاد محترم سید حسن کی نگرانی میں علی قلی سلیم طہرانی پر ڈاکٹریٹ کیا تھا اور انگریزی میں ان کا یہ مقالہ کتابی

شکل میں شائع بھی ہو چکا ہے۔لیکن یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ یہ موضوع قاضی عبدالودود نے منتخب کیا تھا اور سید حسن نے اسے پسند کرتے ہوئے رضامندی دی تھی۔حالانکہ یہ قصّہ اختصار کے ساتھ خواجہ صاحب نے سلیم طہرانی پر اپنی کتاب کے دیباچہ میں بھی بیان کیا ہے لیکن اس مضمون میں یہ قصّہ ذرا تفصیل سے اور اپنے پس منظر سمیت بیان ہوا ہے۔

خدا بخش لائبریری کے حوالے سے خواجہ صاحب کی یہ یادیں یکرخی ہوتیں اگر وہ اپنی گفتگو صرف علم یا کتابوں تک محدود رکھتے۔لیکن ان کے مشاہدات کا دائرہ وسیع ہے اور یہ پھیل کر خدا بخش لائبریری کی اُس زمانے کی عمارت، وہاں کی انتظامی صورتحال اور وہاں کے کارکنان تک محیط ہو گیا ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے ذاکر صاحب کی خدمات کو خاص طور پر خراج عقیدت پیش کیا ہے جنہوں نے لائبریری کی توسیع و ترقی میں ذاتی دلچسپی لی تھی۔اُس زمانے میں لائبریری کے کارکنان کی سادہ و پُر لطف حکایتیں، خواجہ صاحب کے دلچسپ انداز نگارش کا بہترین نمونہ ہیں۔کارکنوں کے علاوہ، وہاں کے لائبریرین، ڈائرکٹر اور دیگر اعلا عہدیداروں میں خواجہ صاحب نے قاسم صاحب، رحمت خاتون، صفی احمد، عبدالصّمد خان، احسن شیر، اطہر شیر، پروفیسر کلیم الدّین احمد اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور ان سب کے عہد میں لائبریری کی ترقیاتی کاموں کا جائزہ بھی لیا ہے۔یہ مضمون خدا بخش لائبریری کے گویا عہد اوّل کی داستان ہے جو نہ صرف خواجہ صاحب کی اوّلیات میں شمار ہونے کے قابل ہے بلکہ خدا بخش لائبریری کے تذکرے میں بھی اس کو اوّلیت حاصل رہے گی۔

اسی نوعیت کا دوسرا اہم مضمون پروفیسر سید حسن عسکری صاحب کے حوالے سے ہے جو خواجہ صاحب کے استاد گرامی بھی تھے۔عسکری صاحب کی سیرت و شخصیت اور ان کی مؤرخانہ حیثیت پر خواجہ صاحب کا یہ مضمون اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں ایسے چشم دید واقعات بیان ہوئے ہیں جو کہیں اور نہیں ملتے۔عسکری صاحب کی سادگی، خاکساری و انکساری، علمی و ادبی اور دانشورانہ حلقوں میں ان کا زبردست اکرام و احترام، عسکری صاحب کی غیر جانبدارانہ تاریخ نویسی اور ان کے غیر متعصّبانہ نظریات، کتابوں خاص طور پر قلمی نسخوں سے ان کی والہانہ شیفتگی، طالب علموں کی رہنمائی اور حاجتمندوں کی مخلصانہ اعانت۔عسکری صاحب کی یہ تمام صفات، مختلف واقعات کے حوالے سے اس مضمون میں بیان ہوئے ہیں۔لیکن ان سب پر مستزاد عسکری صاحب کا وہ واقعہ ہے جس میں خواجہ صاحب نے خود اپنی ایک ضرورت کے حوالے سے ان کی بزرگی اور ولایت کا بیان کیا ہے۔اس کے علاوہ عسکری صاحب کی سماجی خدمات کا بیان بھی اس مضمون کا امتیازی پہلو ہے۔عسکری صاحب کی مسلکی رواداری پر بھی خواجہ صاحب نے اظہار خیال کیا ہے اور بطور مثال وہ واقعہ پیش کیا ہے جب عسکری صاحب نے گیا میں تبلیغی جماعت کے اجتماع میں شرکت کی تھی اور تین دنوں کا چلّہ بھی کیا تھا۔یہ اور اس قسم کے بے شمار واقعات اس مضمون کی زینت ہیں جن سے عسکری صاحب کی شخصیت کی کئی نئی جہتیں غالباً پہلی بار سامنے آئی ہیں۔

'مضامین افضل' کے بعد خواجہ صاحب کی تیسری تصنیف **'آئینہ شعرائے بہار'** پٹنہ سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی ۔خواجہ صاحب نے اس کا انتساب معروف مؤرخ پروفیسر حسن عسکری کے نام کیا ہے۔ یہ کتاب دراصل انہی کے مشورے کا نتیجہ ہے۔اس کتاب میں تقریباً دو ہزار اردو، فارسی شعرائے بہار کا تخلص، سکونت، نام، ولدیت اور سنہ وفات کو جمع کر دیا گیا ہے۔اس کو خود خواجہ صاحب نے ڈائرکٹری کا نام دیا ہے۔شعراء کے نام کی ترتیب میں حروف تہجی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ جو آباد (شیخ باقر علی) سے شروع ہو کر یوسف (حکیم سید محمد یوسف پھلواروی) پر ختم ہوتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ تقریباً چوتھائی شعراء ہندو ہیں جن کا شمار اساتذۂ فن میں ہوتا تھا۔اور دوسری خاص بات یہ ہے کہ تذکرہ نگاری کے اسباب و محرکات اور تذکروں کے اقسام پر خواجہ صاحب کا ایک جامع مضمون اس کتاب کی زینت ہے جس میں انہوں نے خاص طور پر خلاصۃ الاشعار، تذکرۃ الشعراء، نتائج الافکار، مرأۃ الخیال، سفینہ خوشگو، کلمات الشعراء، مجالس النفائس اور تذکرہ نصر آبادی کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔۲۰۰۲ء میں ہی خواجہ صاحب کی ایک اور کتاب شائع ہوئی۔**''نسب نامۂ خواجگان موضع جانپور۔''** جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب خواجہ صاحب کا خاندانی شجرہ نامہ ہے جو انہوں نے بیرون ملک جا بسے اپنے رشتہ داروں کے اصرار پر ترتیب دیا تھا۔اس کتاب کو نسب نامہ کے بکھرے ہوئے اوراق کو منظّم اور مرتّب کرنے کی کوشش کے طور پر دیکھا جانا چاہئے۔

ان دونوں کتابوں کے بعد ۲۰۰۳ء میں خواجہ صاحب کی وہ کتاب منظر عام پر آئی جو ان کی شخصیت کا شناسنامہ بھی ہے اور فارسی ادب میں ایک اہم اضافہ بھی۔علی قلی سلیم تہرانی پر انگریزی میں ان کا تحقیقی مقالہ اس عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔

" Life and works of Ali Quli Salim Tehrani " اس کتاب کا انتساب انہوں نے اپنے استاد محترم پروفیسر سید حسن کے نام کیا ہے جو اُن کے اس تحقیقی مقالے کے نگراں بھی تھے۔خواجہ صاحب نے سلیم تہرانی کی کلیات کے نسخہ خدا بخش کو اساسی نسخہ قرار دے کر اس کے مزید نسخوں سے موازنہ کیا جو بنارس، کلکتہ اور حیدرآباد کے مختلف کتبخانوں میں محفوظ ہیں۔اس سلسلے میں انہوں نے رامپور اور دہلی کا سفر بھی کیا جہاں پروفیسر امیر حسن عابدی سے ان کی ملاقات ہوئی۔انہوں نے مشورہ دیا کہ وہ صرف علی قلی سلیم تہرانی کی حیات وخدمات پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے ایسا ہی کیا اور اس طرح وہ ۱۹۵۹ء میں پی، ایچ، ڈی کی سند سے سرفراز ہوئے۔اس کتاب کے مشتملات پر اختصار کے ساتھ یہاں گفتگو کی جائیگی جس سے اندازہ ہوگا کہ سلیم تہرانی کی حیات وخدمات پر یہ کتاب کس قدر جامعیت کی حامل ہے اور یہ بھی کہ اُس دور کے پورے فارسی ادب پر خواجہ صاحب کی کتنی گہری نگاہ تھی۔لیکن اس سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ خواجہ صاحب نے اس موضوع کا انتخاب کیوں کیا۔اس کے اسباب پر گفتگو کرتے ہوئے خواجہ صاحب

نے لکھا ہے کہ جہانگیر اور شاہجہاں کے ادوار میں جو باکمال شعرا ممتاز مقام کے حامل تھے، ان میں سلیم تہرانی بھی شامل ہے ۔لیکن تذکرہ نگاروں نے نہ صرف اسے نظرانداز کیا بلکہ اس کی کردارکشی بھی کی ۔اس کے علاوہ سلیم کی حیات کے مختلف ادوار اور ہندوستان میں اس کی آمد کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے زیادہ معلومات فراہم نہیں کی ہے جبکہ سلیم کے شاعرانہ اوصاف وامتیازات کہیں سے بھی اس کے معاصر شعراء سے کم نہیں ہیں ۔اور اُس دور کے ایران و ہند کے سیاسی، سماجی اور ادبی ماحول کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔

کتاب کے آغاز سے پہلے دو ابواب بہت اہم ہیں جس میں خواجہ صاحب نے صفوی دور میں ہند و ایران کے تعلقات اور فارسی شاعری میں سبک ہندی اور اس کی خصوصیات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

کتاب کا اہم باب، جس کو کتاب کے موضوع کا نقطۂ آغاز کہا جانا چاہئے، وہ ہے جس میں خواجہ صاحب نے سلیم تہرانی کے متعلق اُن تمام بیانات کو یکجا کر دیا ہے جو مختلف تذکرہ نگاروں اور تاریخ نویسوں نے اپنی اپنی کتابوں میں لکھے ہیں۔ ''سلیم تہرانی مختلف کتابوں میں'' کے زیرعنوان اس باب میں خواجہ صاحب نے بطور خاص ان تذکروں کا ذکر کیا ہے ۔ید بیضا، نشترعشق، سرو آزاد، مجمع النفائس، شمع انجمن، قاموس المشاہیر اور صحف ابراہیم وغیرہ ۔اس کے بعد، سلیم کی حیات اور ایران میں اس کے معاصرین کے حوالے سے دو مسلسل ابواب میں سلیم کی سوانح پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے ۔پھر سلیم کی ہندستان ہجرت اور اس کے اسباب ومحرکات پر گفتگو کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے لکھا ہے کہ پہلا سبب تو مشترک تھا، یعنی غربت اور تنگدستی ۔دوسرا سبب یہ تھا کہ ایران میں سلیم کے حاسدین نے اس کا وہاں رہنا مشکل کر دیا تھا جس کا اندازہ سلیم کے اس شعر سے بھی ہوتا ہے ؎

بسکہ اخوانند چوں یوسف بمن نامہرباں گرگ ہمچوں پاسباناں برسر چاہ منست

سلیم تہرانی جہانگیر کے زمانے میں ہندوستان پہنچا یا شاہجہاں کے زمانے میں، تذکرہ نگاروں کے درمیان اس پر اختلاف ہے۔خواجہ صاحب نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہندوستان میں اس کی آمد ۱۶۳۰ء میں ہوئی ۔اور اس کی وفات ۱۰۵۷ھ میں ہوئی جب اس کی عمر ستر سال کے آس پاس تھی ۔سلیم کے کردار اور ہندوستان کے تئیں اس کے جذبات کو اجاگر کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے لکھا ہے کہ وہ روادار اور اعلاظرف تھا اور اس کے یہاں مسلکی تعصّب کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔

سلیم تہرانی کے آثار کے ذیل میں اس کی کلیات کے علاوہ خواجہ صاحب نے خاص طور پر اس کی مثنوی 'قضاوقدر ، فتح آسام اور 'مثنوی در مدح کشمیر' کو اس دور کے سیاسی وسماجی ماحول کے تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے ۔ کلیات سلیم میں غزل اور مثنوی کے علاوہ قصائد اور قطعات بھی شامل ہیں ۔ان سب شعری اصناف کی روشنی میں خواجہ

صاحب نے تفصیل سے سلیم کے زبان واسلوب سے بحث کی ہے۔اوراس کے معاصرین سے موازنہ کرتے ہوئے اس کے امتیازات کو واضح کیا ہے۔اور شاید پہلی بار فارسی ادب میں سلیم تہرانی کو اس کا وہ مقام دلانے کی کوشش کی ہے جس کا وہ بجا طور پر مستحق تھا۔خواجہ صاحب سلیم تہرانی کو اس کا مقام دلانے میں تو کامیاب رہے لیکن فارسی کی تعلیمی، تدریسی اور تحقیقی روایت میں خود خواجہ صاحب کے مقام کا تعین کب اور کیسے ہوگا، یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔

حواشی:

(۱) مضامین افضل۔ص۶

(۲) ایضاً۔ص۴

(۳) بہار کی بَہار (جلد دوم) ص۹۰

(۴) مضامین افضل۔ص۳۴

(۵) ایضاً۔ص۱۰۱

منابع:

(۱) بہار کی بَہار۔(جلد دوم)۔ڈاکٹر اعجاز علی ارشد۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔نئی دہلی۔۲۰۱۷ء

(۲) مضامین افضل۔ڈاکٹر خواجہ افضل امام۔دارالادب۔بہارستان۔سلطان گنج۔پٹنہ۔۲۰۰۱ء

(۳) آئینہ شعرائے بہار۔ڈاکٹر خواجہ افضل امام۔دارالادب۔بہارستان۔سلطان گنج۔پٹنہ۔۲۰۰۲ء

(۴) نسب نامہ خواجگان موضع جانپور۔ڈاکٹر خواجہ افضل امام۔دارلادب۔بہارستان۔سلطان گنج۔پٹنہ۔۲۰۰۲ء

(۵) سید حسن نامہ۔مرتب: پروفیسر محمد شرف عالم۔مہر پرنٹرس اینڈ کمپوزرس، پٹنہ۔۲۰۰۵ء

(۶) خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ۔اپریل۔جون۔۲۰۰۲ء

(۷) خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ۔جنوری۔مارچ۔۲۰۰۳ء

(۸) خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ۔اکتوبر۔دسمبر۲۰۰۲ء

(۹) Life and works of Ali Quli Salim Tehrani.Dr.Kaja Afzal Imam.Darul Adab.Baharistan. Sultanganj.Patna . 2003 A D.

☆☆☆

ڈاکٹر مکرم علی
شعبۂ فارسی
شبلی نیشنل (پی۔جی) کالج، اعظم گڑھ

ڈاکٹر زہرہ عرشی اور مثبت انداز فکر

''ڈاکٹر زہرہ عرشی ۱۹۸۲ء سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں خدمت کرتے ہوئے ۱۳؍اگست ۲۰۱۳ء کو اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئیں۔انہوں نے تقریباً ۳۱؍سال درس وتدریس کے فرائض کو بہ حسن وخوبی انجام دیا۔ان کا شمار شعبہ کے بہترین استادوں میں ہوتا تھا۔اپنی شرافت وسنجیدگی، شائستگی ومتانت اور سادہ لوح زندگی گذارنے کے سبب رامپور سے لے کر علی گڑھ تک کے علمی حلقوں میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتی تھیں۔آپ کی ساری زندگی شعبے کی خدمت کرنے اور مکمل طور پر دین و مذہب کے راستے پر گذری۔علم وادب کی یہ نیک اور صالح خاتون اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے دوسال بعد ہی ۱۶؍اگست ۲۰۱۵ء (تقریباً پونے دس بجے رات بروز اتوار) میں اس دنیائے فانی کو خیر باد کہا اور اگلے روز یعنی ۱۷؍اگست بروز دوشنبہ، بعد نماز ظہر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی قبرستان منٹوئی میں آپ کی تدفین ہوئی۔[1] ڈاکٹر زہرہ عرشی کی ایک کتاب ''انتخاب عرشی''اور متعدد مضامین کی ایک لمبی فہرست ہے جو مختلف شہروں کے جریدوں کی زینت بنتے رہے۔اس مختصر سی کاوش میں ان کے ہر مقالے پر تفصیلی گفتگو ممکن نہیں۔ ذیل میں راقم نے ان کی سوانح حیات اور ان کا تحقیقی مقالہ (جو ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے) پر تفصیلی تبصرہ کرنے کی کوشش کی ہے''۔

ڈاکٹر زہرہ عرشی ۱۰؍اگست ۱۹۴۸ء کو یو پی کے شہر رامپور میں پیدا ہوئیں، ان کے والد مولانا امتیاز علی عرشی ہندوستان کے چند گنے چنے محققین میں شمار ہوتے ہیں، جن سے علمی حلقہ بخوبی واقف ہے، ڈاکٹر زہرہ عرشیکے جد امجد افغانستان کے صوبہ سوات سے نقل مکانی کر کے ہندوستان میں قیام پذیر ہوئے۔ان کا خاندان سوات کے قصبہ مٹاباج کٹے میں آباد تھا۔اس خاندان کا تعلق یوسف زئی قبیلے کی ایک شاخ اکوزئی حاجی خیل سے تھا۔خاندانی روایت کے مطابق

مشرف خاں اور مقرب خاں دو سگے بھائی تھے جن میں سے مقرب خاں اپنے بڑے بھائی مشرف خاں سے کسی بات پر ناراض ہوکر اپنے اہل خانہ کے ساتھ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں کہیں اور رکنے کے بجائے سیدھے رامپور میں آکر بس گئے تھے، لیکن خاندانی نسل کے سلسلے میں مجبوراً (ان میں شادیاں خاندان سے باہر نہیں ہوتی تھیں) مقرب خاں نے اپنے بھائی مشرف خاں کے دونوں بچوں سے اپنی پوتیوں (بنت محمد سعید خاں) کا نکاح کر دیا اور شادی کے بعد دونوں بھائیوں نے سوات کی سکونت ترک کر کے رامپور ہی کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ ان میں سے ایک کا نام گل باز خاں اور دوسرے کا رحم باز خاں تھا، رحم باز خاں کے صاحبزادے مولانا اکبر علی خاں محدث رامپور تھے جو مولانا امتیاز علی عرشی کے حقیقی دادا تھے۔ مولانا امتیاز علی عرشی کے والد کا نام ڈاکٹر مختار علی خاں تھا۔ ڈاکٹر زہرہ عرشی اسی مشرف خانی شاخ کی ایک فرد تھیں۔[۲] ڈاکٹر

صاحبہ کے کل سات بھائی: اکبر علی خاں عرشی زادہ (سابق ایڈیشنل ڈائرکٹر رامپور رضا لائبریری، ان کا انتقال ہوگیا) ۲۔ مختار عرشی ۳۔ ممتاز عرشی (سابق ریجنل ہائر ایجوکیشن آفیسر میرٹھ، ۲۰۱۰ء میں رٹائرڈ ہوگئے) ۴۔ نجف ارشاد عرشی (عربی سے پی-ایچ ڈی ہیں) ۵۔ جعفر عرشی (امریکہ چلے گئے تھے، آج کل ہندوستان میں ہیں، امراض اکوپنکچر اسپشلسٹ ہیں) ۶۔ راشد عرشی ۷۔ طاہر عرشی اور ایک بہن صالحہ الکبریٰ (علی گڑھ میں مقیم ہیں)۔ ڈاکٹر زہرہ عرشی کی والدہ کا نام حاجرہ بیگم تھا۔[۳]

ڈاکٹر موصوفہ کی قرآن شریف کے ساتھ ساتھ اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم (اپنے وطن رامپور) گھر پر ہوئی۔ بعد اذاں گورنمنٹ خورشید لقا انٹر کالج رامپور میں ساتویں جماعت میں داخل ہوئیں، جہاں سے انہوں نے ۱۹۶۲ء میں ہائی اسکول اور ۱۹۶۵ء میں انٹرمیڈیٹ کے امتحانات سکنڈ ڈویژن کے ساتھ پاس کیا۔ بی-اے انہوں نے گورنمنٹ رضا ڈگری کالج رامپور (جس کا الحاق آگرہ یونیورسٹی سے تھا) سے ۱۹۶۷ء میں سکنڈ ڈویزن اور فرسٹ پوزیشن سے پاس کیا، اس سال کوئی بھی طالب علم فرسٹ ڈویزن سے نہیں پاس ہوا تھا (ڈاکٹر زہرہ عرشی بی-اے کرنے کے درمیان اپنے کالج میگزین اردو فارسی والے حصے کی ایڈیٹر بھی تھیں) اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں فارسی ادب میں ایم-اے میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۰ء میں فارسی سے ایم-اے کا امتحان فرسٹ ڈویزن کے ساتھ پاس کیا اور اسی یونیورسٹی سے ۱۹۷۶ء میں ان کو ''فرہنگ جہانگیری کا تنقیدی متن'' (از سید جمال الدین حسین انجو شیرازی. Vol-1) مرتب کرنے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔

ڈاکٹر موصوفہ پہلی مرتبہ عارضی طور پر ۱۹۸۲ء میں آٹھ مہینے کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں لکچرر منتخب ہوئیں، اس کے بعد ۱۹۸۳ء میں اسیبو نیورسٹی کے ویمنس کالج (Womens College) میں مستقل طور پر

لکچرر شپ کے لیے انتخاب ہوا، جہاں ۱۹۹۷ء میں ان کو ریڈر کے عہدے پر فائز کیا گیا اور سبکدوشی (۲۰۱۳ء) تک اسی عہدے پر تدریسی فرائض انجام دیتی رہیں۔[۴]

ڈاکٹر صاحبہ کی زندگی کا المیہ یہ ہے کہ ۲۲؍فروری ۲۰۰۲ء کو ان کے شوہر ڈاکٹر سید راشد حسین (جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے شعبۂ فارسی میں ریڈر تھے) کا اچانک انتقال ہوگیا اور وہ اس دنیا میں تنہا رہ گئیں، اللہ رب العزت نے ان کو اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا، اللہ کی مشیت ایزدی میں کون دخیل ہوسکتا ہے، ابتداءِ زمانہ کے ہاتھوں مرحومہ تنہا رہ جانے کے باوجود بھی اپنے فرائض منصبی سے کبھی غافل نہ ہوئی تھیں اور ہمیشہ انتہائی دلجمعی کے ساتھ اپنے طالب علموں کی تدریس وتحقیق میں رہنمائی کرتی تھیں۔[۵]

درس وتدریس کے علاوہ آپ نے علی گڑھ اور علی گڑھ کے باہر مختلف شہروں کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے کانفرنسوں میں حصہ لیتی رہیں اور متعدد سمیناروں میں اپنے گرانقدر مقالے بھی پڑھے، آپ اورینٹیشن کورس (Orientation Course)، ریفریشر کورسز (Refresher Courses) اور سمر انسٹی ٹیوٹ (Summer Institute) میں حصہ لیتی رہیں، اس کے علاوہ ہماری معلومات کے مطابق ان کے کل سولہ تحقیقی اور تنقیدی مضامین مختلف معیاری میگزینوں اور رسالوں میں شائع ہوئے۔ ان کے مقالے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ہیں۔ راقم کے نزدیک ان کا ہر مقالہ بہت اہمیت کا حامل ہے، لیکن اس مختصر سے مقالے میں ان کے ہر مضمون پر تفصیلی وتنقیدی تبصرہ ممکن نہیں ہے، اس لیے ہم ذیل میں صرف فہرست پر اکتفا کررہے ہیں:

(۱) تاریخ جہانگشا کی اہمیت (رضا ڈگری کالج میگزین، رامپور)

(۲) عراقی اور اس کی صوفیانہ شاعری (رضا ڈگری کالج میگزین، رامپور)

(۳) قاآنی کے ایک قصیدہ کا ترجمہ (رضا ڈگری کالج میگزین، رامپور)

(۴) جن کی باتوں میں گلوں کی خوشبو: از رشید احمد صدیقی (تحریک ویکلی)

(۵) اقبال کا پسندیدہ شاعر: خوشحال خان کھٹک (نوائے ادب بامبے، اخبارِ ادب بامبے، ہماری زبان دہلی)

(۶) ثنائے لفظی وثناء معنوی (ادیب، علی گڑھ)

(۷) چہار مقالہ کی تاریخی اہمیت (جولائی ۱۹۷۸ء، معارف اعظم گڑھ)

(۸) قاآنی انیسویں صدی کا سب سے اہم شاعر (ہماری زبان دہلی، فروری ۱۹۷۸ء)

(۹) ایلخانی عہد کا تاریخی ادب (فروری ۱۹۷۹ء، برہان)

(۱۰) میرے ابا اور میں ''مولانا امتیاز علی عرشی- ادب اور تحقیقی کارنامے'' (غالب انسٹی ٹیوٹ، نیو دہلی ۱۹۹۱ء)

(۱۱)ہما از لطفِ شامی بینم، ''پروفیسر نذیر احمد'' (غالب انسٹی ٹیوٹ، نیو دہلی ۱۹۹۱ء)

(۱۲)وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں: ''مولانا امتیاز علی عرشی'' (ہماری آواز، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی ،میرٹھ، فروری ۲۰۰۲ء)

(۱۳)فرہنگ جہانگیری اور اس کا مصنف (فکر و نظر، فارسی ادب، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی نمبر)

(۱۴)انوری فارسی کا باکمال قصیدہ گو (رضا ڈگری کالج میگزین، رامپور)

(۱۵)خاقانی شروانی بحیثیت قصیدہ گو (رضا ڈگری کالج میگزین، رامپور)

(۱۶)عطیائے شبلی (ویمنس کالج میگزین، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۱۳ء)

اس کے علاوہ ان کی ایک کتاب ''انتخاب عرشی'' کے نام سے ہے جو مولانا عرشی میموریل سوسائٹی رامپور سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی ہے۔''[۵]

ڈاکٹر صاحب ہمیشہ اپنے طالب علموں کی مدد کے لیے تیار رہتی تھیں، کبھی طالب علموں سے ناراض نہیں ہوتی تھیں، اپنے اصول وضوابط کے ساتھ زندگی گزارنے کا درس دیتی تھیں، پڑھائی کے سلسلے میں جب بھی کوئی طالب علم ان سے ملتا ہمیشہ اپنے طالب علموں کی خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کرتی تھیں، کبھی ناراضگی یا وقت کی کمی کا اظہار نہیں کرتی تھیں، میں بذات خود ۱۹۹۷ء تا ۲۰۰۲ء (یعنی پانچ سال) ڈاکٹر موصوفہ کا طالب علم رہ چکا ہوں اس لیے ڈاکٹر مرحومہ کو بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا ہوں، زہرہ صاحبہ ہر اعتبار سے ایک مثالی استاد تھیں۔ ان کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ وہ طالب علموں کے ذاتی مسائل تک سے نہ صرف یہ کہ آگاہی رکھتی تھیں بلکہ ان کو حل کرنے میں عملی مدد بھی کیا کرتی تھیں، میں جس زمانے میں اپنا تحقیقی مقالہ مرتب کر رہا تھا ڈاکٹر صاحبہ نے قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے مفید مشوروں سے نوازتی رہتی تھیں، جب کہ میرا نگراں کوئی اور تھا، ڈاکٹر موصوفہ سے جہاں تک ہو سکا انہوں نے میرے مقالے میں میری مدد کی، جہاں تک ان کے پڑھانے کا تعلق ہے ان کا پڑھانے کا طریقہ قدیم انداز کا تھا، وہ طلباء کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتی تھیں، وہ سیدھے سادھے انداز میں اپنا ٹھوس علم طلباء کے دماغوں منتقل کر دینے کی عادی تھیں، ڈاکٹر مرحومہ بغیر پوری تیاری کے کبھی کوئی کلاس نہیں لیتی تھیں۔ ان کا یہ طریقہ تھا کہ ان کو جو کچھ کلاس میں پڑھانا ہوتا تھا اس کا مطالعہ بخوبی کر لیا کرتی تھیں، اور اس بات پر خاص طور سے غور کر لیا کرتی تھیں کہ اس سبق میں طالب علم کیا کیا سوال کر سکتا ہے اور ان سوالات کے جوابات ذہن میں مرتب کر کے کلاس لینے آتی تھیں۔

ڈاکٹر موصوفہ کے سلسلے میں ان کی ایک ہمعصر اور کلاس فیلو پروفیسر شوکت نہال انصاری (سابق صدر شعبۂ فارسی ،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) فرماتی ہیں کہ ''وہ جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایم-اے کرنے کی غرض سے آئی تھیں

تبھی ان سے ملاقات ہوئی تھی اور پھر یہ سلسلہ ان کی آخری سانس تک برقرار رہا، وہ سراپا انسانیت تھیں اور گفتگو کا ایک خاص سلیقہ تھا، میں نے ان کو مختلف حیثیتوں سے عرصہ دراز تک یعنی ان کی حیات تک دیکھا مگر خوبیوں کے سوا کچھ نہ پایا، وہ ایک نیک اور ایماندار خاتون کے ساتھ ساتھ منکسرالمزاج شخصیت کی مالک تھیں، کبھی شعبے میں کسی سیاست کا حصہ نہ بنیں، چاہے کلاس ہو یا شعبے کا کوئی پروگرام (سمینار، کانفرنس) ہمیشہ مکمل پردے میں رہتی تھیں۔

پروفیسر ماریہ بلقیس (سابق صدر شعبہ فارسی وڈین فیکلٹی آف آرٹس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) کے بقول ''ڈاکٹر زہرہ مرحومہ حد درجہ شفیق، فیض رساں اور دیندار خاتون تھیں جو درس و تدریس کے فرائض کو بڑی ایمانداری سے انجام دیتی تھیں، اپنے شاگردوں سے عزیز جیسا سلوک کرتیں، سب کے ساتھ نہایت شفقت اور مہربانی سے پیش آتی تھیں، وہ کلاسیکل فارسی کی ایک بہترین استاد تھیں۔ اپنے فرصت کے اوقات میں طالب علموں کی تدریسی رہنمائی بھی کرتی تھیں، ڈاکٹر زہرہ کو شعبے نے جو طالب علم دیے تھے وہ ان کو بڑی دلچسپی کے ساتھ ریسرچ کرانے میں مصروف رہتی تھیں، وہ ایک سادہ زندگی گزارنے کی عادی تھیں، شعبے کے تمام ساتھیوں کے ساتھ ان کا حسن سلوک اچھا تھا، اپنے خاندانی وقار کو اپنی ذات سے کبھی مجروح نہ ہونے دیا۔

درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر موصوفہ کے زیر نگرانی ایک طالبہ شبیہ فاطمہ (''سہروردی سلسلۂ درویش جمالی کے عہد میں'' ۱۹۹۵ء میں) ایم۔فل (ماسٹر آف فلاسفی) اور دو طالبہ فاطمہ شریف (''زبدۃ التواریخ، مصنف نورالحق مشرقی دہلوی'' ۲۰۰۸ء) ''شاکرہ طلعت (''تصحیح و تدوین سیر العارفین حامد بن فضل اللہ درویش جمالی'' ۱۳/اکتوبر ۲۰۱۵ء) نے اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔[۶]

اب ہم ذیل میں ڈاکٹر زہرہ عرشی کے تحقیقی مقالے کا ایک تعارف پیش کر رہے ہیں مگر افسوس اس بات پر ہے کہ اتنا اہم تنقیدی متن مرتب ہونے کے باوجود ابھی تک شائع نہیں ہوا، اگر یہ مقالہ کتابی شکل میں شائع ہو کر منظر عام پر آ گیا ہوتا تو آنے والی نسلوں کے تحقیق کے لیے مشعل راہ ہوتا۔

ڈاکٹر زہرہ صاحبہ کو تنقیدی ترتیب متن کا کام دیا گیا تھا جس کو انہوں نے ترتیب متن کے اعلیٰ ترین ماہر پروفیسر نذیر احمد صاحب کی زیر نگرانی دیدہ ریزی اور بڑی ہی محنت کے ساتھ انجام دیا تھا، انہوں نے ''فرہنگ جہانگیری'' کا تنقیدی متن مرتب کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی، جس زمانے میں وہ یہ متن مرتب کر رہی تھیں، ایران سے فرہنگ جہانگیری شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی تھی جس کو ڈاکٹر رحیم عفیفی نے مرتب کیا تھا، زہرہ صاحبہ نے اس مطبوعہ متن سے بھی کام لیا اور اس کی مدد سے بھی پیش نظر تنقیدی متن مرتب کیا تھا، فرہنگ جہانگیری کے مخطوطے برٹش میوزیم اور خدا بخش لائبریری پٹنہ اور لندن میں محفوظ ہیں، برٹش کا ایک مخطوطہ اور خدا بخش لائبریری میں محفوظ مخطوطہ دونوں ہی مصنف کے عہد حیات میں

لکھے گئے تھے جس کی وجہ سے ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، اسی وجہ سے ڈاکٹر مرحومہ نے برٹش میوزیم والے مخطوطے کو اساسی مخطوطہ بنالیا تھا جو ۱۰۴۲ھ میں سعداللہ ولد شیخ فاضل کے قلم کا تحریر کردہ ہے، سعداللہ نے اس کی نقل کاکوری ضلع لکھنؤ میں کی تھی، دوسرا مخطوطہ ایسا ہے جس پر نہ تو کاتب کا نام درج ہے اور نہ ہی تاریخ کتابت، لیکن اس کے کاغذ اور روشنائی کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی کتابت گیارہویں صدی ہجری میں پوری ہوئی ہوگی۔ تیسرا مخطوطہ کرم خوردہ ہے، اس پر بھی تاریخ کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں ہے، زہر عرشی صاحبہ نے مخطوطوں کا عکس منگوا کر ایک تنقیدی متن مرتب کیا ہے، یہ تنقیدی متن پروفیسر نذیر احمد صاحب کے زیر نگرانی مرتب کیا گیا ہے، اس لیے اس کے معیاری ہونے کی یہ ایک اعلیٰ سند ہے جس کا کوئی بھی فارسی شناس انکار نہیں کرسکتا۔

اپنا یہ تنقیدی متن مرتب کرتے وقت ڈاکٹر صاحبہ نے بلا مبالغہ فارسی نظم ونثر کی سیکڑوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا، جن کی مدد سے انہوں نے متن میں درج ہوئے اشعار کی تصحیح کی ہے، تنقیدی ترتیب متن کا کام کتنا دشوار ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے کبھی یہ کام کیا ہو۔ ڈاکٹر زہرہ عرشی صاحبہ اس لحاظ سے قابل احترام اور قابل تعریف ہیں کہ انہوں نے پروفیسر نذیر احمد صاحب اور والد مولانا امتیاز علی عرشی کی توقعات کے عین مطابق ترتیب متن کا کام انجام دیا اور فارسی کی ایک اہم لغت کو صحیح ترین شکل میں محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ [۷]

ڈاکٹر شاکرہ طلعت صاحبہ کو جنہوں نے ڈاکٹر زہرہ عرشی کے زیر نگرانی اپنا تحقیقی مقالہ مرتب کر کے ۱۳/اکتوبر ۲۰۱۵ء کو زہرہ صاحبہ کے انتقال کے تقریباً دو ماہ بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی ہے، ان کو ڈاکٹر صاحبہ کے آخری وقت کی شاگردہ ہونے کا شرف حاصل ہے، ان کا بیان ہے کہ ''ڈاکٹر صاحبہ اپنے شاگردوں سے بہت گھل مل کر رہتی تھیں اور ان کے ساتھ مادرانہ سلوک روا رکھتی تھیں، کلاس کے علاوہ اگر کبھی کوئی طالب علم ان سے کچھ پڑھنے کے لیے شعبہ میں یا ان کے گھر پر ان سے ملاقات کرتا تو وہ اس کی مدد سے کبھی گریز نہیں کرتی تھیں، طبیعتاً ڈاکٹر صاحبہ ایک صالح خاتون تھیں۔ اس لیے اپنے شعبے کے ساتھیوں اور طالب علموں میں ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں، ان کی یہ روش زندگی کے آخری ایام تک برقرار تھی۔''

ڈاکٹر صاحبہ کی زبان نہایت شستہ اور شائستہ تھی۔ ثقیل الفاظ سے گریز کرتی تھیں، معمولی واقعات کو بھی وہ اس طرح لفظوں میں پرو دیتی تھیں کہ الفاظ بولتے ہوئے محسوس ہوتے تھے، مثال کے طور پر ان کا مضمون ''میرے ابا اور میں'' سے چند اقتباس پیش کر رہا ہوں، وہ اپنے والد کی شخصیت کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''وہ جتنی دیر گھر میں رہتے، گھر زعفران زار بنا رہتا۔ لطیفے سناتے، شعر وشاعری ہوتی، علمی و سنجیدہ گفتگو ہوتی، نصیحت ہوتی اور ہم بہن بھائیوں کا مختلف طریقوں سے امتحان بھی۔

نصیحت کی تلخی اور کڑواہٹ کا جتنا احساس میں نے ان میں دیکھا، اس کی مثال نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے، نہ انہیں ہر وقت نصیحت کرنا پسند تھا اور نہ اس انداز پر کہ سننے والے کی طبیعت مکدر ہو جائے، وہ انسان کو انسانیت کے معیار پر پرکھنے، اس کی خامیوں کو نظر انداز کرنے اور خوبیوں کے اعتراف کے قائل تھے۔ وہ خودستائی سے نہ کبھی کام لیتے اور نہ دوسروں کے عیوب بیان کر کے اپنی زبان کو آلودہ کرتے۔''[۸]

اسی مضمون میں آگے چل کر علی گڑھ بھیجنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''بی-اے کے بعد انہوں نے مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجا، آج مجھے احساس ہے کہ علی گڑھ بھیجنے کا مقصد تعلیم تو تھا ہی لیکن اس کے ساتھ وہ اپنی عافیت پسند بیٹی کو اس دنیا سے بھی آشنا کرانا چاہتے تھے جو اہل دانش کے نزدیک تجربہ گاہ ہے اور جس سے نبٹنے کے لیے وہ برسوں سے تیار کر رہے تھے۔ علی گڑھ جاتے ہوئے مجھے تکلیف بھی تھی اور خوف بھی۔ ابا سے پہلی بار دور جا رہی تھی، اس کی تکلیف تھی اور گھر اور باہر کے ماحول کا جو فرق تھا اس کا خوف۔ میں اپنے دل کا خدشہ اپنے ابا سے نہیں چھپا سکتی تھی، اظہار کر بیٹھی۔ ان کے الفاظ آج بھی ذہن پر ثبت ہیں: ''بیٹی! انسان اپنا ماحول خود بناتا ہے۔ تم جب تک خود نہ چاہو، تمہیں کوئی نہیں بدل سکتا۔ ہر چیز کا ایک کردار ہوتا ہے، ایک پہاڑ کا بھی، چھوٹے پتھر کا بھی اور ایک پتے کا بھی۔ پتّا معمولی ہوا کے جھونکے سے دور جا گرتا ہے، چھوٹا پتھر معمولی جھٹکے کی تاب نہیں لا پاتا اور پہاڑ طوفانوں کا مقابلہ بھی استقامت سے کرتا ہے۔ اب یہ تم پر ہے کہ تم خود میں کتنا استحکام پیدا کر سکتی ہو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے اپنے اللہ پر یقین ہے کہ وہ تمہاری مدد فرمائے گا اور مجھے اپنی بیٹی پر بھی تو اعتماد ہے۔'' (مولانا امتیاز علی عرشی: ادبی و تحقیقی کارنامے، ص ۲۵۹ تا ۲۶۰)

آگے اسی مضمون میں والد سے علی گڑھ کے تجربات کہتے ہوئے لکھتی ہیں:

''اس وقت میں بھی اپنے ابا سے اپنی کیفیت چھپا نہ سکی۔ انہیں بہت تکلیف پہنچی تھی، اس لیے کہ کندن بنانے والے وہ لوگ تھے جن سے ابا کو یہ توقع نہ تھی۔ جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ اس کی وجہ سے میری فطری صلاحیتیں بھی متاثر ہوتی جا رہی ہیں تو اس کا اثر ان کے چہرے سے ظاہر ہونے لگا، لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر ان کی شہ مل گئی تو میری قسمت میں سوائے شکست کے اور کچھ نہ لکھا جائے گا اور شکست، یہ لفظ ابا کی لغت میں نہیں تھا، چنانچہ وہ دوسرے ہی لمحے

یوں گویا ہوئے: تمہیں جن سے شکایت ہے میں ان کا شکر گزار ہوں ۔ یہ انہیں کے خلوص ومہربانی کا نتیجہ ہے کہ آج میں نے تم میں میدان میں جمے رہنے کا حوصلہ پایا ہے جو میرے لیے بہت ہی خوش آئند ہے ۔ان کے سامنے وہ تمام حالات تھے جن کے زیر اثر میں نے ابا سے یہ سب کچھ کہا تھا، لیکن حقیقت تو وہی تھی جسے ابا نے محسوس کر لیا تھا۔ غالبًا انہیں اس خواب کی تعبیر مل رہی تھی جو وہ موجِ بلا سے ہلکے تھپیڑے کھلوا کر ساحل سے نظارہ کرنے والے کو سکھانا چاہتے تھے ۔''(مولانا امتیاز علی عرشی: ادبی وتحقیقی کارنامے، ص۲۶۱)

اپنے والد مولانا امتیاز علی عرشی کی ''انتخاب عرشی'' مرتب کرتے ہوئے ابتدائیہ میں رام پور کے علم وفضل واہل کمال کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''میرے اس دعوے کی صداقت پر دلیل ہے۔ان اہل کمال وفن کے فیوض ہی کا اثر ہے کہ آج بھی اگر ایک طرف شاعری میں رامپور اسکول سے صرف نظر ممکن نہیں ہے تو دوسری طرف علماء وفضلاء کی خدمات بھی دامنِ دل کھینچ لیتی ہیں ۔ یہی ریاست رامپور ایک اور گنج گراں مایہ رضا لائبریری کی بھی امین ہے جس نے اسے نہ صرف منفرد مقام بخشا بلکہ دنیا کے نقشے پر نمایاں کر دیا ہے ۔اسی مرکز علم وادب سے ایک ایسی ہستی رونما ہوئی جس نے اس ریاست کی شاندار خدمات کو اس کے شایانِ شان وقار بخشا ہے۔میرا مقصد مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم کی ذات سے ہے۔''[۹]

انہیں چند اقتباسات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح بولتی ہوئی تحریریں ان کے مضمون میں نظر آتی ہیں۔

سبکدوشی کے بعد زہرہ عرشی صاحبہ سرسید نگر کے عذرا گارڈن کے اپنے فلیٹ میں اپنے چھوٹے بھائی طاہر عرشی کی فیملی کے ساتھ مقیم تھیں، آخری وقت میں ان کی صحت کچھ زیادہ خراب رہنے لگی تھی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے میڈیکل کالج میں کچھ دن داخل رہیں، اس کے بعد مزید علاج کے لیے ڈاکٹروں نے انہیں دہلی بھیج دیا تھا، وہاں ان کی طبیعت کچھ بہتر ہوگئی تھی تو دہلی سے واپس علی گڑھ آ گئی تھیں، مگر ان کی صحت نے ان کا ساتھ نہ دیا اور ۱۶/اگست ۲۰۱۵ء کو انہوں نے اس دنیا کو خیر باد کہا۔آپ کی نماز جنازہ آپ کے چھوٹے بھائی ممتاز عرشی صاحب نے پڑھائی۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون۔**

مأخذ وحواشی:

۱۔ بقول نجف ارشاد عرشی وطاہر عرشی۔(یہ دونوں لوگ ڈاکٹر زہرہ عرشی کے چھوٹے بھائی ہیں)

۲۔ انتخاب عرشی، مرتب: ڈاکٹر زہرہ عرشی، عرشی میموریل کمیٹی، رامپور، ۲۰۰۵ء، ص۱۳ و بقول نجف ارشاد عرشی۔

۳؎ بقول ممتاز عرشی وطاہر عرشی۔

۴؎ یہ تمام سوانحی معلومات راقم خود ان کا شاگرد تھا تو کچھ باتوں کا اسے پہلے سے علم تھا اور کچھ چیزیں اس نے ڈاکٹر زہرہ عرشی مرحومہ کے انتقال سے پہلے ان سے دریافت کر لی تھیں اور جہاں جہاں ضرورت محسوس کی وہاں وہاں میں نے ان کے بھائی ارشاد نجف عرشی ،ممتاز عرشی وطاہر عرشی سے مدد لی ہے۔

۵؎ ان کے .C.V یعنی Curriculum Vitea سے لیا ہے اور اس میں کافی حد تک میری مدد میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمد توصیف (موجودہ استاد شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)۔

۶؎ اس سلسلے میں شعبہ فارسی کے دو استاد نے ایک ڈاکٹر یاسر نوید (موجودہ استاد شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ و ایڈیٹر سہ ماہی دبیر لکھنؤ اور دوسرے ڈاکٹر محمد توصیف (موجودہ استاد شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) نے میری رہنمائی کی ہے۔

۷؎ ڈاکٹر زہرہ عرشی کا تحقیقی مقالہ جو ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔

۸؎ مولانا امتیاز علی عرشی ادبی و تحقیقی کارنامے، مرتبہ: پروفیسر نذیر احمد، عزیز پرنٹنگ پریس، نئی دہلی، دسمبر ۱۹۹۱ء، ص ۲۵۵ تا ۲۵۶۔

۹؎ انتخاب عرشی، ۲۰۰۵ء، رامپور، ص ۱۲ تا ۱۳۔

☆☆☆

سید محمد ظفر اقبال
ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہونے کو بزمِ ناز میں سب ہیں ضیاؔ نہیں

پروفیسر مولانا ضیاء احمد بدایونی کا نام محتاج تعارف نہیں۔ آپ کی تمام عمر علم وادب اور دین و مذہب کی خدمت میں بسر ہوئی۔ آپ کی ولادت بدایوں کے ایک معزز علمی وادبی گھرانے میں ۲۰ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ مطابق ۲۱ ستمبر ۱۸۹۴ء بروز جمعہ ہوئی۔ آپ کے والد کا نام مولوی رفیع احمد تھا جو وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ علمی وادبی ذوق بھی رکھتے تھے اور عالیؔ تخلص کرتے تھے۔

ضیاء صاحب نے ابتدائی تعلیم یعنی قرآن مجید اور عربی و فارسی کی ابتدائی کتب محلّہ کے مکتب میں پڑھی جس میں حافظ اشتیاق احمد درس دیا کرتے تھے اس کے بعد مدرسہ شمس العلوم بدایوں میں داخل ہوئے جہاں عربی، صرف ونحو، منطق، فلسفہ، فقہ اور حدیث وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا محبّ احمد قادری اور مولانا ابراہیم قادری قابل ذکر ہیں جنہوں نے آپ کی ذہانت اور علمی ذوق کو دیکھتے ہوئے آپ پر خصوصی توجہ فرمائی۔ ضیاء احمد بدایونی کی تعلیمی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ؛

> ''....قدیم دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم درس نظامی کے نہج پر حاصل کی اور مولانا محبّ احمد سے جو اس زمانہ میں مشہور معلم تھے عربی پڑھی، عربی اور فارسی میں اچھی استعداد حاصل کرنے کے بعد وہ انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہوئے اور غالباً ۱۹۱۶ء میں انہوں نے اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کا امتحان پاس کیا اس کے بعد بریلی کالج سے ایف۔ اے، بی۔ اے اور ایم۔ اے کیا ایم۔ اے میں ان کا مضمون فارسی تھا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد انہون نے ایل۔ ٹی کرنے کی غرض سے الہ آباد کے ٹریننگ کالج میں داخلہ لے لیا اور اگرچہ ان کا علمی ریکارڈ اب تک نہایت شاندار تھا مگر اپنے شرمیلے پن کی وجہ سے ایل۔ ٹی کے عملی امتحان میں فیل ہوگئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر زبیر احمد کی نگرانی میں انہوں نے ریسرچ شروع کی....''

(مولانا ضیاء احمد بدایونی؛ ص: ۷۸۔۷۹، آل احمد سرور مشمولہ کلیات ضیاء؛ مرتبہ: پروفیسر ظہیر احمد صدیقی)

ضیا احمد بدایونی کو شروع سے ہی شعر وادب سے خصوصی لگاؤ رہا ہے۔آپ نے اسکول کے زمانے سے ہی شاعری شروع کر دی تھی اور شعری نشستوں اور مشاعروں میں شرکت کرنے کا سلسلہ قائم ہوگیا تھا جو آخری زمانے تک جاری رہا۔آپ نے اصناف سخن میں غزل،قصیدہ،مرثیہ،نظم،سلام،نعت اور منقبت وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔آپ کی غزلیں پاکیزہ جذبات لطیف اشارات اور عارفانہ خیالات سے عبارت ہیں۔آپ کی غزلوں میں فارسیت کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔فارسی تشبیہات واستعارات کا استعمال بھی آپ نے بخوبی کیا ہے۔ غزل کے بنیادی مزاج میں داخلیت اور رمزیت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اس کے علاوہ موضوعات کے اعتبار سے عشق،فلسفہ،حکمت،تصوف اور اخلاق وغیرہ کا اظہار بھی ہمیشہ غزل میں ہوتا رہا ہے لیکن ضیاء بدایونی کے یہاں غزل کا وہ تنوع نہیں ملتا جو ان کے ہم عصر شعراء کے یہاں نظر آتا ہے لیکن جو کچھ بھی انہوں نے کہا ہے اس میں ان کا رچا ہوا مذاق موجود ہے۔تصوف سے لگاؤ نے ان کو عشقیہ شاعری میں حد سے آگے بڑھنے نہیں دیتا۔شاعری میں وہ اس نظام فکر سے وابستہ تھے جو شاعری کا رشتہ اخلاقیات سے وابستہ کرتا ہے۔ان باتوں کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

کوئی دیکھے مرے نیرنگ جنوں کے انداز — کبھی گریاں کبھی خنداں کبھی حیراں ہونا

نہ ہو دید میں قید چشم تماشا — کہ معراج ذوق نظر چاہتا ہوں

پھر ہم کہاں گر اس کی تجلی ہو بے حجاب — تھی مصلحت وہ حسن جو مستور ہوگیا

اس اوج دو روزہ پہ ہے کیوں ناز بتوں کو — جاگیر نہیں حسن خدا داد کسی کی

میں ہوں اندوہ ہے اور گوشہ تنہائی ہے — وہ ہیں اغیار ہیں اور انجمن آرائی ہے

ضیاء بدایونی کے یہاں غزلوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ غزل کے شاعر ہی نہ تھے البتہ جو غزلیں ان سے منسوب ہیں ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو غزل کے لیے مخصوص ہیں۔ضیاء بدایونی کی شاعری کا اصل رنگ ان کی نظموں میں نظر آتا ہے۔ان کے کلام کا زیادہ تر حصہ نظموں پر مشتمل ہے جس میں زیادہ تر اسلامی نظمیں شامل ہیں۔ان کی نظموں میں سادگی،روانی،تسلسل،ہمواری،واقعہ نگاری اور سیرت نگاری وغیرہ کی خوبیاں خاص طور سے نظر آتی ہیں۔صفائی زبان اور صحت بیان ان کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔شاعری میں ان کو اپنے برادر بزرگ رضی بدایونی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ضیاء بدایونی کی شعرفہمی اور علمی وادبی شوق وذوق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ؛

''... یوں تو قدرت نے آپ کو شعر گوئی اور شعرفہمی کا ذوق عطا کیا تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس ذوق پر آپ کے گھر کے ماحول نے آئینہ صیقل کا کام کیا۔آپ کے والد مولوی رفیع احمد عالی ایک

قادرالکلام اور صاحب دیوان بزرگ تھے۔ بڑے بھائی مولوی رضی احمد رضیؔ جن سے آپ کو شرف شاگردی ہے نہ صرف بدایوں بلکہ ملک کے بلند پایہ سخن گو اور سخن شناس مانے جاتے تھے اور آپ کے چھوٹے بھائی مولوی آفتاب احمد جوہرؔ کا شمار شعروادب کے ان باکمالوں میں ہوتا تھا جن کے ذوق شعر کی قسم کھائی جاسکتی ہے...''

(کلیات ضیاء؛ص،۱۶۔۱۷،مرتبہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی)

ضیاء احمد بدایونی کی زندگی کا بہتریں مشغلہ تعلیم وتعلم تھا۔اپنے شاگردوں کی مشکلات کو حل کرنے کے لیے وہ ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ان کی تمام عمر علم وادب کی خدمت میں بسر ہوئی ہے۔ پروفیسر آل احمد سروران کی علمی وادبی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ؛

''...مولانا ضیاء احمد جیسے عالم اور معلم میری نظر سے کم گذرے ہیں وہ ساری عمر پڑھتے اور پڑھاتے رہے، وہ نمود ونمائش سے کوسوں دور رہے، وضع قطع سادہ رہی، ان کا زیادہ تر وقت یا تو مطالعے میں گذرتا تھا یا ان طالب علموں کی مشکلات رفع کرنے میں جو ہر وقت ان کو گھیرے رہتے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک جب کسی شعر کا مطلب سمجھ میں نہ آتا تو مولانا ضیاء احمد سے رجوع کرتے تھے اور مولانا نے کبھی مایوس نہیں کیا...''

(مولانا ضیاء احمد بدایونی؛ص:۹۷۔آل احمد سرور،مشمولہ کلیات ضیاء؛ مرتبہ پروفیسر ظہیر احمد)

ضیاء صاحب کی شخصیت ہمہ جہت رہی ہے۔ان کے یہاں جہاں ایک طرف دینی و مذہبی امور کی فراوانی ملتی ہے وہیں دوسری جانب علمی وادبی ذوق بھی نظر آتا ہے۔شعروشاعری کے ساتھ ساتھ انہوں نے علمی وادبی موضوعات پر بھی خامہ فرسائی فرمائی ہے۔ان کی اہم تصانیف میں تجلیات،شرح دیوان مومن،شرح قصائد مومن،جلوہ حقیقت،قول سدید در خلافت معاویہ ویزید،مکتوبات،مباحث ومسائل،سمن زار،مسالک ومنازل اور صوفی اثرات (انگریزی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنہیں ملک کے علمی وادبی حلقوں میں نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اہم تصانیف کا اجمالی تعارف پیش کردیا جائے۔

مجموعہ قصائد مومن:

ضیاء احمد بدایونی کی سب سے پہلی تصنیف ''مجموعہ قصائد مومن'' ہے جو الناظر پریس لکھنؤ سے پہلی مرتبہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی۔ضیاء صاحب فارسی میں خاقانیؔ اور اردو میں مومنؔ کے قصائد سے خاص طور پر متاثر تھے۔حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک مومن کی طرف کسی نے بھی خاص توجہ نہیں کی تھی اور ان کی غزل ہی کیا کم مشکل تھی جو ان کے قصائد کی طرف

لوگ متوجہ ہوتے ۔ضیاء صاحب کا یہ احسان ہے کہ انہوں نے مومن کے تمام قصائد کی تصحیح کی اور بڑی دقت نظری سے ان کا صحیح ایڈیشن تیار کیا اور ساتھ ہی ساتھ تشریح بھی کر دی۔ضیاء صاحب خود قصائد مومن کی خصوصیات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ؛

''جس طرح مومن کی لائف میں ہم بعض نمایاں خصائص دیکھتے ہیں اس طرح ان کے کلام میں بھی چند ممتاز خصوصیات نظر آتی ہیں۔مومن سے پہلے جس قدر شعراء گذرے ہیں قصیدہ میں (بہ استثنائے سودا) مومن کا کوئی ہمسر نہیں ۔اگر چہ پختگی اور روانی میں قصائد ذوق کا درجہ کہیں ارفع ہے۔تاہم زور اور ندرت میں مومن کا جواب نہیں ہوسکتا...''

(حکیم مومن خان مومن دہلوی،مشمولہ مجموعہ قصائد مومن،ص۔ط،ی۔مرتبہ ضیاء احمد بدایونی)

تجلیات:

''تجلیات'' پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کی ان نظموں کا مجموعہ ہے جو علامہ شبلی کی تقلید میں تاریخ اسلام کے سبق آموز واقعات پر لکھی گئی ہے۔اس مجموعے سے قبل ایک مختصر مجموعہ'' تذکار سلف'' علی گڑھ سے ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا۔ جس کا' تہدیہ' علامہ شبلی کے نام کیا گیا تھا اور اس میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی' تقریب' اور مولانا عبدالسلام ندوی کا' مقدمہ' شامل تھا۔۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۵ء تک ضیاء صاحب نے جو نظمیں لکھیں انہیں اور نیز ان نظموں کو جو تذکار سلف میں چھپی تھیں ایک ساتھ تجلیات کے نام سے ۱۹۳۵ء میں شائع کرادیا اس میں کل ۳۵ نظمیں ہیں۔جن میں سے کچھ اہم نظموں کے نام اس طرح ہیں۔ الفقر وفخری، مساوات اسلامی،عہد سلف کا ایک زرین صفحہ، سیرت مرتضوی،انصار رسولؐ کا ایصار،اسباب یا مسبب الاسباب وغیرہ۔ضیاء صاحب خود اپنے التماس مشمولہ تجلیات میں تذکار سلف اور تجلیات کی نظموں کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ؛

''...ان نظموں کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ عرض کرنا نہیں ہے۔ظاہر ہے کہ ان کا اصل محرک جذبۂ عقیدت ہے جس نے الفاظ کا جامعہ پہن لیا ہے۔میری یہ کوشش رہی ہے کہ تاریخ اسلام کے اہم واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا ہے صفائی اور روانی کے ساتھ دل پذیر انداز میں بیان کردے جائیں...''

(تجلیات ص۵،مرتبہ۔ظہیر احمد صدیقی)

دیوان مومن:

ضیاء صاحب کو اردو شعراء میں حکیم مومن خان مومن سے بے پناہ عقیدت تھی جس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے

جب تصنیف وتالیف کی ابتداء کی تو سب سے پہلے مومن کا ہی انتخاب کیا اور ان کے قصائد کی شرح سپرد قلم کی۔ مومن پر ضیاء صاحب کا دوسرا سب سے اہم کام ان کے دیوان کی ترتیب وتشریح ہے۔ انہوں نے بڑی محنت اور جاں سوزی کے ساتھ اس کام کو انجام دیا ہے۔ دیوان مومن مع شرح ۱۹۳۴ء میں رام دیال اگروال کے مطبع شانتی پریس الہ آباد سے پہلی مرتبہ شائع ہوا۔

لمعات:

لمعات ضیاء احمد بدایونی کے بڑے بھائی مولانا رضی احمد رضؔی کے کلام کا انتخاب ہے جسے ضیاء صاحب نے ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ سے شائع کرایا تھا۔ اس انتخاب میں جگر مرادآبادی کا ''تعارف'' پروفیسر آل احمد سرور کی ''تقریب'' ظفر حسن بدایونی کا ''تذکرہ'' اور ضیاء صاحب کا ایک طویل ''تبصرہ'' شامل ہے۔

مباحث ومسائل:

مباحث ومسائل پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کے ادبی وتنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے جو مجلس اشاعت دہلی سے پہلی بار ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں مختلف موضوعات پر تیس (۳۰) مضامین اور دو تبصرے شامل ہیں۔ یہ تمام مضامین ہند وپاک کے موقر رسالوں میں شائع ہو چکے تھے جن کو بعد میں اس مجموعے میں یکجا کر دیا گیا۔ اس میں شامل بعض مضامین بہت اہم موضوعات پر ہیں مثلاً ابتدائی دو مضامین تصوف پر ہیں پہلے کا عنوان ''کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے'' اور دوسرے کا عنوان ''تصوف قرآن کی روشنی میں''، تیسرے مضمون کا موضوع ''فوق البشر کا تصور اسلام'' اور چوتھے کا ''فوق البشر اور مرد مومن'' ہے۔ پانچواں مضمون موجودہ اردو تغزل کی رفتار پر ہے اور چھٹے مضمون میں اردو کے مشہور نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد کے اس نقطۂ نظر کا جواب دیا گیا ہے جس کا اظہار انہوں نے اردو غزل کے لیے کیا تھا۔

جلوۂ حقیقت:

جلوۂ حقیقت ضیاء صاحب کے مذہبی مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۷۲ء میں ایجوکشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں دس (۱۰) مضامین شامل ہیں جن میں سے ابتدائی پانچ مضمون ملک کے موقر رسالوں میں شائع ہو چکے تھے بعد میں ان میں کچھ تبدیلیاں کر کے اور دوسرے مضامین جو اب تک غیر مطبوعہ تھے شامل کر کے کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ اس مجموعہ میں شامل کچھ اہم مضامین کے عنوانات اس طرح ہیں۔ عقیدہ رسالت کی ضرورت، عصمت انبیاء، عظمت حدیث، سیرت مرتضوی کی ایک جھلک خطوط کے آئینے میں، واقعۂ کربلا: منظر وپس منظر وغیرہ۔

قول سدید:

قول سدید مذہبی حیثیت سے ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ایجوکشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے

۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں اسلامی تاریخ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔خاص طور سے واقعات کربلا اور اموی دور حکومت کو لیا گیا ہے۔یہ کتاب محمود احمد عباسی کی کتاب ''خلافت معاویہ ویزید'' کی رد میں لکھی گئی تھی۔

سمن زار:

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی صرف اردو زبان ہی نہیں بلکہ فارسی کا بھی بہت پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔اگر اردو والوں کو یہ ناز ہے کہ انہوں نے اس زبان کو گراں قدر تصانیف اور اعلی تنقیدی وتحقیقی مضامین سے مالا مال کیا ہے تو فارسی والوں کو بھی اس پر فخر ہے کہ وہ بنیادی طور پر فارسی کے ہی آدمی تھے۔انہوں نے ایم۔اے فارسی میں کیا تھا اور ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۵۹ء تک پورے تیس سال کے طویل عرصے تک وہ شعبہ فارسی کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔

سمن زار دراصل فارسی شعراء کا نمائندہ انتخاب ہے جو ضیاء صاحب نے ساہتیہ اکادمی کی گزارش پر کیا۔بعد میں اکادمی نے یہ مشورہ بھی دیا کہ فارسی اشعار کے ساتھ ساتھ اردو ترجمہ بھی ہو جائے اور انہوں نے یہ کام بھی تھوڑے عرصے میں کر ڈالا۔ضیا صاحب خود اپنے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں کہ؛

> ''...مولانا ابوالکلام آزاد کے ایما پر ساہتیہ اکادیمی نئی دلی نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ شعرائے فارسی کا ایک نمائندہ انتخاب تیار کروں۔چنانچہ امتثال امر میں یہ مجموعہ مرتب کیا گیا۔بعد کو اکادیمی نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ ملک میں فارسی کا مذاق روز بروز کم ہوتا جارہا ہے صلاح دی کہ فارسی اشعار کے ساتھ اردو ترجمہ بھی ہو...''

(سمن زار؛ص ۷۔مرتب ضیاء احمد دایونی)

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا مشکل ترین امر ہے کیوں کہ جب تک مترجم کو دونوں زبانوں پر قدرت کاملہ حاصل نہ ہو اس وقت تک یہ کام ممکن نہیں۔ضیاء بدایونی چوں کہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے اس لیے انہوں نے ترجمہ کا حق ادا کر دیا۔اس انتخاب میں فارسی کے بیالیس (۴۲) منتخب شعراء کو شامل کیا گیا ہے جن میں سے کچھ کے نام اس طرح ہیں۔رودکی،فردوسی،عنصری،منوچہری،عمر خیام،انوری،خاقانی،عطار،رومی،امیر خسرو،حافظ،جامی،حزیں،صائب اور غالب وغیرہ۔

مسالک ومنازل:

مسالک ومنازل ضیاء صاحب کے فارسی ادب کے ادبی وتنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے جس میں بارہ (۱۲) مقالات شامل ہیں جن میں سے بعض بہت اہم ہیں مثلاً جدید فارسی شاعری کے رجحانات،مخطوطات شناسی،معلم اخلاق نظامی،مومن کا فارسی کلام،مولانا صہبائی وغیرہ۔جن کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ضیاء صاحب کو فارسی ادب پر کس

قدر قدرت حاصل تھی۔ وہ خود اپنے ان مضامین کے متعلق لکھتے ہیں کہ؛

''فارسی ادب (نظم ونثر) ایک بے کراں سمندر کا حکم رکھتا ہے۔ راقم نے صرف اتنا کیا ہے کہ اس سمندر کے چند قطرے فراہم کر دیے ہیں۔ جن کا مقصد ایک حد تک تشنگی رفع کرنا ہے...''

(مسالک ومنازل؛ص۱۰، ضیاءاحمد بدایونی)

مضامین کا یہ مجموعہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے پہلی بار ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کو ضیاء صاحب کی حیات میں ہی شائع ہو جانا چاہیے تھا لیکن چند نا مساعد حالات کی بنا پر یہ تاخیر سے شائع ہوا۔

مندرجہ بالا کتابوں کے مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کی شخصیت ہمہ جہت رہی ہے۔ وہ بیک وقت عالم دین، محقق، ناقد، شاعر اور ادیب تھے۔ ان کی تحریریں نہایت سلجھی ہوئی رواں دواں اور متوازن ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو ادب پر مکمل عبور حاصل ہونے کی وجہ سے ان کی تحریروں میں عربی فارسی الفاظ کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ضیاء بدایونی کی تحریروں میں ان کی رائے بڑی وقیع اور توازن سے بھرپور ہوتی ہے وہ مدلل انداز میں اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ ان کا انداز تحریر سلجھا ہوا جامع اور ٹھوس ہوتا ہے وہ اپنی بات کو پر اثر انداز میں پیش کرنے کے فن سے واقف ہیں۔ انہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی کے خزانہ ادب میں بھی بیش بہا اضافہ کیا ہے اور ان کی کاوشیں لائق تحسین وافتخار ہیں۔ اردو ادب اور خاص کر بدایوں کے توسط سے جب بھی ادب کی بات کی جائے گی تو پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کے تذکرے کے بغیر یہ گفتگو نامکمل رہے گی۔

☆☆☆

ڈاکٹر حنا اسحاق
اسٹینٹ پروفیسر (کنٹریکچویل)
ویمنس کالج، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

قطب شاہی سلاطین کے مسکوکات

جب سلطنت بہمنیہ کی قوت زائل ہونے لگی تو احمد نظام الملک اور یوسف عادل شاہ نے ۸۹۵ھ میں اپنے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور تختِ سلطنت پر قدم رکھا لیکن سلطان قلی نے جلد بازی کا مظہر انہیں کیا کیونکہ اس وقت اس کے پاس بہت ہی کم ملک کا حصّہ تھا۔ الغرض جب سلطان قلی نے قلعہ پانگل گولکنڈہ وغیرہ پر قبضہ کرلیا اور محمود شاہ بہمنی کی سلطنت میں کچھ دَم باقی نہیں رہا تو ۹۱۸ھ میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور باوجود اس قدر مختصر سلطنت کے اپنی بادشاہت قائم کی اور قطب الملک کے بجائے قطب شاہ اپنا لقب اختیار کیا۔ ایرانی بادشاہوں کے طور وطریقے اختیار برتنے لگے۔ دن میں ۵ مرتبہ شاہانِ ایران کی طرح نوبت بجواتا جبکہ احمد نگر اور کاوپل میں یہ طریقہ رائج نہ تھا۔

ہند و ایران کی تواریخ اس بات کی گواہ ہیں کہ ان دونوں ممالکت کے درمیان ہنر، ادبیات، فلسفہ اور فکر وخیال کا باہم تعلق پایا جاتا ہے اور ہزاروں سال سے ان دونوں ملکوں میں ایک قدیم تہذیب وتمدن کی روایت پائی جاتی ہے جو کہ ایک دوسرے پر اثر پزیر ہوئیں۔ فارسی زبان جو اس تہذیب وتمدن کے ذریعے ہندوستان میں داخل ہوئی اور سرکاری زبان بن گئی۔ اس زبان نے اپنا اثر مخطوطات ودستاویزات واسنادات اور کتبات وغیرہ پر بھی ڈالا۔ حتی کہ اس سے سکے بھی اثر اندوز بغیر ہوئے نہ رہ سکے۔

'قطب شاہی سلاطین کے بیشتر مسکوکات تانبے کے بنے ہوئے ہیں اور ان سکّوں کا تعلق سلطان قلی قطب شاہ سے لے کر اس عہد کے آخری حکمران ابوالحسن تانا شاہ تک ہے جبکہ ان میں سے صرف ابراہیم قطب شاہ کے سکّے ہی دستیاب نہیں ہوتے ہیں۔ سلطان قطب شاہ، جمشید قطب شاہ اور سبحان قطب شاہ کے سکوں پر ان کے القاب نام کے ساتھ کندہ کیے ہوئے ہیں جبکہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے سکّے تاریخ کے ایک اہم باب کا آغاز کرتے ہیں۔ جس میں سلطان عبداللہ قطب شاہ بادشاہ غازی لکھا ہوا ہے جبکہ اس کے بعد کے سکّوں پر ''ختم بالخیر والسعادۃ'' کندہ ہے جو بادشاہ کے نام کے بجائے ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سکّے ''انقیاد نامہ'' کے بعد کے ہیں۔ کئی قسم کے سکّے ۱۹۳۶ء کے بعد بنائے گئے۔ ان سکّوں کے دوسرے رُخ پر دارالضرب کا نام کندہ ہوتا ہے جو کہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

قطب شاہی سلاطین کا صدر مقام گولکنڈہ تھا جس کو 'محمد نگر' بھی کہا جاتا تھا۔ جمشید قطب شاہ اور سبحان قطب شاہ کے سکّوں پر 'ضرب محمد نگر گولکنڈہ' کندہ ہے جبکہ محمد قلی قطب شاہ کے سکّوں پر 'ضرب دارالسلطنت حیدرآباد کندہ ہے۔ جس سے یہ معلومات فراہم ہوتی ہے کہ ۱۵۵۵ھ میں گولکنڈہ کا نام بدل کر حیدرآباد رکھا گیا۔

تاریخ ضرب عام طور پر مسکوکات کے دوسرے رُخ پر کندہ ہوتی تھی اور عام طور پر ان سکّوں کی عبارت سادہ ہوتی تھی۔ گولکنڈہ میں رائج شدہ سکّوں کے مختلف نام تھے۔ مثلاً ''ہن (Hun)'' وغیرہ لیکن ان پر ان کی قیمت کندہ نہیں ہوتی تھی۔

اس کے علاوہ محمد قلی قطب شاہ کے بعض سکّے ۱۵۸۳ء میں کندہ ہوئے ہیں۔ ان کے اگلے رُخ پر ایک شعر بھی کندہ ہے اور پچھلے رُخ پر بادشاہ کے نام کے ساتھ تاریخ ضرب بھی کندہ ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تانبے کے سکّوں پر نام وجلوس کندہ کیا گیا تھا اور جو کہ خط نسخ میں بے ترتیب نقوش بنائے گئے ہیں لیکن بعض الفاظ کے کندہ کرنے میں خاص احتیاط برتی گئی ہے۔ مثلاً اللہ، محمد اور سبحان وغیرہ سکّے کے اوپری جانب لکھا گیا ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے ایک سکّے پر جو خاص نقش ہیں۔ وہ طغریٰ کی شکل میں اس کا نام کندہ ہے اور یہ طغرا نسخ اور خط توام کا آمیزہ ہے۔

قطب شاہی سکّوں پر جو عبارتیں کندہ ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے :

سلطان قلی قطب شاہ :

	اگلا رُخ	پچھلا رُخ
(۱)	سلطان قلی	علم
(۲)	سلطان جمشید قطب شاہ	ضرب محمد نگر گولکنڈہ، سنہ
(۳)	سلطان سبحان قلی قطب شاہ	x
(۴)	سلطان سبحان قلی شطب شاہ	ضرب محمد نگر گولکنڈہ

ابوالمظفر محمد قلی قطب شاہ :

(۱)	عدل محمد قلی قطب شاہ	پیوستہ بہ لعنت الٰہی
(۲)	ضرب دارالسلطنۃ گولکنڈہ ۹۹۱ھ	تغیرہ جلوس شاہی
(۳)	ابوالمظفر سلطان محمد قلی	ضرب دارالسلطنۃ حیدرآباد ۱۰۱۲ھ

ابوالمظفر سلطان محمد قطب شاہ :

(۱)	ابوالمظفر سلطان محمد قطب شاہ	ضرب دارالسلطنۃ ،شہر حیدرآباد ۱۰۲۴ھ

سلطان عبداللہ قطب شاہ :

(۱)	سلطان عبداللہ قطب شاہ	ضرب حیدرآباد
(۲)	سلطان عبداللہ بادشاہ	ضرب محمد نگر
(۳)	سلطان عبداللہ بادشاہ غازی	ضرب دارالسلطنۃ
(۴)	خاتمہ بالخیر والسعادۃ	ضرب دارالسلطنۃ ،حیدرآباد ۱۰۹۵ھ

ابوالحسن تاناشاہ :

ختم بالخیر والسعادۃ ۱۰۹۵	ضرب دارالسلطنۃ حیدرآباد

ان سکّوں سے متعلق محمد عبدالولی صاحب نے Cataloge میں تفصیل بیان کی ہے جو آندھرا پردیش ایک حکومت کی جانب سے آندھرا پردیش محکمہ آثار قدیمہ سے چھپا ہے۔

ان پانچوں ریاستوں کے ساتھ محکمہ آثار قدیمہ کے میوزیم اسٹیٹ آرکیوز کے میوزیم اور ایوان اردو کا ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کے مخزونہ ہیں اور ذاتی مخزونوں میں ہرمز صاحب اور نواب مجیب یار جنگ کے پاس بھی کچھ سکّے موجود ہیں۔

بہرحال نتیجہ کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ سکّے ہمارے عہد گزشتہ کی تاریخ کا اہم سرمایہ ہیں اور ساتھ ہی قطب شاہی سلاطین کی

معاشی، معاشرتی، سیاسی اور مذہبی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔

منابع و مآخذ:

(1) Hurmuz Coin of the Qutub Shahi Dynaisty of Golconda : General and South India numismatic circular, April 1986.

(2) The Persian Language and Literature in Golconda , Dr. Najma Siddiqua, 2011.

(3) The External Affairs Golconda with Iran , Dr. Ziyaddin Shakaib.

(۴) تاریخ گولکنڈہ، عبدالمجید صدیقی، حیدرآباد، ۱۹۴۶ء

(۵) تاریخ دکن کے چند گوشے، زیب النسا حیدر، حیدرآباد ۱۹۹۳ء

☆☆☆

پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی
صدر شعبہ فارسی
لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

بہارستان گلستان'' مصنفہ حکیم وارث علی خاں اکبرآبادی کے خطی نسخہ کا تعارف

ایران و ہند مسکن یک دودمان بدند
باشد گواہ من کتب باستان ہند
یک دین، یک تمدن و فرہنگ داشتند
ہم مردمان ایران ہم مردمان ہند

ہندوستان اور ایران کے درمیان تعلقات کی تاریخ بہت قدیم ہے، مشترک روایات و اقدار کے حامل ایشیا کے ان دونوں متمدن اور مہذب ملکوں میں ماہ وسال کی گردش کے ساتھ تہذیبی وثقافتی نیز علمی وادبی رشتوں میں مزید گرم جوشی آئی مزید برآں قرون وسطیٰ میں یہاں فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہونے کے بعد ارباب علم وفضل نے اس شیریں زبان کو اپنے جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنا کر ان روابط کو مزید تقویت بخشی یہاں تک عہد مغلیہ میں یہ ہم آہنگی اور ہم زبانی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ کر ہم دلی میں تبدیل ہوگئی، شاہان مغلیہ نے ہی نہیں بلکہ ان کے وزراء، امراء، منصب داروں اور درباریوں نے بھی فارسی زبان کی ترویج واشاعت نیز ارباب علم ودانش کی قدر ومنزلت میں جن الطاف شاہانہ اور مراحم خسروانہ کا معاملہ کیا اس سے متاثر ہوکر ایرانی سخنوران ہندوستان کو ''کعبۂ حاجات''، ''معدن سخا''، ''منبع فضل وکمال'' اور ہندوستانی سخن سنجوں اور ادب نوازوں کو'' جوہریان سخن شناس'' وغیرہ کہا، سلطنت مغلیہ کے زوال، نئے حکمرانوں کی فارسی مخالف پالیسی اور تقسیم ملک جیسے سانحات نے فارسی زبان کو بہت نقصان پہنچایا لیکن ہزاروں برس قدیم روابط جمود وتعطل کا شکار نہ ہوسکے، ہندوستانی دانشوروں اور محققین نے فارسی اور ایران شناسی کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دئے منثور ومنظوم تخلیقات، مختلف متنوں کی تدوین وتصحیح وترتیب اور کلاسیکی ادب مثلاً شاہنامہ فردوسی، مثنوی مولانا روم، تذکرۃ الاولیاء عطار، گلستان وبوستان سعدی اور دیوان حافظ شیرازی وغیرہ کے ترجموں، حواشی، شروح اور تعلیقات پر مشتمل بلا مبالغہ ہزاروں تصانیف

منظر عام پر آئیں جن کی تفصیل ہماری ادبی تاریخ میں ایک مقدس امانت کی طرح محفوظ ہے۔

سطور ذیل شبلی لائبریری دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں محفوظ گلستان سعدی' ایک متصوفانہ شرح کا تعارف پیش کیا جارہا ہے جس کی تفصیلات اس طرح ہیں:۔

''کال نمبر ادب فارسی شمارہ ۲۴۲۔عنوان: بہارستان گلستان شارح: حکیم وارث علی خاں ابن حکیم محمد بقا خاں ابن حکیم محمد وفا خان اکبرآبادی ثم 'شاہجہان آبادی' خط نستعلیق۔ تقطیع متوسط۔تعداد صفحات ۳۱۲ تعداد سطور فی صفحہ ۱۵۔کرم خوردہ، سنہ تالیف ۱۲۳۷ھ، سنہ کتابت ۱۳۴۶ھ، عناوین سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔''

شارح موصوف کے سوانحی کوائف اور دیگر تفصیلات ابھی تک دستیاب نہیں ہوسکی ہیں لیکن داخلی شہادت سے ان کے والد اور دادا کے ناموں کا پتہ چلتا ہے، سلسلہ عالیہ قادریہ کے شیخ حضرت سید علی قادری سے ان کی عقیدت مندی اور بہ ظن غالب ارادت کا بھی اندازہ ہوتا ہے، مشرباوہ وحدت الوجود کے قایل نظر آتے ہیں، کیونکہ شرح میں اس نظریہ کے مؤید وترجمان مشائخ کی تصانیف کے اقتسابات کثرت سے نظر آئے ان میں حضرت شیخ ابن عربیؒ کی فتوحات مکیہ وفصوص الحکم، عوارف المعارف، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ (۶۳۲ھ) ''مناظر انّص الخواص'' مصنفہ حجرت شیخ محبّ اللہ الہ آبادی (م ۱۰۵۸ھ!۱۶۴۸ء) حجرت شیخ نجم الدین کبریٰ (م ۶۱۸ھ) اور شیخ رضی الدین عبدالغفور لاری (م ۹۱۲ھ) شاگرد حجرت عبدالرحمان جامیؒ وغیرہ کی تحریریں خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ اطلاع بھی فراہم ہوتی ہے کہ انہوں نے ''تفسیر الاسرار'' کے نام سے مثنوی مولانا رومؒ کی ایک شرح بھی تحریر کی تھی، اس شرح میں اصطلاحات تصوف مثلاً وحدت وجود، الوہیت، عارف، مراقبہ المراقبہ، شہود، تجلی ذات، توکل، تمکین، تعین، فنا، بقا تفرقہ، جمعیت، سلوک، سالک، مجذوب، قناوعت اور اہل اختصاص وغیرہ کا بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔شرح میں عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی سے دامن بچاتے ہوئے عام فہم اور سادہ زبان استعمال کی گئی ہے تاکہ معمولی فارسی خواں اسے آسانی سے سمجھ سکے۔ایجاز واختصار اس کی نمایاں خصوصیت ہے ابتدائی سطور ملاحظہ ہوں:

''بنام آنکہ اونامی ندارد، بہرنامی کہ خوانی سربرآرد است ھوالاول والآخر والظاہر والباطن گلستان این جہان وبوستان آں جہان کنایہ از جلوہ ھای اوست:

قلزم کائنات و ہر چہ دروست
جوش بے تابی حقیقت اوست

از جہان وجوب تا امکان
ہر کہ اندیش از خفا و نہاں
او بہار ست این جہان رنگش
اوست قانون جملہ آہنگش

درود برسید المرسلین کہ مظہر اتم وخاتم النبوت است۔'' (۱)

وجہ تالیف میں لکھتے ہیں کہ:

''اما بعد می گوید بندہ مفتقر درگاہ لم یزلی وارث علی ابن حکیم محمد بقا خان ابن حکیم محمد وفا خان غفر اللہ لی ولہم اکبرآبادی ثم الشاہجہان آبادی کہ بندہ را از ملازمت صحبت با برکت اربدۃ المتاخرین حضرت سید علی قادری خلیفہ مقتدای زماں واقف اسرار خفی وجلی حضرت سید فتح علی الرضوی الگرویزی شوق مطالعہ کتب تصوف است چنانچہ درین ولا بنوشفق شرح مثنوی مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمہ کہ مسمیٰ بہ ''تفسیر الاسرار'' است مشغول بودم اتفاق بخیال گذشت کہ کتاب'' گلستان'' کہ تصنیف حضرت مصلح الدین سعدی شیرازی است مشتمل بر نصائح ونکات غریبہ واسرار توحید وشروح بسیار دارد مثل شرح میر نور اللہ قدس سرہ، وشیخ عبد الرسول وسراج الدین علی خان آرزو وغیرہ ہم ازان جملہ شرح عارف با اللہ شاہ ولی محمد اکبر آبادی علیہ الرحمۃ نہایت خوب است لیکن بہ سبب طول مردمان از مطالعہ آں کلال دارند شرحی مختصر کہ اکثر از شرح صاحب است مقدم نماید چنانچہ در سنہ یکہزار دوصدسی وہفت ہجری (۱۱۳۷ھ) صلی اللہ علیہ وسلم درین ایام کہ بموجب حکم حضور مہاراجہ عالیجاہ دولت راوسندیہ (کذا) بہادر دام اقبالہ، از چندی اتفاق ماندن بلدہ شیوپوری شدہ بود چون فرصت وقت بود نوشتہ شد واین کتاب رابہ ''بہارستان گلستان'' موسوم ساختم۔'' (۲)

آخری سطور اس طرح ہیں:

''شرح نسخہ گلستان حکیم وارث علی خاں بپاس خاطر صاحب حلم وحیا ارباب فہم وذکا سعادت ولیاقت پناہ شیخ انعام اللہ بتاریخ ششم شہر شوال بمقام کچہری انباہ (کذا) باتمام رسید۔''

گلستان کے باب دوم ''در اخلاق درویشان'' میں اخلاق کی تشریح ملاحظہ ہو:

''اخلاق جمع کہ بضم و بضمتین بمعنیٰ خوی و عادت و مروت و دین است اینجا بمعنیٰ خوی و عادست و صاحب ترجمہ عوارف در باب ہشتم می فرماید کہ خلق عبارت از نیتی راسخ در نفس کہ مبدء صدور افعال خیر با شر گردد بسہولیت و مبادی افعال خیر را اخلاق حسنہ و مبادی افعال شر را سیئہ خوانند و منشاء اخلاق حسنہ با طہارت در اصل جبلّت طہارت طبیعت داشتہ باشد واز مبدء طفولیت آثار حسن خلق از صدق و امانت و ایثار و شفقت و غیر آن ظاہر بودو ہر روز در تزاید بودو تاثیر این مستند بود بمجموع یا بعض از ین خیر ہا طہارت نطفہ مادر و پدر و غذا و شیر و حسن اخلاق مرضعہ و اما حسن عادت پس نفس بواسطہ حسن تربیت و ملازمت صحبت اختیار بنقوش آثار خیر منقش گردد و بواسطہ تکرار مشاہدہ مرتسم و راسخ شود۔'' (۳)

باب اول ''در سیرت پادشاہان'' کی پہلی حکایت کے مشہور فقرے ''دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز'' کی شرح یوں کی ہے:

''بکسر آزمایش نزد اہل اختصاص کہ جامع نظر و کشف باشند، صدق حسن است و کذب قبح لیکن بعضی اثر صدق قبیح باشد و اثر کذب حسن و بنی بر آنست کہ حسن و قبح نزد ایشان ذاتی است نہ کہ شرعی و معتقد اخص الخواص کہ مدار ایشان بر کشف است و نظر در معلومات ایشان دخل ندارد آنست کہ صدق در جائے حسن است و دو جائے قبح و این مبنی بر آنست کہ حسن و قبح نزد ایشان شرعی است نہ ذاتی و عقلی شیخ اکبر در خصوص کہ جز عقاید اخص الخواص دران مذکور نیست می فرماید و نیز شیخ در فتوحات می فرمایند پس از خردمندان و این قول مراد اخص الخواص اند نہ اہل اختصاص زیرا کہ دروغ مصلحت آمیز بہ فرمودہ انداثر آن را ازیں جابعزیز تو توہم نہ کنی کہ برائے اندک مصلحت دروغ باید گفت بلکہ در محلی کہ کسی بہ دروغ گفتن تو از قتل نجات یا بد یا از بلای عظیم خلوص شود چنانکہ وزیر درین جا کرد و آن بیچارہ را از کشتن خلاص داد۔'' (۴)

''بہارستان گلستان'' میں شارح نے متعدد مقامات پر میر صاحب می فرمایند، سید صاحب می فرمایند، شاہ صاحب می فرمایند، سید الشارح می فرمایند، اور عبدالرسول صاحب صاحب می فرمایند جیسے فقرے بھی استعمال کئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتب تصوف کے علاوہ گلستان کی دیگر شرحیں ان کے پیش نظر رہی تھیں۔

شارح موصوف نے گلستان میں جن مقامات یا شہروں کا ذکر آیا ہے ان کی وضاحت بھی کر دی ہے مثلاً

''طالقان'' کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :۔

''طالقان نام شہر یست میان بلخ ومرو وشہریست میان قزوین وا بہر در بعضی نسخہ بجای طالقان بیلقان بکہ بای موحدہ وسکون یای فارسی نام شہر یست ۔'' (۵)

باب ہشتم ''درآداب صحبت'' کی پہلی حکمت کے جزو'' آنکہ خورد وکشت'' پر بات ختم کی جاتی ہے۔'' آنکہ خورد وکشت ،یعنی ہم برخود صرف کرد وہم للہ برفقراء انفاق نمود ودر لفظ کشت اشارتست کہ چنانکہ کشتن موجب ازویاد غلہ است ہم چنین انفاق للہ سبب اتفاق آنست ۔'' (۶)

درس اخلاق پر مبنی گلستان سعدی کی یہ متصوفانہ شرح ایسی شراب دوآتشہ ہے جس میں صہبائے پند و موعظت واخلاق ونصیحت کی کمیت اور بادۂ تصوف وسلوک ومعرفت وحقیقت کی کیفیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

حواشی:۔

(۱) بہارستان گلستان ورق (۱،ب،۲،الف)
(۲) ایضا
(۳) ایضاورق (۵۵،ب،۵۶الف)
(۴) ایضاورق (۳۲ب،۳۳الف)
(۵) ایضاورق (۱۴۹ب،۱۵۰الف)
(۶) ایضاورق (۱۴۷الف)

☆☆☆

پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی
صدر شعبہ فارسی
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

شعرالعجم ایک نظر میں

شعرالعجم علامہ شبلی کی معرکتہ الآراء تحقیقی وتنقیدی تصنیف ہے یہ فارسی ادب میں تنقید کی پہلی کتاب ہے اس سے قبل فارسی ادب میں تنقید کا رواج نہیں تھا صرف شعراء کے تذکرے ملتے ہیں جن میں انکے منتخب کلام کے نمونے اور مختصر حالات زندگی لکھے جاتے تھے۔علامہ شبلی نے شعرالعجم لکھ کر فارسی ادب میں تنقید کی بنیاد ڈالی۔

شعرالعجم پانچ جلدوں پر مشتمل ہے پہلی تین جلدوں میں فارسی کے ممتاز شعراء کے حالات وکلام پر تبصرہ ہے ۔چوتھی اور پانچویں جلد میں فارسی شاعری کی تمام اصناف سخن پر مدلل بحث کی گئی ہے۔شعرالعجم کی چار جلدیں مولانا شبلی کی زندگی میں ہی شائع ہوئیں اور پانچویں جلد انکے وفات کے بعد دارالمصنفین کی طرف سے شائع ہوئی۔شعرالعجم کی تصنیف کا کام ۱۹۰۶ء میں شروع ہوا اسکے متعلق خود شبلی بحوالہ ''مولانا شبلی پر ایک نظر'' صفحہ ۳۴ پر لکھتے ہیں:

''۲، مارچ ۱۹۰۶ء کو میں اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا لیکن بیچ بیچ میں موازنہ انیس و دبیر اور الندوہ سد راہ ہوئے یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۰۷ء کی چھٹی تاریخ کو دور اول کا پہلا حصہ انجام پذیر ہوا۔''

باقی حصوں کی تالیف اور اشاعت کے متعلق سید سلیمان ندوی کی پانچوی جلد کے دیباچے کے صفحہ ۳ پر لکھتے ہیں:

''۱۹۰۸ء میں شعرالعجم کی جلد اول زیر طبع تھی دوسری اور تیسری زیر تصنیف ۱۹۰۹ء کے آخیر میں دوسری اور ۱۹۱۰ء میں تیسری جلد شائع ہوئی۔

شبلی نے جنوری ۱۹۱۰ء کے الندوہ میں مندرجہ ذیل نوٹ لکھا تھا:

''شعرالعجم کا چوتھا حصہ زیر تالیف ہے لیکن وہ اسقدر بڑھ گیا ہے کہ اسکے دو حصے کر دینے پڑے ایک حصہ مطبع میں جا چکا ہے اور چھپ رہا ہے لیکن دوسرے حصہ کو میں نے روک لیا ہے کہ مجھکو سب سے مقدم مہتم باالشان کام یعنی سیرۃ النبی کی تالیف میں مصروف ہونا چاہئے اگر یہ کام انجام پا گیا تو شعرالعجم ہوتی رہیگی اسکی کیا جلدی ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی اسی نوٹ کا حوالہ دیکر شعرالعجم جلد پنجم صفحہ ۳ پر لکھتے ہیں:

''اب یہی اوراق ممنوعہ چھ برس کے بعد دسمبر ۱۹۱۸ء میں شائع ہو رہے ہیں اور اس طرح سمجھنا چاہئے کہ شریعت حسن عشق کے یہ پانچوں صحیفہ تقریباً ۱۳، برس کے عرصہ میں بتدریج تکمیل کو پہونچے۔

شعرالعجم کی ان پانچوں جلدوں میں کیا ہے اسکی تفصیل خود علامہ شبلی کی زبانی شعرالعجم جلد اول صفحہ ۳ سے ملاحظہ ہو:

''کتاب کی اجمالی ترتیب یہ ہے کہ قدماء متوسطین اور متاخرین کے تین دور ہیں پہلا حنظلہ سے لے کر نظامی پر تمام ہوتا ہے دوسرا اسماعیل سے حابی تک تیسرا فغانی سے لیکر ابوطالب کلیم تک کلیم کے بعد شاعری شاعری نہیں رہی جیشاں گرمی بن گئی ان دوروں کے لحاظ سے کتاب تین حصوں میں منقسم ہے چوتھے حصے میں شاعری پر عام ریویو ہے اور یہی حصہ گویا کتاب کی جان ہے اور اسکی روح رواں ہے۔

علامہ شبلی نے پہلے حصہ میں تمہید اور سبب تصنیف، شعرالعجم کے مآخز اور شعراء کی حقیقت بیان کرنے کے بعد رودکی، دقیقی، عنصری، فرخی، فردوسی، اسدی طوسی، منوچہری، حکیم سنائی، عمر خیام، انوری، اور نظامی کے حالات پر تبصرہ کیا ہے۔ دوسرے حصہ خواجہ فریدالدین عطار، کمال اسماعیل، شیخ سعدی، امیر خسرو دہلوی، سلمان ساوجی، خواجہ حافظ اور ابن یمین، اور تیسرے حصہ میں فغانی شیرازی، ملک الشعراء فیضی، عرفی، نظیری نیشاپوری، طالم آملی، صائب اصفہانی، اور ابو طالب کلیم کے حالات پر مفصل اور مدلل تبصرہ ہے چوتھے اور پانچویں حصے میں جو اس سلسلے کی جان ہے اور اس کتاب کی روح ہے شاعری کی حقیقت اور ماہئیت ہے فارسی شاعری کی عام تاریخ شاعری پر تمدنی حالات اور دیگر اسباب کا اثر وغیرہ بتانے کے بعد فارسی کی رزمیہ شاعری پر ریویو ہے پانچویں حصہ میں بقیہ اصناف سخن یعنی قصیدہ، غزل، عشقیہ، صوفیانہ، فلسفانہ، اور اخلاقی شاعری پر تفریظ وتبصرہ ہے۔

جس زمانے میں علامہ شبلی شعرالعجم کی تالیف وترتیب میں مصروف تھے اسی موضوع پر ہندوستان اور یوروپ کے دو نامور مصنفین بھی مصروف کار تھے ہندوستان میں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد اور انگلستان میں پروفیسر براؤن کی۔ لٹریری ہسٹری آف پرشیا۔ مولانا آزاد کی سخندان پارس شائع ہوئی اور انگلستان سے پروفیسر براؤن کے لٹریری ہسٹری آف پرشیا لیکن علامہ شبلی کا معیار نقدان دونوں سے الگ اور افضل تھا۔

آزاد کی سخندان پارس کے بارے میں ۶، مئی ۱۹۰۷ء کے ایک خط میں شبلی لکھتے ہیں۔ (بحوالۂ مکاتیب شبلی جلد

اول صفحہ ۱۴۷)

''آزاد کا سخندان پارس حصہ دوم نکلا سبحان اللہ میرے شعرالعجم کو ہاتھ نہیں لگایا۔''

علامہ شبلی شاعری کو ذوقی اور وجدانی چیز سمجھتے ہیں انکے خیال میں شاعری کی جامع اور مانع تعریف نہیں کی جاسکتی انکے نزدیک شاعری کا منبع ادراک نہیں احساس ہے اور یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے وہ شعرالعجم جلد چہارم صفحہ ۸ پر لکھتے ہیں:

''شاعری اک آگ ہے جو خود بخود مشتعل ہوتی ہے ایک چشمہ ہے جو خود ابلتا ہے ایک برق ہے جو خود کوندتی ہے۔''

علامہ شبلی کا خیال تھا کہ جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں وہ شعر ہیں اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شبلی شاعری میں جذبات کے قائل تھے جذبات کے بغیر شاعری کا وجود نہیں ہوتا جذبات سے مراد ہنگامہ و ہیجان پیدا کرنا نہیں بلکہ جذبات میں زندگی اور جوانی بیدار کرنا ہے۔ انکے خیال میں شاعری فنون لطیفہ میں بلند اور برتر حیثیت رکھتی ہے اور وہ سرخوشی بن کر حواس پر چھا جاتی ہے شبلی محاکات کی تعریف کرتے ہوئے شعرالعجم جلد چہارم صفحہ ۸ پر لکھتے ہیں:

''محاکات کے معنی کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا ہے کہ اس شئی کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے۔''

شاعری کیلئے محاکات کی صلاحیت کا ہونا لازمی ہے اسکے لئے تخیل کی بلندی لازمی چیز ہے شاعری میں تخیل جسقدر بلند درجہ کا ہوگا اسی قدر شاعری اعلیٰ درجے کی ہوگی شعروشاعری کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے شبلی نے تشبیہ واستعارہ کی اہمیت پر زیادہ زور دیا ہے تشبیہ واستعارہ کا حسن اسکی ندرت اور جدت میں ہے اس جدت کو اسلوب وطرز ادا کیا جاتا ہے نئے انداز کے بغیر شاعری میں دلکشی نہیں پیدا ہوتی انداز واسلوب کی تعمیر میں الفاظ بڑا کام کرتے ہیں کیونکہ الفاظ کا حسن ہی شاعری کو دلکش بناتا ہے۔ شبلی کا خیال ہے کہ:

''شاعری انشاء پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی پر ہے گلستان میں جو مضامین اور خیالات ہیں ایسے اچھوتے اور نادر ہیں لیکن الفاظ میں فصاحت اور ترتیب وتناسب نے ان میں جو سحر بیدار کر دیا انہیں مضامین یا خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کیا جائے تو سارا اثر جاتا رہیگا۔
(بحوالہ دارالمصنفین کی ادبی خدمات صفحہ ۱۴۲)

علامہ شبلی نعمانی فارسی کے مشہور شاعر دقیقی کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے شعرالعجم جلد اول صفحہ ۴۲ پر لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے جس نے فارسی زباں کو عربی کی آمیزش سے پاک کر کے مستقل زبان کی حیثیت قائم کی وہ دقیقی ہی ہے اسکے سینکڑوں اشعار پڑھ جاؤ عربی کا لفظ نہیں آتا دقیقی کی بدقسمتی دیکھو کہ فخر کا تاج شہرت کے ہاتھوں نے اس سے چھیں کر فردوسی کے سر پر رکھ دیا اس نے بعض غزلیں مسلسل لکھیں ہیں اور یہ اس زمانے کے لحاظ سے بالکل نئی بات تھی جسکو لوگ نیچرل شاعری کہتے ہیں فارسی میں غالباً سب سے پہلے اس نے اسکی بنیاد قائم کی۔''

اسی طرح عنصری کے قصیدے کے متعلق شبلی شعرالعجم جلد اول صفحہ ۶۲ پر لکھتے ہیں:

''عنصری نے ترجیح شراب میں جو قصیدہ لکھا وہ اس قدر مقبول ہوا کہ تمام شعراء مابعد نے اس کی تتبع میں قصائد لکھے۔''

اسی طرح فرخی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اسکا درجہ شعرالعجم جلد اول صفحہ ۷۷ پر اس طرح متعین کرتے ہیں:

''فرخی اور قاآنی کا موازنہ کرو صاف نظر آئیگا کہ جو بات قاآنی کو ہزار برس کے بعد حاصل ہوئی فرخی کو اس وقت حاصل تھی، فرخی نے سلطان محمود کا جو مرثیہ لکھا وہ نہ صرف پر درد اور پر تاثیر ہے بلکہ اس فن کے تمام اصول اور آئین اسی سے قائم ہو سکتے ہیں۔''

اسی طرح فردوسی کے متعلق شعرالعجم جلد اول ۱۷۵ پر رقم طراز ہیں:

''اسکی قدرت زبان دیکھو ساٹھ ہزار شعر لکھ کر ڈال دئے اور عربی الفاظ اس قدر کم ہیں کہ گویا نہیں ہیں شاہنامہ اگرچہ بظاہر رزمیہ نظم معلوم ہوتی ہے لیکن تمام واقعات کے بیان میں تفصّل سے ہر قسم کے حالات آتے جاتے ہیں کہ کوئی شخص چاہے تو صرف شاہنامہ کی مدد سے اس زمانے کی تہذیب وتمدن کا پورا پتہ لگا سکتا ہے اس کو تقدس کا دعویٰ نہیں لیکن حسن وعشق کا کہیں موقع ہوتا ہے تو وہ آنکھیں نیچی کر لیتا ہے اور صرف واقعہ نگاری کے فرض کے لحاظ سے ایک سرسری غلط انداز نگاہ ڈالتا ہوا گزر جاتا ہے عام خیال ہے کہ وہ بزم اچھی نہیں لکھتا لیکن شاہنامہ میں جہاں جہاں بزم کا موقع آیا ہے شاعری کا چمن زار نظر آتا ہے شاعری کا اصل کمال واقعہ نگاری اور جزبات انسانی کا اظہار ہے ان دونوں باتوں میں وہ تمام شعراء کا پیشرو اور امام ہے۔''

اسی طرح اسدی طوسی کی شخصیت کو صرف ایک جاندار جملے میں شعرالعجم جلد اول کے صفحہ ۱۵۹ پر اس طرح مقید کرتے ہیں:

''اسدی طوسی اقلیم سخن رزم کا دوسرا تاجدار ہے۔''

اور منوچہری کی عظمت شعرالعجم جلد اول صفحہ ۱۷۵ پر اس طرح بیان کرتے ہیں:

''منوچہری شعرائے عرب کی زیادہ تر تقلید کرتا ہے وہ حلیہ نگاری منتخبات کا موجد ہے۔''

اسی طرح رباعی کے مشہور شاعر عمر خیام کے متعلق شعرالعجم جلد اول صفحہ ۲۰۶ پر لکھتے ہیں:

''یہ عجیب بات ہے کہ خیام فلسفہ میں نجوم میں فقہ میں ادب میں تاریخ میں کمال رکھتا تھا لیکن اس کے ستاروں کے ساتھ اسکا افق شہرت بالکل تاریک ہے جس چیز نے آٹھ سو برس تک اسکے نام کو زندہ رکھا وہ چند فارسی رباعیاں ہیں اور یہی اسکی شہرت کے بال و پر ہیں ان رباعیوں کے ساتھ مسلمانوں نے جس قدر اعتنا کیا اس سے ہزاروں درجے بڑھ کر یوروپ نے کیا۔''

علامہ شبلی نعمانی فارسی کے مشہور شاعر انوری کو فردوسی اور سعدی کے ہم پایہ تسلیم نہیں کرتے اسکو شعریت ہجو کا پیغمبر قرار دیتے ہوئے اسکے متعلق شعرالعجم جلد اول صفحہ ۱۴۸ پر لکھتے ہیں:

''ایران میں تین شاعر پیغمبر سخن تسلیم کیے گئے فردوسی، انوری اور سعدی لیکن اس سے بڑھ کر کیا ظلم ہوسکتا ہے کہ فردوسی اور سعدی کے پہلو میں انوری کو جگہ دی گئی وہ قصیدہ گوئی کا پیغمبر سمجھا جاتا ہے جس طرح فردوسی اور سعدی مثنوی اور غزل میں یکتا تھے لیکن قصیدہ کا جو انداز چلا آتا تھا اس پر انوری نے کچھ اضافہ نہیں کیا انوری کے پیغمبری کے ثبوت میں کوئی معجزہ موجود نہیں ہے انوری کا سرمایہ فخر ہجو ہے۔ کچھ شبہ نہیں کہ اگر ہجو گوئی کی کوئی شریعت ہوتی تو وہی اسکا پیغمبر ہوتا۔''

مثنوی کے مشہور شاعر نظامی گنجوی کے متعلق شعرالعجم جلد اول ۲۵۵ پر فرماتے ہیں:

''نظامی نے پانچ مختلف بحروں میں مثنویاں لکھیں جس کی تقلید اس وقت سے آج تک تمام بڑے بڑے شعراء کرتے آئے ہیں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ترکیبوں میں چستی اور کلام میں زور بلندی اور شان و شوکت پیدا کی انکی قوت تخیل بڑی اور زبردست ہے شعر کے سینکڑوں انواع ہیں لیکن بڑی قسمیں یہ ہیں رزمیہ، عشقیہ، فلسفیانہ، اخلاقی، جذبات انسانی کا اظہار اور مناظر کی تصویر ان میں ہر نوع کو نظامی نے لیا اور معراج ترقی تک پہنچا دیا، جذبات انسانی کی شاعری کو جس رتبہ پر نظامی نے پہنچا دیا فردوسی بھی اس خصوصیت میں اسکی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔''

شبلی صوفیانہ شاعری میں فریدالدین عطار کے مرتبے کے متعلق شعرالعجم جلد اول صفحہ ۱۰۰ پر لکھتے ہیں:

''صوفیانہ شاعری کے چار ارکان ہیں سنائی، اوحدی، مولانا روم اور فرید الدین عطار خواجہ صاحب نے تصوف کے جو خیالات ادا کئے ہیں وہ حکیم سنائی سے زیادہ دقیق نہیں لیکن زبان اس قدر صاف ہے کہ اس وصف کا گویا ان پر خاتمہ ہو گیا ہر قسم کے خیالات اس بے تکلفی، روانی اور سادگی سے ادا کرتے ہیں کہ نثر میں بھی اس سے زیادہ صاف ادا نہیں ہو سکتے اسکے ساتھ قوت تخیل بھی اعلیٰ درجے کی ہے بہت سے نئے مضامین پیدا کئے اور جو پہلے بندھ چکے تھے انکو ایسے نئے پہلو سے ادا کرتے ہیں کہ بالکل نیا مضمون معلوم ہوتا ہے۔''

فارسی کے مشہور ترین شاعر سعدی شیرازی کے متعلق علامہ شبلی نعمانی شعرالعجم جلد دوم صفحہ ۹۵ پر رقم طراز ہیں:

''وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے غزل میں زاہدوں اور واعظوں کا پردہ فاش کیا انکے بعد اگر چہ غزل میں بہت ترقی ہوئی خواجہ حافظ نے اس عمارت کو اس قدر بلند کر دیا کہ طائر خیال بھی وہاں تک نہیں پہونچ سکتا لیکن غور سے دیکھو تو اکثر مضامین اور طرز خیال کی داغ بیل شیخ نے ڈالی تھی وہ فطرتاً شاعر تھے زبان خداداد تھی ان باتوں نے مل کر ان کی غزل میں یہ اثر پیدا کیا کہ تمام ایران میں آگ لگ گئی۔''

اسی طرح امیر خسرو کے متعلق شعرالعجم جلد اول ۱۴۱ پر لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک امیر خسرو کے درجے کا جامع کمالات پیدا نہیں ہوا اور سچ پوچھو تو اس قدر گونا گوں اوصاف کے جامع ایران اور روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو چار ہی پیدا کئے۔''

فارسی غزل کے بادشاہ حافظ شیرازی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ شبلی شعرالعجم جلد دوم صفحہ ۲۱۹ پر لکھتے ہیں:

''حافظ شیرازی کو شاعری کے تمام اصناف پر قدرت حاصل تھی ان کے قصیدے بھی کم نہیں مثنوی میں جو صفائی لطافت اور زور ہے کہ نظامی اور سعدی کا دھوکہ ہوتا ہے لیکن ان کا اصلی اعجاز غزل گوئی ہے یہ عموماً مسلم ہے کہ عالم وجود میں آج تک کوئی شخص غزل میں ان کا ہمسر نہیں ہو سکا۔''

اسی طرح شعرالعجم کی تیسری جلد میں ہندوستان کے باکمال شعراء کا ذکر کرتے ہوئے عرفی شیرازی کے متعلق اپنی رائے شعرالعجم جلد سوم صفحہ ۹۷ پر اس طرح قائم کرتے ہیں:

''زور کلام جسکی ابتداء نظامی نے کی، اسکو کمال کے درجے تک پہنچا دیا اس نے سینکڑوں نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے استعارے پیدا کئے جن سے جدت اور طرفگی کے علاوہ نفس مضمون پر خاص اثر پڑا دوست اور دشمن دونوں نے اسکی مضمون آفرینی اور نازک خیالی کا اقرار کیا اس کا ہر شعر جدت کی ایک نئی مثال ہے اس کا زور طبع اور فصاحت و بلاغت اور سوز دہاں نظر آتا ہے جہاں وہ قصائد میں کوئی مسلسل مضمون ادا کرتا ہے۔''

اسی طرح نظیری کے متعلق شعرالعجم جلد سوم ۱۲۹ پر لکھتے ہیں:

''الفاظ کے تراشنے کی شریعت کا اولوالعزم پیغمبر نظیری ہے۔''

اسی طرح فارسی کے مشہور شاعر صائب کا تذکرہ شعرالعجم جلد سوم صفحہ ۱۸۱ پر کرتے ہیں:

''ایران کی شاعری رودکی سے شروع ہوئی اور مرزا صائب پر ختم ہوگئی اس کا خاص انداز تمثیل ہے تمثیل کا طریقہ پہلے بھی تھا لیکن صائب نے اس کثرت سے اسکو برتا کہ اسکی چیز ہوگئی اسکو اس نے اخلاقی مضامین کیلئے خاص کر دیا۔''

علامہ شبلی ابو طالب کلیم کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اس طرح شعرالعجم جلد چہارم صفحہ ۱۷۷ پر غور فکر کی دعوت دیتے ہیں:

''اس نے قصائد میں عرفی اور نظیری کی پیچیدہ اور مشکل بندشیں صاف کر دیں مبالغہ اور حسن تعلیل کو وسعت دی لیکن اسکے ساتھ قصیدہ کی متانت زور اور بلندگی کم ہوگئی اور غزلیت کا رنگ غالب آ گیا اس کا اصل کمال غزل گوئی ہے لیکن اس کا خاص رنگ مضمون بندی اور خیال آفرینی ہے۔''

شعرالعجم کی چوتھی جلد میں شعروشاعری کی عظمت ایران میں شاعری کیونکر پیدا ہوئی فارسی شاعری کا اثر عرب پر وغیرہ جیسے عنوانات کے علاوہ لطافت الفاظ حسن ترکیب لطافت خیال اور پھر فردوسی کے شاہنامہ پر علامہ شبلی نے بہت ہی ناقدانہ وفاضلانہ تبصرہ کیا ہے شاعری پر آب وہوا اور سرسبزی وشادابی کے جو جو خیالات رونما ہوتے ہیں ان کے متعلق علامہ شبلی شعرالعجم جلد پنجم صفحہ ا پر لکھتے ہیں:

''ملک کی آب و ہوا سرسبزی وشادابی کا اثر خیالات پر پڑتا ہے اور اس ذریعے سے انشاء پردازی اور شاعری تک پہونچتا ہے عرب جاہلیت کا کلام دیکھو تو پہاڑ صحرا جنگل بیابان دشوار گزار راستے ببولوں کے جھنڈ پہاڑی جھاڑیاں یہ چیزیں انکی شاعری کا سرمایہ ہیں لیکن یہی عرب

جب بغداد میں پہنچے تو انکا کلام چمنستان اور سنبلستان بن گیا۔''

شعرالعجم کی پانچویں جلد میں شاعری کے تمام اصناف پر مدلل تبصرہ ہے اور ہر صنف کے ارتقاء اور خصوصیات پر تبصرہ اور نقد بھی کیا ہے۔

قصیدہ کے باب میں شبلی شعرالعجم جلد پنجم صفحہ ۲ پر رقم طراز ہیں:

''جس زمانہ میں شاعری کا آغاز ہوا عرب شاعری مدحیہ قصائد پر محدود تھی اسلئے ایرانی شعراء نے بھی انہیں کی تقلید کی ہے اسکے ساتھ صلہ اور انعام کی توقع صرف قصیدہ سے ہوسکتی ہے یہ اسباب تھے کہ ایران نے سب سے پہلے قصیدہ گوئی سے ابتداء کی۔''

فارسی قصیدہ نگاری کی بنیاد چونکہ مادی نفع پر پڑی اس لئے اس سے وہ کام نہیں لیا جاسکا جو اس سے لیا جاسکتا ہے اس سلسلے میں شبلی نے بڑی خوبی سے تجزیہ شعرالعجم جلد پنجم صفحہ ۳۲ پر کیا ہے:

''قوموں کا بننا ابھرنا ان کے جذبات کا تازہ اور مشتعل ہوتے رہنا اس بات پر موقوف ہے کہ انکے اوصاف کی صحیح داد دی جائے ان کے کارنامے نمایاں اور اجاگر کئے جائیں انکا ہر کام تاریخی صفحات پر چمکا دیا جائے۔''

آگے چل کر پھر قصیدہ کی خصوصیات واضح کرتے ہوئے علامہ شبلی شعرالعجم جلد پنجم صفحہ ۳۲ پر لکھتے ہیں:

''عرب شعراء نے جن لوگوں کا ذکر قصیدہ میں کر دیا ہے ان کا نام آج تک زندہ ہے ایرانی شعراء نے اپنے ممدوحوں کی شان میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا دئے لیکن ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا۔''

شبلی نے فارسی کے مشہور قصیدہ نگاروں مثلاً انوری، ظہیر فاریابی، خاقانی، کمال اسماعیل، مختشم کاشی، سنجر کاشانی، عرفی، قدسی، مشہدی، قاآنی، غالب، وغیرہ کے قصائد پر سنجیدہ اور متوازن تبصرہ کیا ہے۔

شبلی غزل کے باب کی ابتداء شعرالعجم جلد پنجم صفحہ ۵۲ پر میں اس طرح کرتے ہیں:

''عشق ومحبت انسان کا خمیر ہے اسلئے جہاں انسان ہے عشق بھی ہے اور چونکہ کوئی قوم شاعری سے خالی نہیں اسلئے کوئی قوم عشقیہ شاعری سے خالی نہیں ہوسکتی۔''

آگے چل کر غزل اور قصیدہ کا موازنہ کرتے ہوئے شعرالعجم جلد پنجم صفحہ ۳۵ پر لکھتے ہیں:

''غزل کو ایک مدت تک قصیدہ کے مقابلے میں عروج حاصل نہ ہوسکا کیونکہ شروع میں غزل کا اصلی عنصر قصیدہ ہی تھا قصیدہ میں ممدوح کی تعریف کی جاتی ہے اور غزل میں معشوق کی

غزل کی تحریک عشق ومحبت کے جزبات سے ہوتی ہے لیکن ایران میں مدت تک جنگی جذبات کا زور رہا۔''

غزل کی ترقی کے اسباب سے بحث کرتے ہوئے شبلی شعرالعجم جلد پنجم صفحہ ۲ پر لکھتے ہیں:

''غزل کی ترقی کی تاریخ تصوف سے شروع ہوتی ہے تصوف کا تعلق تمام تر واردات اور جذبات سے ہے اور اسکی تعلیم کی پہلی ابجد عشق ومحبت ہے تصوف کی ابتداء اگر چہ تیسری صدی میں ہوئی ہے لیکن پانچوی صدی اس کے اوج شباب کا زمانہ ہے اور یہی زمانہ غزل کی ترقی کا پہلا نوروز ہے۔''

فارسی غزل کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ شبلی نے رودکی، دقیقی، سنائی، اوحدی، مراغی، عطار، روم، عراقی، سعدی، سلمان، خواجو، حافظ، فغانی نظیری، ظہوری، طالب آملی، کلیم، ناصر، اور بیدل کی غزلیہ شاعری پر بہت ہی جامع تبصرہ کیا ہے۔

شعرالعجم کی اہمیت، عظمت اور مخالفت

علامہ شبلی کا تنقیدی وتحقیقی شعور بہت نکھرا ہوا تھا عربی اردو اور فارسی ادبیات میں انہیں عبور حاصل تھا انہیں شعر و ادب سے بہت لگاؤ تھا انہوں نے تنقید کے عملی ونظری دونوں پہلوؤں کی طرف توجہ کی ان کا خاص میدان شاعری کی تنقید ہے انہوں نے شاعری کے اصولوں پر بحث کیا اصناف سخن کے اصول وضع کئے اور شاعری پر عملی تنقید بھی کی ان کی معرکتہ الآراء تنقیدی تصنیف شعرالعجم اس لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہے انکی اس تصنیف کو سامنے رکھ کر انکے انداز تنقید کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے انہوں نے اس میں جو تنقیدی نظریات پیش کئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر بصیرت افروز اور خیال انگیز بحث کی ہے وہ قابل داد ہے انکا انداز بحث منطقی اور استدلالی ہے انہوں نے جو باتیں بھی کہی ہیں دلیل کے ساتھ کہی ہیں یہی وجہ ہے کہ انکی یہ بحث مشکل، خشک اور بے مزہ نہیں ہے۔ وہ شعرالعجم کی ابتداء اس شاعرانہ اور خطیبانہ انداز سے کرتے ہیں۔

''اسلام ایک ابر تھا اور سطح خاک کے ایک ایک چپے پر برسا۔''

علامہ اقبال 'ادیب' علیگڑھ ۱۹۶۰ء کے صفحہ ۱۳۲ پر شبلی اور شعرالعجم کے متعلق لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک شبلی میں ایسی نادر صفات موجود ہیں جنہوں نے ان کو شعرالعجم کے مصنف بننے کا اہل بنایا اوّل تو انکی تاریخ دانی دوم انکی عربی دانی سوم شعر وسخن کا صحیح مذاق اور خود شاعر ہونا۔''

شعرالعجم کے متعلق مہدی افادی بحوالہ دارالمصنفین کی ادبی خدمات صفحہ۱۹۲ پر لکھتے ہیں:

''شعرالعجم تنقید عالیہ (ہائی کریٹسزم) کا بہترین نمونہ ہے بلکہ انہیں اصرار ہے کہ صرف اردو لٹریچر میں نہیں بلکہ مشرق کی کسی زبان میں اس پایہ کی تصنیف موجود نہیں اور یہ دنیا کی شیریں زبان کی جزباتی لٹریچر کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔''

شعرالعجم کی تاریخی غلطیوں اور واقعات کے عدم صحت کے بعض ناقدین نے گرفت کی ہے جس میں محمود شیرانی کا نام قابل ذکر ہے انہوں نے اپنی کتاب تنقید شعرالعجم میں شبلی کی بعض تاریخی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے لیکن کئی جگہ پر انکا قلم غیر محتاط ہو گیا ہے اور انکی تحریروں سے شبلی کی مخالفت کی بو آتی ہے پروفیسر کلیم الدین شبلی کی تنقید نگاری کے بارے میں اردو تنقید پر ایک نظر میں صفحہ ۱۰۷ پر لکھتے ہیں:

''کہنا پڑتا ہے کہ شبلی کا زاویۂ نظر شبلی کی تنقید کا ساز و سامان شبلی کا اسلوب انکی سب چیزوں میں پرانی تنقید کی صاف کارفرمائی ہے نئی تنقید کے اصول نئی تنقید کا زاویۂ نظر نئی تنقیدی تکنیک یہ سب چیزیں کہیں نہیں ملتیں۔''

ان سب تنقیدوں کے باوجود مولانا شبلی کی فضیلت علمی مسلم ہے مولانا کا اصل شاہکار شعرالعجم کا چوتھا اور پانچواں حصہ ہے اور انہیں حصوں سے مولا شبلی کی جامعیت دقت نظری بلندی مزاق فارسی زبان کے صحیح ذوق اور قوت انشاء پردازی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے ان کا اصل مقصد تذکرہ الشعراء لکھنا نہیں تھا جہاں تک محمود شیرانی اور اسلم جیراجپوری کی تنقید کا سوال ہے یہ حقیقت نا قابل تردید ہے کہ شبلی علم وادب کے جن جن میدانوں سے ایک شہ سوار کی طرح فاتحانہ انداز میں گزر جاتے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر میدانوں میں جیراجپوری اور شیرانی قدم بھی نہیں رکھ سکتے اس سلسلے میں مولانا سید سلیمان ندوی کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ شعرالعجم صحیفہ حسن وعشق ہے واقعات کی کھتونی نہیں۔

سید صباح الدین عبدالرحمان شعرالعجم کی تقدس میں اضافہ کرتے ہوئے اسکے متعلق مولانا شبلی پر ایک نظر کے صفحہ ۹۶ پر لکھتے ہیں کہ:

''یہ جلدیں اردو زبان وادب کی تو نہیں لیکن اردو زبان وادب میں تنقید نگاری کی زبور اور توریت کی حیثیت رکھتی ہیں جن کے ذریعہ سے شعرفہمی کی آیات معلوم ہونگی۔''

محمود شیرانی اپنی کڑی تنقیدوں کے باوجود شبلی اور شعرالعجم کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء کے صفحہ ۱۵ پر لکھتے ہیں کہ:

''علامہ شبلی زمانہ حال کے ان چند مستند فاضل میں سے ہیں جن کا وجود مسلمانوں کیلئے

ہمیشہ مایۂ ناز رہیگا انکی متعدد تصانیف نے آسمان علم پر ان کو آفتاب بن کر چمکایا اب تک فارسی اور اردو میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں شعرالعجم ان میں بغیر کسی استنباد کے بہترین تالیف مانی جاسکتی ہے۔''

☆☆☆

ISSN: 2394-5567 **S. No. 19**

بخواندم یکی مرد هندی دبیر سخن گوی و گوینده و یادگیر
(فردوسی)

DABEER

(An International Peer Reviewed Refereed Quarterly Literary Research Journal for Persian Literature)

VOLUME: VII ISSUE: I & II

January- June 2020

Editor

Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Address:

Dabeer Hasan Memorial Library

12, Choudhri Mohalla, Kakori,Lucknow,

U.P.-226101 (INDIA)

Email: dabeerpersian@rediffmail.com

Review Committee

Prof. Azarmi Dukht Safavi, Aligarh

Prof. Shareef Hussain Qasmi, Delhi

Professor Abdul Qadir Jafery, Allahabad

Prof. Masood Anwar Alvi Kakorvi, Aligarh

Prof. Umar Kamaluddin Kakorvi, Lucknow

Prof. Tahira Waheed Abbasi, Bhopal

Prof. Mazhar Asif, New Delhi

Editorial Board

Prof. Syed Hasan Abbas, Director Rampur Reza Library, Rampur

Prof. S. M. Asad Ali Khurshid, Director IPR, AMU, Aligarh

Prof. Aleem Ashraf Khan, HOD Persian, DU, Delhi

Prof. Syed Mohammad Asghar, Chairman, Deptt. Of Persian, AMU

Pro. Shahid Naukhez Azmi, HOD Persian, MANUU, Hyderabad

Dr. Mohammad Aquil, HOD Persian, BHU, Varanasi

Dr. Iftikhar Ahmad, HOD Persian, Maulana Azad College, Calcutta

Dr. Mohammad Qamar Alam, Aligarh Muslim University, Aligarh

Dr. Anjuman Bano Siddiqui, Deptt. Of Persian, Karamat College, Lucknow

Co-Editor

Dr. Mohammad Tauseef Khan Kaker

Assistant Professor, Department of Persian, Aligarh Muslim University, Aligarh

Atifa Jamal

Research Scholar, Department of Persian, Lucknow University, Lucknow

Prof. Abdul Qadir Jafari
Ex. Head, Department of Arabic & Persian
Allahabad University
Allahabad

MIRZA MUHAMMAD FAKHIR MAKIN LAKHNAWAI
A PERSIAN POET OF REPUTE

In a politically declining where the tradition of patronising knowledge and art wads fast disappearing and the assemblies of the poets had become desolate and poetry had got synonymous with merely writing of non sensical lines and with expression of light emotion in such an undesirable and shameful society, the rise of a poet where popularity reached Iran from India and whose poetry wad regarded with much respect and honor by the great people of the language. Is really mysteries. Acceptance and recognition of Mirza Mohammad Fakhir Makin erudition about the language and his ability as a seasoned patran of art are found in all the reliable narrative. Narrators have also written that the story of Makeen's poetry was not only popular in India but its echo was heard in Iran also. It meant that Makin's poetry was of the level from the Qtauderds of thanking and art the great people of the language would drive taste and pleasure out if it and by virtue of it name was included in the list of Persian poets on an important place.

There are varied aspects of Fakhir Main's importance in Persian poetry. The first and the foremost thing in his poetry which engages the attention of the man with Keen misight that he picturises the internal life of a poet in poetic colour. We can know different political, historical and social conditions as well as important incidents of that period from his works. We find great variety in the poetic subject of Makin with the help of which we can easily know the axis of thinking of the general poets of that period. There are amatory subjects, moral and philosophical ideas and power of the thoughts which came forth in a highly conspicuous manner. He has produced such sensitive and tasteful aspects in his thoughts and virtues of his powerful brain. He has

also bestowed upon with the power of invention along with the force of thought and ideas. He was not only employed novelties in thoughts and the subjects but has effected such novel embellishment and ornamentation in the language and the description as one is left with no option but to approve of his erudition about the language also.

Besides the use of Persian idioms, he has blended Arabic and Hindi words in such a way, his given forms to newer and newer words in such a style and has employed immoveable definition with such a nicety as all of them have the position of invaluable addition in Persian language specially in poetry.

There is one more slandered for judging in his work. It is seem as to how much words a poet has used in his work and has popularized them in what good a manner and sincerity of their usage. Being judged by this standard also, Makin's position appears high. The abundance of the words used by him in his works are nit found in the works of his contemporary poets except Sauda. Sauda was an important opponent of Fakhir Makin. He was associated with the court of Asifuddaulah. Both of them wee among the close to Nawab because of their scholarly greatness and poetic wisdom. There was always poetic hostility between them.

Makin enriched his poetry with national and international subjects and allegories and for their embellishment he employed correct usage of the words and meanings and novel description and pointed towards many new ways through the use of strange and bizzare points and subtleties in poems, Makin kept using his poetic power more or less sixty years and spent at least forty such years as in which the gently as well as the ordinary people got convinced of his great wisdom, erudition and scholarly skills. During that long period, the number of the disciples of Makin increased so greatly that their mention is found every where in the narratives of that period. Among them such disciples were in greater number as had their own collected works and were reckoned among the important poets of that period. The disciples of Makin did not belong to a particular place, religion and nationality, rather they were the poets of the different countries and they would came from different cities to consult him in regards with the reform of their poetic lines. His disciples dispersed and diffused the poetic colour of Makin in the whole of the country. His disciples went to the for off place and left the

effects of their poetry there. Thus was carried the voice of Persian poetry to dislant place and Makin's wisdom, erudition and scholarly skills were responsible for it. Hence, by producing disciples in so great a number, he strengthened the root of the fame and popularity of Persian poetry even in that declining and deteriorating society which became the subject of discussion not only in India but in Iran as well. Makin left the effects of his poetic colour over the Persian poets after him also and those poets remembered Makin in a specific and special manner.

Makin's effect on same of the poet was extraordinary. So, we see that the Persian poets of Lucknow lend to Makin for the artistic ornamentation of them poetry and imitate his poetic style in most of the matters. This was the discussion on the effects of Makin with reference to the Persian poetry of Lucknow. On the other hand, if we examine the Persian poetry of Delhi, we find that even there he produced such famous disciples who made the characteristics of Makin's poetry their objective in poetic accomplishments. Makin's poetry on his Iranian contemporaries is also conspicuous. A comparative study of their works clearly reveals in them the characteristic style of Makin's accomplishment. The summary of all there discussion is that Makin left his effect over the poets of both Lucknow and Delhi and got them convinced of his great wisdom as a patron of art and of his artistic status.

Fakhir Makin was a great poet of his period from the stand points of clarity and raciness of the language and casiness of the style of description, he was a cut above the rest of his contemporaries. In his poetic journey, Makeen had made Mirza Azima Ikzir Isfahani his guide and patron who himself would be reckoned among the wise and old poets of his time and as a patron poet, he would be the subject of discussion not only in India but in Asfahan and Iran as well, Makin got benefitted from Iksir in the way that an intelligent disciple stand get from an erudite patron and reached the status that the poets in great multitude from Lucknow and the areas around it without discrimination of religion and country would come to him with the sole intention of getting benefitted by him in the art of poetry would be fully benefitted by his thoughts in artistic subtleties and literary sensitivities. The critical writing of the narrators of that period unambiguous evidence that in the declining period of the thirteenth century A.H. When the lovers of the Persian poetry and literature had been faced with highly disappointing

conditions and the Persian poetry had been progressively loosing its former position due to the unfavorable circumstances, Fakhir Makkin emerged as a skilled and capable poet on the literary firmament and succeeded establishing his poetic superiority.

Makkin was one of the desciples closest to Iksir. Due to his proximity to Iksir, Makin Kept the high standards of Persian poetry and made additions to its greatness. Besides, Iksir Makin enjoyed specific relation ship with great Persian poet like Shaikh Ali Hazin, Shamsuddin Fakhir and Nurul Ain Waqif etc. These poets helped much in the culture and progress of the poetic standard and taste of Makin. The reflection of this reality is seem everywhere in Makin's poetry. Besides, there among the poet of the yore, Faizi, Hafiz Shirazi, Naziri and Amir Khusrau etc. He has at places in initiated these poets and by composing poetic lines in their styles, he has expressed his love for those poets. By composing Tarji'band on the ghazal of Faizi, splendid ghazal in the style of Khusrau and Mukhammasat on the ghazals of Hafiz, Hazin and Naziri. Makin has presented clear evidence of the hight of his lofty thoughts and greatness of his poetic virtues and wisdom. In most of ghazals of his Diwan Makin has shown clear signs of the solidity of his thoughts and ideas as well as of his artistic cleverness. Clarity and raciness of the language and plainliness of the style of description are additional qualities to there. There is no doubt that the field of the poetry of Makin is to represent the internal feelings and emotions of man as well as the reflection of his individualistic emotional states.

In addition to these, since he had concern for humanism and human values, his verses became instrumental in awaking social consciousness. Because of this consciousness Makin felt compelled and constrained to present the unfavorable state of the political and social conditions of his period. His poetic lines represent those conditions with great nicely. In his poetic lines, the feeling for the fundamental rights of human life is very intense.

The basic elements of Makin's poetry are Ghazal and Tasauwuf. There is variety of subjects in his ghazals and if we go by the subjects dealt with, they appear vast. But despite such a variety of subjects and the essays, he did not discard the art of ghazal. This is one of the great virtues of Makin's poetry. Similarly, through the blend of Tasawwuf in ghazal, he has rendered the field of ghazla vast and by presenting the basic

realities of tasawwuf in the style of ghazal, he has imbued tasawwuf with the taste and flavor of ghazal. As for the mathnavis of Makin are concerned, the tone of the amatory mathnavis among them is at a lower pitch and sweet. The feeling and emotions expressed in his manqabatiyah mathnavis for Hazrat Ali and Ahl-e-Bait deserve attention. The beginning of the mathnavi has been done with salam and then it has been filled up with the flowers of great faith.

A study of Fakhir Makin's personality and his poetry clearly reveals that he possessed a highly respectable and virtuous personality in a declining and deteriorating society with reference to his Persian works. His Diwan has embellished the field of Persian poetry with the invaluable treasure of thinking and art. Additionally, the need has been felt with great intensity that Makin's Diwan be formally compiled so that the people of the tate of literature could be benefitted by the latest wisdom and virtues of Persian poetry. The fact that Makin not only composed poetic lines but carried out his responsibilities of a patron and teacher with great care and concern. In Makin's period, agreat number of the poets in Lucknow would be seem keeping this poetic journey on under his patronage. It was not only in Lucknow but in the area around it also that there was a considerable number of the regional poets who were the desciples of Makin. Since Makin was an expert of ariz and qafiyah also, specific head and attention were paid in his works on the health of the words. There were many poets among his desciples who would earlier consult same one else the reform their poetic lines but with the rise of influence of Makin in Lucknow, they came under his guidance. This change is leaning bears much importance in it. It on the one hand, establishes the poetic greatness of Fakhir Makin while on the other, it also becomes worthy of attention that Fakhir Makin appears distinguished and honored in the row of his contemporary patron poets because of his scholarly superiority. Makin was also prose writer of repute. Some verses for example are given below:

دلبر نگاہ می کند و می کشد مرا

دل ضبط آہ می کند و می کشد مرا

ای روی تو آیینہ جمال بصری مرا

حیران رخت دیدہ حور و چہ پری را

از دلم ہوش و ز سر عقل و ز پا زور گفت
ہر چہ من داشتم آن ساقی مخمور گرفت

ہم زبان گفت بمن یار زبانی دارد
این سخن گر چہ یقین ہشت گمانی دارد

جانان ز مکین این ہمہ آزردہ شو
آزردہ ازین خستہ قسم خوردہ شو

از راہ کرم آنجا نمودی قدمی
ای صاحب من بندہ نوزی کردی

ناصح از گریہ مکن منع کہ من مقدورم
اشک بر چشم ترم حکم روانی دارد
این توی تو کہ ز دل سوزی ما عار کنی
ورنہ ہر دشمن جان سوختہ جانی دارد
رو بہ ہر در مکن ای خانہ بر انداز نشین
گرچہ تنگ است مکین تیز مکانی دارد

بہ ہر سو جلوہ معشوق ما را در نظر آید
بچشم عاشقان در عین پنہانی شود پیدا
ازین بی دست و پای عاجزم لیکن نمی خواہم
کہ محتاج کسی جز خودکشی در مانده خود را

رقیبان گوش بر آواز از در ناز من ترسان

سخن گفتن چہ مشکل بود شب جاییکہ من بودم

مکین بی تاب و من بیخواب و دل در اضطراب از غم

مپرس از من چہ محفل بود شب جاییکہ من بودم

با او سر ہم خانگی باشد مکین دیوانگی

آخر بہ این فرزانگی بی اختیاری تا بکی

لخت دل می خورم و خون جگر می نوشم

نیست در خوان فلک ما حضر بہتر ازین

در نظر چشم تو خون ریزی مردم دارد

چشم بددور نہ باشد نظری بہتر ازین

می خورم سنگ حوادث بہ چپ و راست و مگر

نخل امید نہ دارد ثمری بہتر ازین

To be brief, the discussion regarding the personality and art of Fakhir Makin concludes on the point that the compilation and proper ordering of the works of Makin be done in order of bring forth the latent aspect of the thinking of Makin and then the scope for detailed discussion and examination on these be explored. After all the, works of Makin are the invaluable treasure of Persian poetry which demands that the great men of knowledge and wisdom ascertain the value of Makin's Persian poetry by discussing its artistic beauty and virtues. It will not only be the approval of Makin's services to Persian literature but will be an honourable edition to Persian language and literature produced in Awadh and specially in Lucknow.

Dr. Atiqur Rahman,
Asstt. Professor of Persian
Dept. of Arabic, Persian, Urdu & Islamic Studies,
Bhasha-Bhavana, Visva-Bharati, (A Central University)
Santiniketan-731235, West Bengal

Contribution of Sufis and Development of Sufistic thoughts in Indian sub-continent with special Reference to Deccan India

Abstract: *Sufi philosophy includes the schools of thought unique to Sufism, a mystical branch within Islam. Sufism and its philosophical traditions may be associated with both Sunni Islam and Shia Islam. It has been suggested that Sufi thought emerged from the Middle East in the eighth century, but adherents are now found around the world.*

Perhaps the most notable one was the great theologian and philosopher Al Gazalli who lived in Iran around 1100 AD. His famous treatises, called the "Reconstruction of Religious Sciences," the "Alchemy of Happiness," and other works; set off to convince the Islamic world that Sufism and its teachings originated from the Qur'an and were compatible with mainstream Islamic thought and theology. It was Al-Gazali who bridged the gap between traditional and mystical Islam. It was around 1000 AD that the early Sufi literature, in the form of manuals, treatises, discourses, and poetry, became the source of Sufi thinking and meditations. Others were founded in different parts of the Islamic world by Sufi-masters such as Jalaluddin Rumi and Abdur Rahman Jami in Iran, and Muinuddin Chishti and Nizamuddin Aulia in India.

The massive geographic presence of Islam in India can be explained by the tireless activity of Sufi preachers. Sufism had left a prevailing impact on religious, cultural and social life in South Asia. The introduction of the mystical form of Islam was done by Sufi saints. Sufi scholars travelling from all over continental Asia were instrumental in the social, economic, and philosophic development of India. Besides preaching in major cities and centres of intellectual thought, Sufis reached out to poor and marginalized rural communities and preached in local dialects such as Urdu, Sindhi,

Panjabi versus, Persian, Turkish, and Arabic. Sufism emerged as a "moral and comprehensive socio-religious force" that even influenced other religious traditions such as Hinduism. Their traditions of devotional practices and modest living attracted all people. Their teachings of humanity, love for God and Prophet continue to be surrounded by mystical tales and folk songs today. Sufis were firm in abstaining from religious and communal conflict and strived to be peaceful elements of civil society. Furthermore, it is the attitude of accommodation, adaptation, piety, and charisma that continues to help Sufism remain as a pillar of mystical Islam in India.

Keywords: *Sufism, Sufi Thinkers, Persian Sufi Poetry, Contribution of Sufis, Important Sufistic Books, Sufistic literature in Deccan & Impact of Sufism.*

Introduction:

Sufism (Arabic: تصوّف *taṣawwuf*, Persian*:* صوفی‌گری *sufigari*, *tasavvuf*, Urdu: تصوف) is generally understood to be the inner, mystical dimension of Islam. A practitioner of this tradition is generally known as a ***ṣūfī*** ***(صُوفی)***, though some adherents of the tradition reserve this term only for those practitioners who have attained the goals of the Sufi tradition. Another name used for a Sufi seeker is dervish.

Sufi Thinkers: The Sharia-guided mystic influence of Sufis produced the Muslim thinkers like Shaikh Ahmad Sirhindi, Shah Wali Ullah, Sayied Ahmad Barelavi, Karamat Ali, Sir Sayed Ahmad Khan, Allama Iqbal and Maulana Maududi. They used the mystic philosophy befitting to the political exigencies of the time for revival of political supremacy of Islam. Of them the Sufis like Sirhindi and Wali Ullah, who politicised the mystic ideology for political domination of Islam. They were projected as Islamic reformists for purifying Islam from any extraneous influences. They conveyed the political aspect of Islam to Muslim masses so aggressively that it created a permanent imprint on their psyche. It is therefore said that the Sufi Islamists saved the Islam but failed to save the downfall of Mughal Empire.

The mission of Shaikh Sirhindi popularly known as Mujaddid was to purify Islam from the influence of Akbar with a view to counter his policy of "the Hindu wielding the sword of Islam" and "Peace with all". Unhappy with the regime of Emperor Akbar for withdrawal of Jezia tax imposed on the Hindus, Sirhindi made hectic effort to purge Islam of all

extraneous influences. He viewed Hindu mystics like Guru Nanak and Sant Kabir contemptible, as they did not follow Sharia.

With contempt against old schools of mysticism for tolerance, Sirhindi condemned the reign of Akbar for his 'broadmindedness' and policy of 'peace with all'. Propagating against the contemporary socio-cultural situation Sirhindi, felt that the attitude of Akbar "sullied the purity of Islam and the political social and cultural life of Muslims"[1]. During the closing years of Akbar reign; when his son Salim had revolted against him, Sirhindi spread the virus of communalism with some success "in the beginning of Jehangir's reign". He strongly criticised freedom of worship granted to the Hindus. Hate-Hindu syndrome was so deep in him that "death of Akbar (1605) filled Shaikh Ahmad with hopes that the pristine purity of Islam would be implanted in India"[2]. "Misguided and greedy Ulama, he (Sirhindi) believed, were responsible for the alleged downfall of Islam in Akbar's regime".[3]

With his strong contempt against Shia and the Hindus, Sirhind wrote several letters to the nobles in the court of Jehangir for guiding the emperor on the path of Shariat, and for removal of Qafirs (Shias and Hindus) from the administration. He was dead against any honourable status of Hindus in Islamic government. Sirhind wanted the religious freedom enjoyed by the Hindus during Akbar regime to be curbed. Enraged with his too much interference in administration, Jehangir imprisoned him in Gwalier[4] but released him after one year. Sirhind not only "injected communal virus into the body politic of the country but also generated hatred, mutual distrust and discord among the various sections of Muslims"[5]. Despite this anti-Hindu tirade of Sirhindi, Maulana Abul Kalam Azad in 1919 eulogized the role of Mujaddid (Sirhind),"who did not see eye to eye with the policy of state"[6]

[1] History of Sufism in India by Saiyied Athar Abbas Rizvi, Volume 2, 1992, Page 212
[2] Sufism in India by Saiyied Athar Abbas Rizvi, Volume 2, 1992, Page 204
[3] . Ibid. Page 365
[4] . A History of Sufism in India by Saiyid Athar Abbas Rizvi, Vol. II, 1972, Page 178
[5] . Ibid. page XII
[6] . Ibid. Page215

Shah Wali Ullah, a prominent Muslim thinker of eighteenth century who shaped the destiny of Indian Muslims was also a Sufi of Naqshbandi order. His contempt against the Hindus was identical to Shaikh Ahmad Sirhindi. The rise of two Hindu rebellious groups namely Marathas and Jats against the Muslim rulers in 1750s stirred the mystic spirit of Wali Ullah and he invited Ahmad Shah Abdali, the Afghan ruler to invade India to save the Muslims from the subjugation of Hindus. While formulating the contours of his mystical ideology, he transformed the Islamic mysticism to a theo-political concept for supremacy of Islam and for political power to the Sunnis.

Wali Ullah started a tradition of reformed Sufism in which Islamic mysticism was far superior to other form of mystic philosophy. His reform in Sufi cult made the spirituality of Islam subservient to Political Islam. His doctrine for internal unity of Muslims through complete adherence to pure Islam was only to fight against the infidels and for reestablishment of assertive Islamic political power. His ideology had no scope to accommodate any order of non-Islamic mysticism, which he regarded unhealthy. He tried to comb out all the foreign influences, such as neo-platonism and Vedantism from Islamic mysticism. Carving out a new path for Sufism he became an active Islamist with a sole objective for resurgent Sunni political power in Delhi.[1] Bridging the gulf between the Islamic clerics and Sufis, Wali Ullah infused new vigour in practice of Naqshbandi Sufi order. He synthesised the disciplines of the three major Sufi orders namely Qadari, Chisti and Naqshbandi with a view to unite the Muslim society against the Hindus. Like Shaikh Ahmad Sirhind he was also against the presence of Hindu employees in the administration of Muslim rulers as he viewed it detrimental to the purity of Islam. His attempt was to purify Islam from the mystic influence of Hinduism. Under the influence of Serhindi whose belief that Islam is a complete way of life stirred the Muslims to retrieve the medieval glory of the faith in this sub continent. The exclusivist Ideology of Wali Ullah, which sowed the seed of Muslim separatism in South Asia had nothing to do with the secular intellectual approach towards spiritualism.

Against the total rejection of Sufism by his contemporary radical Islamist Wahhab of Saudi Arabia, Waliullah used his mystic ideology for political domination of the Muslims in the region. However, the spirit and aim of both were for adherence to pure

[1] . A History of Sufism in India, Vol. II, Rizvi, Page 259.

Islam. He was the main guiding source for Muslims after the decline of Islamic rule in Indian subcontinent. Contrary to the commonly viewed Sufi tradition he was not receptive to the spiritual tradition of local Hindus in any form. His main spiritual concern if any was for revival of Islamic India.

The Muslim ruler under the influence of the doctrine of Shah Wali Ullah patronised Islamic learning and "took away the administrative and economic power that had passed into the hands of Hindus"[1]. "For Shah Wali Ullah, the decline of Mogul political power and the spiritual decadence of Indian Islam were closely related ".[2] Sayyid Ahmad Barelavi, a disciple of Abd al Aziz, (the son of Shah Wali Ullah) continued the tradition of Waliullah by synthesising the three major Sufi orders"[3]. He launched armed jehad against the non-Muslims but was killed in the battle of Balkot against Sikh leader Ranjit Singh. Karamat Ali, a disciple of Sayed Ahmad Barelavi further developed the ideology for purifying Islam from the influences of Hindu custom and tradition. "His work largely paved the way for the establishment of the organisation which has more recently been developed under the name of Ahl-I-Hadith"[4]. It was a neo-Sufi concept of Islam interpreted by Shah Wali-Ullah.

The leaders of Deoband movement were also under the influence of both Wali Ullah and Wahhab and accordingly they resisted against the British and were critical of Aligarh movement because of its leader Sir Sayed Ahmad being loyal to it. Protracted struggle with the concept of greater jehad was the basic creed of Deoband movement, which is a synthesis of Wahhab and Wali Ullah. Deobandis extreme austere approach towards Wahhab and harsh condemnation of the much popular practice of Sufism in India are being viewed as a totally anti-Sufi movement. Ahmad Riza Khan Barilavi (1856-1921), the founder of Barelavi movement was the defender of traditional Sufi movement but

[1] . Islamic Mysticism in India by Nagendra Kumar Singh, Page 185

[2] . The Sufi Orders in Islam by J. Spencer Trimingham, Oxford, 1971, Page 196.

[3] . The Sufi orders in Islam by Spencer Trimingham, Oxford, 1971, Page 129

[4] . Indian Islam by Murray T Titus, 1979, Page 186

Mohammad Ilyas, a pietistic missionary group though, appropriated the ethical emphasis of Sufism rejected its ritual, metaphysics and sainthood[1].

Persian Sufi Poetry: To find the date of the first mystical poems, we have to obtain the correct definition of mystical poetry. The mystical poem is a poem written in the formulation of the spiritual principles and truth. So the mystical poem is the one written with a mystical intention, not a love poem [man to man] which is interpreted mystically.

Sufism which originates from the inspiration has the same affinity with poetry that comes from the same inspiration, nevertheless, the Sufis, who at first was ascetic, at the beginning of the same period, did not show much interest in poetry. Many believe that the history of this incident is not clear. Some consider Baba Tahir as the first mystical poet; some people say that the beginning of the mystical poetry coincides with the beginning of Sama; another theory that has many supporters considers Sanai as the founder of the mystical poems. It is clear that in this essay, we are referring to the Sufi poems of Persia.

Some Important books on Sufism:

The early Sufi prose works in New Persian do not differ much in from and content from their Arabic models. One of the oldest preserved is the treatise Kashf-ul-Mahjub (The revelation of the mystery) of al Hujviri (d.465/1072-3) which in its disposition of the material is a direct counterpart to celebrated Arabic works like the Kitab-ul-ulma of Abu Nasr as-Sarraj.

Kashful Mahjub: This book is most ancient, authentic and celebrated treatise on **Sufi** religious thought in India. It was written by Shaikh Ali Hujweri known as data Ganj Bakhsh (d.1071-72 A.D.)[2] This book is divided into twenty five chapters and it is first Persian prose work on Sufism. Ali Hujweri, in his famous book Kashful Mahjub, "enumerate twelve schools of Sufism up to his time, amongst which he calls ten as rightly guided and the other two as heretical."[3]

Jawahir-i- Khamsa: It is composed in Persian by Mohammad Gauwth of Gawaliyar. This book is divided into five sections as Khamsa on mysticism.

---

[1] . M.A. Haq - The Faith Movement of Maulana Ilyas, London, 1972 - Quoted from Encyclopaedia of Islam Vol. X, page 336.

[2]. Ali Hujweri Shaikh, Kashful Mahjub, p3

[3] . Kashful Mahjub, pp 130-1

Miratul Arifin: It is an exposition of the theory of Sufism as to its principal doctrines. This book was written by Masud Bak (d.1387 A.D.). The book is divided into 4 Kashfs. It begins by distinguishing between the Shariat, Tariqat and Haqiqat[1].

Fawaid-ul-Fuad: It is the collection of conversations of Shaikh Nizamuddin Aulia compiled by Amir Hasan Sijzi, the distinguished disciple of the Shaikh Nizamuddin Aulia.

Sufi literature in Deccan India: Sufi literature was initiated under the Bahmanids, when the chishti Sufis at Rawża, led by Borhan-al-Din gharib's successor, Zayn-al-Din Shirazi (d. 771/1370), began to compile *malfuẓat*[2] . Zayn-al-Din had no successors in Rawża, but later Sufis of Borhanpur, like Bahaʾ-al-Din Bajan (d. 912/1507), claimed to have inherited the authority of Borhan-al-Din. In the meantime leadership of the Chisti passed to Moḥammad Ḥosayni Gisuderaz (d. 825/1422), who had left Delhi for Golbarga in 800/1398 and become attached to the Bahmanid court. A prolific author, he was a major force in transmitting the heritage of Persian Sufism in the Deccan. He wrote many mystical treatises in Persian, including *Ḥaẓaʾer al-qods*, *Asmar al-asrar*; commentaries on classical works on Islamic law, theology, and Sufism; letters; and poetry. His descendants also made literary contributions to Sufism. The writings by members of other Sufi orders (*selsela*) prominent in the early Bahmanid period, particularly the Jonaydis, are now known only through later references[3]. The Bahmanid rulers encouraged the immigration of Sufi masters from Persia and Iraq as part of a policy of favouring foreigners (*afaqi*) over Indians. The Neʿmat-Allahi order became established at Bīdar when its founder, Shah Neʿmat-Allah Wali (731-834/1330-1431), sent one of his grandsons to act as a guide for the prince who later became Aḥmad II Bahmani (839-62/1436-58); the order thrived in the Deccan until its leaders decided to return to Persia in the late 17th century. The Qaderi order arrived at Bīdar from Baghdad, also in the 15th century, and later spread to Bijapur and Golconda[4].

At Golconda the Qoṭb shahis, who continued to favour Shiʿism, concentrated their patronage on Dakhani Urdu and Telegu poetry in honour of the imams and on scholarship and poetry in Arabic. There is little evidence of Sufi activity at Ahmadnagar,

1 . Masud Bak, Miratul Arifin, p1
2 . Ernst, pp. 80, 134-38, 321 n. 226
3. Siddiqi, pp. 95-107, 207-09
4 . Eaton, pp. 56-58; Siddiqi, pp. 69-95

and in Bijapur the ʿAdel Shahis seem not to have become patrons of Sufism until the late 16th century, when Sunni Islam replaced Shiʿism there under Ebrahim ʿAdel Shah[1]. At that time many Chishti and Qaderi Sufis settled in the city, and the Saṭṭari order from northern India also established centres at Bijapur and Borhanpur. An exceptionally strong literary tradition was initiated by Chishti authors like Shams-al-Din Miranji (d. 905/1499), Borhan-al-Din Jānam (d. after 1006/1597), and Amin-al-Din ʿAlaʾ (d. 1086/1675), who wrote poetry in Dakhani Urdu addressed to a wide readership. Their Persian works (often translations or commentaries on the Dakhani texts), on the other hand, were aimed at a more specialized Sufi audience[2].

As the Mughals expanded into the Deccan, so did Sufi orders that were well established in their domain. Disciples of Aḥmad Serhendi (d.1034/1624), leader of the Mojaddedi Naqshbandis, settled in Borhanpur, and separate Naqšbandi lineages were established at the convents (*k̲hanqāh*s) of Shah Mosafer Gojdovani at Awrangabad and Shah ʿEnāyat-Allah (d. 1117/1705) at Balapur in Berar. The Saṭṭari master Moḥammad Gawṯ (d. 971/1563) had flourished under the Mughals, and his disciples from Gujarat developed a major centre in Borhanpur, a city to which many Sufis from Sind were also attracted. The successive leaders of this Saṭṭari lineage were Laskar Moḥammad ʿAref (d. 993/1585), ʿIsa Jond-Allah (d. 1031/1622), and Borhan-al-Din Raz-e Elahi (d. 1083/1672); ʿIsa in particular was a prolific writer on mystical topics (e.g., *ʿAyn al-maʿani*) and a commentator on Islamic law and theology. Among other significant works produced by this school were Ebrahim Saṭṭari Jannatabadi's *Aʾina-ye ḥaqaʾeqnoma*, a commentary on Moḥammad-Sirin Maghrebi's *Jam-e jahannoma* based on the metaphysics of Ebn al-ʿArabi. At the end of the Mughal period there was also a renaissance of the chishti order in the Deccan under the leadership of Neẓām-al-Din Awrangabadi (d. 1142/1728), who followed the instructions of his teacher in Delhi, Shah `Kalim-Allah Jahanabadi (d. 1142/1729). Neẓam-al-Din's relationship with Neẓam-al-Molk Aṣaf-jah was so close that the latter wrote a biography of him (Nizami, 1980-85, I, pp. 290 ff., V, pp. 81-181). A good survey of Sufism under the later *neẓam*s has yet to be written.

---

1 . Eaton, pp. 70-79

2 . Ibid, pp. 135-74, 243-81

As many important Persian Sufi writings from the Deccan remain in manuscript or have not survived, biographical works that include excerpts from them are extremely valuable. Among the most important is the pan-Indian hagiography *Aḵbar al-aḵhyar* by ʿAbd-al-Ḥaqq Dehlavi. Also of great value for the Deccan is Moḥammad Gawṯi's *Golzar-e-abrar* (comp. 1022/1613), which is devoted especially to the saints of Gujarat and western India. Other significant Persian hagiographies for the Deccan are the anonymous *Fatḥ al-awliaʾ* (1020/1610) on the saints of Rawża and Borhānpūr, composed for ʿAbd-al-Raḥim Ḵhan-e Ḵhanan; *Rawżat al-awliaʾ* (comp. 1161/1748) by Azad Belgrami on the saints of Khuldabad and Awrangabad; *Meskat-e-nobuwat* (1220/1804-05) by ʿAli Musawi on saints of the Deccan, including Hyderabad; and *Rawżat al-awliaʾ. Taḏkera-ye awliaʾ-e Bijapur* (comp. 1241/1825-26) by Moḥammad-Ebrahim Zobayri[1]. Most of these collections were either produced under royal patronage or include traditions of political origin, so that their accounts must often be measured against the traditions found in *malfuẓat* texts and other Sufi writings. As use of the Persian language declined during the 19th century, the history of Sufism in Hyderabad and the rest of the Deccan must be supplemented with works written in Dakhani Urdu and other local languages for the benefit of devotees.

IMPACT OF SUFISM:

The massive geographic presence of Islam in India can be explained by the tireless activity of Sufi preachers. Sufism had left a prevailing impact on religious, cultural, and social life in South Asia. The introduction of the mystical form of Islam was done by Sufi saints Sufi scholars travelling from all over continental Asia were instrumental in the social, economic, and philosophic development of India. Besides preaching in major cities and centres of intellectual thought, Sufis reached out to poor and marginalized rural communities and preached in local dialects such as Urdu, Sindhi, Panjabi versus Persian, Turkish, and Arabic. Sufism emerged as a "moral and comprehensive socio-religious force" that even influenced other religious traditions such as Hinduism. Their traditions of devotional practices and modest living attracted all people. Their teachings of humanity, love for God and Prophet continue to be surrounded by mystical tales and folk songs today. Sufis were firm in abstaining from religious and communal conflict and strived to be peaceful elements of civil

[1] . Storey, I, pp. 979, 984, 1024; Ernst, pp. 91-92, 209-12; Eaton, pp. 334-35

society. Furthermore, it is the attitude of accommodation, adaptation, piety, and charisma that continues to help Sufism remain as a pillar of mystical Islam in India.

Sufism as we have seen is a very complex phenomenon. In India, it took root in both the rural and the urban areas. In some cases, the deep impact of Sufism and its popularity among the masses transformed rural region, such as Uch, Nagaur and Sylhet, into a flourishing urban centres. By the time of Muhammad Bin Tughlaq, *khanqahs* began to exercise a deep social, political, economic and cultural influence in India. The reliance of Sufis on God, particularly in the material sense, attracted both people from economically deprived classes and members of the oppressed elite into orders. *Khanqahs* gave to most people a feeling of hope and a vision of a bright future, both in this world and the one to come.

Various leaders of Sufi orders, tariqa, chartered the first organized activities to introduce localities to Islam through Sufism. Saint figures and mythical stories provided solace and inspiration to Hindu caste communities often in rural villages of India. The Sufism teachings of divine spirituality, cosmic harmony, love, and humanity resonated with the common people and still does so today. The following content will take a thematic approach to discuss a myriad of influences that helped spread Sufism and a mystical understanding of Islam, making India a contemporary epicentre for Sufi culture today.

Other kinds of literature: Various minor Persian works were written on the subjects of music, Islamic law, astronomy, and the like, and some translations from Arabic (generally on religious topics) and Sanskrit (on veterinary science and music) were produced. Perhaps the most noteworthy of these works is the well-known Persian dictionary *Borhān-e qāṭeʿ*, composed by Moḥammad-Ḥosayn Borhān Tabrīzī for ʿAbd-Allāh Qoṭbšāh in 1062/1652. It was the target of caustic criticism by the 19th-century poet Mīrzā Asad-Allāh Ḡāleb in his *Qāṭeʿ-e borhān*.

Deccan

The independent state of Hyderabad in the Deccan was founded by Chin Qurlich Khan, titled Nizim-ul-Mulk Asaf Jah afterwards. At the time of the death of Aurangzeb, he was at Bijapur. He observed perfect neutrality in the war of succession which ensured between the sons of Aurangzeb. Bahadur shah 1, who became the

emperor after finishing his rivals, removed him from the Deccan and made him the governor of Awadh and faujdar of Gorakhpur.

After the death of Bahadur Shah, he supported the cause of Farruksiyar against Jahandar Saha. Therefore, when Farrukhsiyar became the emperor, he appointed him governor of the six Subahs of the Deccan and awarded him the titles of Khan Khanan and Nizam-ul-Mulk Bahadur Fatah Jang. From that time onwards, he thought of nothing except to rule over the Deccan independently of Delhi.

He however, was recalled to Delhi in 1715 AD, he first appointed at Moradabad and then as the Governor of Malwa. His activities in Malwa aroused the jealousy of the Sayyid brothers who were de-facto rulers of Delhi at that time. They planned to throw away Nizam from Malwa. This time Nizam opposed them. He defeated and killed Dilawar Khan who was sent to displace his from Malwa. He also captured forts of Asirgarh and Burhanpur and thus became the undisputed master of the Deccan.

After the fall of the Sayyid brothers, emperor Muhammad Shah called him to Delhi and appointed him to Wazir of the empire. He however did not find the atmosphere of the court friendly for himself and left for the Deccan. The new Governor of the Deccan, Mubariz Khan opposed him as he was secretly advised to do so by the emperor. But the Mizam enlisted the support of the Marathas and defeated Mubariz Khan in the battle of Sakharkharda in 1724 A.D. He occupied Hyderabad in 1724 A.D that marked the founding of the independent state of Hyderabad. Nizam-ul-mulk from that time ruled as an independent ruler in the Deccan except that he did not use an imperial umbrella and mint coin in his name.

Nizam-ul-Mulk faced greatest challenge from the Marathas who under the leadership of Peshwa Baji Rao I were determined to collect Chauth and Sardeshmukhi from the six Subahs of the Deccan and limit the power of Nizam. Nizam was a shrewd diplomat and a competent commander. He tried to divide the Marathas, roused the ambition of senapati Trimabak Rao against Peshwa Baji Rao and refused to pay Chauth and Sardeshmukhi. But, Baji Rao proved more than a match for him. He defeated Nizam twice-first at phalkhed in 1728 AD. And next time near Bhopal in 1738 AD. Therefore, both times he had to purchase peace from the Peshwa and agree to pay Chauth and Sardeshmukhi besides other terms. Thus, Baji Rao successfully put a check on the power of Nizam in the Deccan. In between Nizam was once called to the Mughal court and

awarded the title of Asaf Jah. Once more he was called to the court from the Deccan to settle the terms of peace with Nadir Shah. He failed to settle anything with Nadir Shah and returned back to Deccan. Thereafter, he did not participate in the politics of Delhi. He died in 1748 A.D. at the age of seventy-seven. Nizam was the first independent ruler of Hyderabad and he was also the most capable one among the rulers of the Deccan.

Uncertainty prevailed in the Deccan after the death of Nizam-ul-mulk-Nasir Jang. Muzaffar Jang contested for the throne and took help of the English and the French respectively which resulted in increased influence of those powers, in turn in the affairs of the state. The meddling of the Marathas in the politics of the Deccan and the rise of the state of Mysore under Haider Ali created further complications for the rulers of Hyderabad. The participation of the state of Hyderabad in the politics of the Deccan afterwards was humiliating and it paid the price for it. In September, 1798 A.D. the Nizam of Hyderabad entered into a subsidiary alliance with the English and virtually became their secondary ally.

Conclusion: ***Sufism*** has an illustrious history in ***India*** evolving for over 1,000 years. The presence of Sufism has been a leading entity increasing the reaches of Islam throughout South Asia. Following the entrance of Islam in the early 700s, Sufi mystic traditions became more visible during the 10th and 11th centuries of the Delhi Sultanate. A conglomeration of four chronologically separate dynasties, the early Delhi Sultanate consisted of rulers from Turkic and Afghan lands. This Persian influence flooded South Asia with Islam, Sufi thought, synergetic values, literature and education.

The concept of Tawhid (Unity in God), which is the real formulation of Sufism suggests that Islamic mysticism has no difference with the formulations of other non-Islamic faiths about the oneness of God. On this basis Sufism became popular in India during the period of Muslim rule. But when the Sufis supported the Muslims in their political conflict with the Hindus and played important role in conversion of indigenous people to Islam, it gave birth to politicisation of religion, which generated communal tension between the two major religious communities. The movement for purifying Islam from extraneous influences, which was launched by the Sufis like Saikh Ahmad Sir hindi and Shah Wali Ullah was against the spiritual doctrine of 'Tawhid' (Unity in God). Creating a far-reaching impact on the psyche of Indian Muslims it continues to keep the Muslim mass away from the modern global changes.

Sufism in India has commonly been viewed as a secular attempt for eternal quest of the soul for its direct experience of the ultimate Super power. For centuries the Hindus accepted Sufi shrines as symbol of communal harmony. A large number of them have been offering prayers in Sufi shrines without any reservation but this liberal gesture has not been reciprocated Muslims.

Contrary to the common perception that Sufism tried to unify the Hindu-Muslim spirituality for a communal harmony, the political Islamists of Sufi background used the doctrine of Tawhid to accelerate the process of Muslim separatism in Indian subcontinent. Their movements were the by-products of Sufi tradition of Islam. They were basically the mystics for the political domination of Islamic activists.

The basic creed of mystic movements is unity of God irrespective of religious connotation. Unity of God denotes social unity and universal brotherhood. But these political mystics not only divided the society on the basis of religion but their doctrine created a permanent Hindu-Muslim conflict in the region. The spirit of mysticism is to resolve any dilemma confronting the society. But Sufi movement failed to resolve confronting Hindu-Muslim dilemma in Indian society. In practice they launched a movement for systematic dehumanisation of Islam and negated the concept of Islamic spiritualism of Tawhid (Unity of God).

References & Bibliography

1. Abd-al-Bāqī Nehāvandī, *Maʾāṯer-e raḥīmī*, ed. S. Hidayat Husain, 4 vols. Calcutta, 1924.
2. Abul Qasim Husaini, 'Guldastah-e-Gulshan-e-Raaz Dar Tareef Sultan Muhammad Adil Shah'.
3. Abd-al-Malek ʿEṣāmī, *Fotūḥ al-salāṭīn yā Šāh-nāma-ye Hend*, ed. M. Ḥosayn, Agra, 1938; tr. M. Husain as *Futūḥu's Salāṭīn or Shah Nāma-i Hendof ʿIṣāmī*, New York, 1977.
4. Asad Khan was a great noble during the rule of Ismaeel Adil Shah, Mallu Adil Shah and Ibrahim Adil Shah-I
5. C. W. Ernst, *Eternal Garden. Mysticism, History, and Politics at a South Asian Sufi Center*, Albany, N.Y., 1992.
6. Captain King, G. S, 'Story of Murder of Ali Adil Shah-I; Fifth King of Bijapur; As Told by Contemporary Historians', The Indian Antiquary, 1888; pp: 221-24

7. D. James, "The 'Millennial' Album of Muhammad-Quli Qutb Shah," *Islamic Art* 2, 1987, pp. 243-54.
8. Devare; T. N, 'A Short History of Persian Literature at the Bahmani, the Adil Shahi and the Qutb Shahi courts-Deccan', Poona, 1961, p: 262
9. D. Barrett, *Painting of the Deccan. XVI-XVII Century*, London, 1958.
10. E. S. Merklinger, "The *Madrasa* of Maḥmūd Ḡāwān in Bīdar," *Kunst des Orients* 11, 1976-77, pp. 144-57.
11. Farishtah, Muhammad Qasim, 'Tarikh-e-Farishtah', Part-II, Persian Lithograph, Lucknow, 1855; f: 79
12. Fuzuni Astrabadi, 'Futuhat-e-Adil Shahi', MS. Add-No. 27, 251, British Museum, London
13. Ḥ. Farzām, "Solṭān Aḥmad Bahmanī wa Šāh Neʿmat-Allāh Walī," in M.-R. Daryāgašt, ed., *Kermān dar qalamrow-e taḥqīqāt-e īrānī*, Kermān, 1370 Š. /1991, pp. 264-72.
14. H. Knižkova, "Notes on the Portrait of Ibrahim ʿAdil Shah II of Bijapur in the Náprstek Museum, Prague," in R. Skelton et al., eds., *Facets of Indian Art*, London, 1986, pp. 116-23.
15. H. K. Sherwani, *The Bahmanis of the Deccan. An Objective Study*, Hyderabad, n.d. R. Skelton, "Documents for the Study of Painting at Bijapur in the Late Sixteenth and Early Seventeenth Centuries," *Arts Asiatiques* 5/2, 1958, pp. 97-125.
16. H. K. Sherwani and P. M. Joshi, *History of Medieval Deccan (1295-1724)*, 2 vols. Hyderabad, 1973-74 (a valuable survey of political and cultural history).
17. Idem, *Dakan under the Sultans, 1296-1724*, Wichita, Kans., 1987.
18. Idem, *Indian Islamic Architecture. The Deccan 1347-1686*, Warminster, England, 1981.
19. Idem, "Some Glazed Tiles in 15th-Century Bidar," in R. Skelton et al., eds., *Facets of Indian Art*, London, 1986b, pp. 41-46.
20. Idem, "Ṣūfī Movement in the Deccan," in H. K. Sherwani and P. M. Joshi, *History of Medieval Deccan (1295-1724)* II, Hyderabad, 1973, pp. 173-99.
21. Idem, "Painting," in G. Michell, ed., *Islamic Heritage of the Deccan*, Bombay, 1986, pp. 92-109.
22. Idem, *Tārīḵ-e mašāyeḵ-e Češt* II, V, Delhi, 1980-85 (in Urdu).
23. J. Raby and Z. Tanindi, *Turkish Bookbindings in the 15th Century*, London, 1993.
24. J. V. S. Wilkinson, ed., *The Chester Beatty Library. A Catalogue of the Persian Manuscripts and Miniatures*, 3 vols. Dublin, 1959-62.
25. J. P. Losty, *The Art of the Book in India*, London, 1982.
26. Joshi, P. M. and Nayeem, M. A, 'Fuzuni Astrabadi's Futuhat-I-Adil Shahi-An Unpublished Persian MS. In British Museum-Some Extracts', Islamic Culture, Hyderabad
27. K. Hussaini, *Sayyid Muḥammad al-Ḥusaynī Gīsū Darāz. On Sufism*, Delhi, 1985.
28. ʿ K. A. Nizami (Neżāmī), "Gīsū Darāz," in *EI*2 II, pp. 1114-16.
29. L. Golombek, *The Timurid Shrine at Gazur Gah*, Art and Archaeology Occasional Paper 15, Toronto, 1969.
30. M. S. Siddiqi, *The Bahmani Ṣūfīs*, Delhi, 1989.
31. M. Zebrowski, "Transformations in Seventeenth Century Deccani Painting at Bijapur," *Chhavi* 2, 1981, pp. 170-82.
32. M.A. Molkapūrī, *Maḥbūb al-waṭan. Taḏkera-ye salāṭīn-e Dakan* I. *Dar bayān-e salāṭīn-e Bahmanīya*, Hyderabad, n.d. (in Urdu). ʿA. Naqawī, *Taḏkera-nevīsī-e fārsī dar Hend o Pākestān*, Tehran, 1343 Š./1964.
33. Nayeem, M. A., 'External Relations of Bijapur Kingdom', Hyderabad, 1974; p: 2
34. Nūr-Allāh, *Tārīḵ-e ʿādelšāhī*, ed. A. M. Ḵāledī, Hyderabad, 1384/1964.

35. Nathu, B. A, 'A History of Bijapur By Rafiuddin Shirazi', ART-III, Vol-XXVIII, Bombay Branch of Royal Asiatic Society, Bombay, 2905; pp: 17-29
36. O. Khalidi, *Hyderabad State under the Nizams, 1724-1948*, Wichita, Kans., 1985.
37. P. Davies, *The Penguin Guide to the Monuments of India* II, London, 1989.
38. P. Brown, *Indian Architecture* (*Islamic Period)*, Delhi, 1956.
39. Peerzade, Ghulam Muhiuddin, 'Ahwal-e-Salateen-e-Bijapur', MS. Add. No. 270, British Museum, London
40. R. M. Eaton, *Sufis of Bijapur 1300-1700. Social Roles of Sufis in Medieval India*, Princeton, N.J., 1978.
41. Rafīʿ-al-Dīn Ebrāhīm Šīrāzī, *Taḏkerat al-molūk*, ed. A. M. Ḵāledī, rev. C. W. Ernst, Costa Mesa, Calif., in press. P. S. M. Rao, *Eighteenth Century Deccan*, Bombay, 1963.
42. R. Islam, *A Calendar of Documents on Indo-Persian Relations (1500-1750)*, 2 vols. Karachi, 1982.
43. S. H. Safrani, "Golconda Alums," in S. H. Safrani, ed., *Golconda and Hyderabad*, Bombay, 1992, pp. 73-80.
44. S. ʿA. A. Bilgrami, *Landmarks of the Deccan*, Hyderabad, 1927.
45. Shaikh Ainuddin Ganj-e-Ilm was a contemporary to Sultan Alauddin Hasan Gangu Bahmani (1347-58), Sultan Muhammad Shah Bahmani-I (1358-75), Sultan Dawood Shah Bahmani (1375-78) and Sultan Muhammad Shah Bahmani (1378-97)
46. Shirazi, Rafiuddin, 'Tazkiratul Muluk', MS. No-18, Oriental Manuscript Library and Research Centre, Hyderabad
47. The known histories of the Nizam Shahis of Ahmadnagar and the Qutb Shahis of Golconda respectively are *Burhan-e-Maasir* of Sayyed Ali Tabataba-e-Simnani and *Tarikh-e-Muhammad Qutb Shah* (anonymous).
48. Y. Crowe, "Coloured Tilework," in G. Michell, ed., *Islamic Heritage of the Deccan*, Bombay, 1986a, pp. 86-91.

Dr. S. Naqi Abbas (**Kaify**)

Tagore National Scholar, Rampur Raza Library, Ministry of Culture, Govt. of India, Rampur;

Consultant Manuscripts (Persian), National Museum, New Delhi

Sumer Chand's *Persian Rāmāyana*

A very beautifully illustrated manuscript of the *Rāmāyana* of *Ādī Kavī Maharishī Bālmikī (Vālmikī) is persevered in the prestigious Rampur Raza Library, Rampur. The manuscript has 682 pages and contains the Persian translation of the first four kāṇḍs of the Rāmāyana with* 261 meticulously done miniature paintings depicting various events and episodes of the *Rāmāyana written in Nastaʿlīq style of* Persian calligraphy.

It opens with a fine *sarlauḥ* (embellishment) and a brief prose preface with few Persian verses, presumably by the translator himself. *The sarlauḥ on page 2-3 is well executed, with gold cloud bands and large red and green quatrefoils on gold and blue; below nine lines of text are surrounded by a lapis border with a reciprocal crenellation. An outer border has paired golden leaves (a degenerate arabesque) forming larger crenellations on a blue background with gold triangles above them. Pages 4-5 have borders with large cartouches and paired gold leaves with the area between the cartouches colored red.*[1] The *ʿunwān*s (titles) are written in red ink and the rest of the manuscript is beautifully scribed in black within defined golden border. Nevertheless, each illustration has a caption written in red ink.

As evident from the preface of the manuscript, it is a prose translation of the *Rāmāyana from Sanskrit into Persian by Sumer Chand* who translated it in *1128 A.H./1715-16 C.E. during the reign* of the Mughal Emperor *Farrukh Siyar* (1713-1719 C.E.) at the instance of a mystic named *Rāmkishan*.

According to the colophon at end of the first kāṇḍ – the Bāl Kāṇḍ – it was copied by a person named Sayyīd Amīr Shāh in 1242 A.H./1826-27 C.E who has described himself as 'a devoted servant of the court' (at pages 139 & 350). Ms. Barbara Schmitz and Dr.

[1] Mughal and Persian Paintings and Illustrated Manuscripts in Rampur Raza Library, p. 97

Ziauddin Desai, in an attempt to identify the scribe have written that the calligrapher Sayyīd Amīr Shāh is probably to be identified with the Sayyīd Amīr Shāh Rāmpūrī who scribed a copy of Firdausī's Shāhnāma in 1838-39 C.E. It seems probably that Sayyīd Amīr Shāh was working in Rāmpūr. Keeping the time bracket in mind, when he describes and designates himself as 'a devoted servant of the court' in the colophon, it may thus be indicating that he was employed by Sayyīd Aḥmad ʿAlī Khān, the Nawwāb of Rāmpūr (reign: 1794-1840 C.E.). It is to be noted that the Raza Library has the first half of the *Rāmāyana* (consisting of *the first four kāṇḍs only*), *and it is not beyond imagination that a full colophon would have appeared at the end of the work.*[1]

The manuscript begins with *Bismillāh ir-Raḥmān ir-Raḥīm* (بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰن الرَّحِيْمِ) – the opening verse of the Holy *Qurān* – which reflects the peaceful co-existence of two religious entities showing utmost respect, for the etiquette of starting the task of writing a book, in a tolerant society. The mutual respect existed among the of Hindus and Muslims, for each other, is evidenced with the effort of the translator who made a sincere attempt to maintain the ritual of beginning a virtuous deed with the opening verse of the Holy *Qurān*. Then commences a brief preface beginning with verses in praise of God in which the translator states that three versions of *Rāmāyana are famous on earth, but he chose the Rāmāyana of Vālmikī* for translating because this version was praised by *Lord Rāma* himself. Then he mentions the year of translation being 1128 *Hijrī* i.e. the Islamic calendar which is equivalent to the year 1715-16 C.E.

The preface continues in a flowery prose, an evidence of the mastery of the translator over the skills of writing and translating. There is a mention of the translator's name in this preface as *Sumer Chand*, that too, in a versified riddle.[2] However, nothing is known

---

[1] Mughal and Persian Paintings and Illustrated Manuscripts in Rampur Raza Library, p. 98

[2] *which says:*

واو و دال و الف و کاف نوشتم ده و چند // نامِ من بود به ترتیب چو کردم پیوند

(wāw o dāl o alif o kāf newishtam dah o chand // nām-i man būd be tartīb chū kardam paiwand)

(means: I wrote vāv (و / व), dāl (د / द), alif (الف / अ) and kāf (ک / क) ten times with Chand (چند / चंद), together when collected it appears to be my name.)

In this verse-riddle, vāv (و / व), dāl (د / द), alif (الف / अ) and kāf (ک / क) are Perso-Arabic alphabets, each carrying a numeral value as per Perso-Arabic alphanumeric system called Abjad numerals or Ḥisāb al-Jummal.

According to Abjad numerals, vāv (و / व) is equal to 6, the value of dāl (د / द) is 4, alif (الف / अ) is 1 and kāf (ک / क) is 20. Now, according to the hint given in the riddle, multiplying vāv (و / व) with

about *Sumer Chand*, the skillful translator of the work in reference, neither he has provided any other clue about himself in the prologue. He continues to write that the translation of the *Rāmāyana* has been done from *Hindavī* i.e. Sanskrit into Persian. *According to him, there are three famous versions of the Rāmāyana, each having its own style and significance yet he selected the Vālmikī*'s *Rāmāyana because it was written during the times of Lord Rāma*. And, *Luv* (लव) and *Kush* (कुश) – sons of *Lord Rāma* – completed it which was heard and praised by *Lord Rāma* himself. Then, in a *rubāʿī* (quatrain), he elaborates that 'the *Rāmāyana* is the earliest history of mankind above every written history revealing hidden values of humanity, hence it will be acknowledged by the world'.

Thereafter, he speaks about the nature of his translation. He says, great scholars and writers have broadly classified composition of Persian prose into three types: [i] *murajjaz* (مُرَجَّز) that is a kind of prose in which sentences are written in poetic meters but are not rhymed compulsorily [ii] *muqaffaʿa* (مقفّی) meaning a kind of prose in which rhymed sentences are written that are not in poetic meters and [iii] *ʿārī* (عاری) stands for simple prose. Continuing, he clarifies that as he intended to do a word-by-word translation, it was not possible for him to write *murajjaz* and *muqaffaʿa* prose, hence he has accomplished his translation in simple prose yet at some instances the other two types of prose have also been used.

Subsequently, the translator describes the 'purpose of translation' in eleven couplets in which he says: 'We live in such a time in which human values are declining; truth is disappearing, hearts are filled with hatred and treachery. Though *Farrukh Siyar* (literal meaning: good character) is the king but people have become characterless. If you ask address, you will be misled; if you ask for water, you will be thrown in the well. Everyone talks with annoyance and exasperation, humanity is endangered. A saint and mystic *Rāmkishan*, entrusted me with the task of translating the *Rāmāyana* of *Vālmikī* so

---

10 gives 60 (6x10), dāl (د / द) gives 40 (4x10), alif (الف / अ) gives 10 (1x10) and kāf (ک / क) gives 200 (20x10). In the Perso-Arabic alphanumeric system, 60 is the numeral value of sīn (س / स), 40 is the value of mīm (م / म), 10 is the value of yā (ی / य,ऐ) , and 200 is the numeral value of rā (ر / र) that together form Sumer (سُمیر/ सुमेर) which by adding Chand (چند / चंद) becomes Sumer Chand (सुमेर चंद), that is the name of the translator/author of this beautiful manuscript.

for Perso-Arabic alphanumeric system or *Abjad numerals* refer to https://en.wikipedia.org/wiki/Abjad_numerals

that people could learn human values, truth, generosity and goodwill from *Lord Rāma*'s life and character'.

Though nothing is known about *Sumer Chand*, fortunately, along with other illustrations his miniature painting survived in this copy of the *Rāmāyana* which is wrongly been attributed as *Vālmikī*'s miniature.

This translation of the *Rāmāyana* by *Sumer Chand* has been re-translated into Hindi by *Prof. Shah Abdussalam* (d. 2012) and *Dr. Waqarul Hasan Siddiqi* (d. 2009) which was published in 2011 in three beautiful hardbound volumes by the Rampur Raza Library, Rampur.

***

Illustrations

- *folio 1b (p.2) – the beginning page*

- *folio 2b (p. 4) – preface*

- *folio, 3a (p. 5) – Sumer Chand's portrait*

- *folio 16a (p. 31) – The court of Raja Dashratha; Bashishta [Vashishtha], and other learned men and ministers*

- *folio 62a (p. 123) - Lord Ram breaking dhanushya in the presence of Lakshman, Vishwamitra and Raja Janak. The sound of the breaking bow makes the heralds swoon but the aforementioned four retain their senses*

- *folio 65a (p. 129) – The court of Raja Janak receiving Raja Dhasrath and other rajas*

Sources

- *Chand, Sumer, **Rāmāyana**, manuscript no. 5008, Rampur Raza Library, Rampur*

- *Chand, Sumer, **Rāmāyana**, translated by* Prof. Shah Abdussalam and Dr. Waqarul Hasan Siddiqi, *Rampur Raza Library, Rampur, 2011*

- *Schmitz, Barbara & Desai, Ziauddin, **Mughal and Persian Paintings and Illustrated Manuscripts in Rampur Raza Library**, IGNCA New Delhi, Rampur Raza Library and Aryan Books International, New Delhi, 2006*

1b

2b

3a

16a

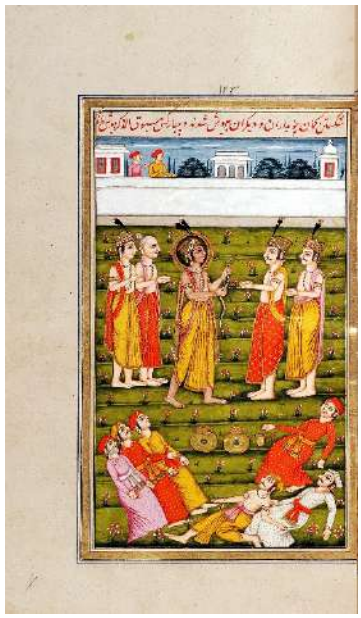

62a

65a

Sabistan Bano
Research Scholar
Department of History
A.M.U. Aligarh

Early Mughals and the Afghans: Relationship of Two Powerful Forces in India

Abstract

The Afghans ruled Northern India until the invasion of Babur in 1526, at that point the Mughal Empire was formed. Between two historic and decisive battles of Panipat and Khanwa the political situation of Northern India was very flexible that the Afghan nobles found themselves in critical condition. The vanquish of Chausa and Kannauj were still to recall Humayun, and the high-flying purposes of the Mughal Emperor and his imperialistic plans used to form doubts in the Afghan chiefs. The Sur Empire superseded the Mughal Empire.

Key words: *Baburnama*, Panipat, Afghans, Babur, Humayun.

The establishment of the Afghan rule in Hindustan in the middle of the 15th century was a significant event in the history of the Afghans. Babur does not differentiate between Pathans and the Afghans. He presents a large number of Pathan tribes but does not refer to them like Pathans. He addresses those Afghans and their language Afghani.

According to Ibbetson "it is an attempt of the contemporary historians to please the Lodi and Sur kings, to trace their descent to the family of the Prophet or Ferishta's contention that they hailed from the court of Pharaoh."[1]

Nevertheless, Babur was very acutely to continue their association, which was essential to give his campaigns in India and indigenous colour. He consequently

[1] Ibbetson, *A Glossary of Tribes as Castes of the Punjab and the North-West Frontier Province*, Vol. III, p. 215; Ferishta, *Tarikh-i-Ferishta*, Tr. Briggs, *Rise of Muhammadan in India*, Vol. I, Calcutta, 1966, p. 7.

continued their services. Mahmood Khan Khana Jahan was appointed by him as an officer in charge of a Pargana in Lahore. He was confined with the civil charge of that region and also the management of native officers in Mughal services.[1]

It is noteworthy that when the Gujars drove away from district Karnal, then the Afghans were established their colonies in the district of Karnal. During the early days of the Ghorian Conquest, the Rajputs drove away from Panipat by the Afghans. The Afghans have established a colony in Sonipat. Shahabad was their principal centre which was blasted and looted by Babur, the first Mughal Emperor.[2]

The entire north-western frontier region lying between the eastern banks of river Helmund and the river Indus was inhabited by a large number of the Afghans and non-Afghan tribes. Amongst the many Afghan tribes of this region cite such as Abazai,[3] Abdali,[4] Ahmadzai,[5] Alikhel,[6] Alizai,[7] Afridi,[8] Ansari,[9] Batani,[10] Dilzaks,[11] Lohani.[12]

Sources related Afghans refer scanty information on their original homes and migration it may be concluded that the Dilzaks were the first amongst the different Afghan tribes who came to the area consisting of Peshawar valley, Swad, and Bajaur. They assimilated, eradicated the existing tribes and gradually the extensive area from Bajaur to the Indus turned into a Dilzak colony.[13]

In the absence of given information about the link of the Afghans settled in Hindustan with their kinsmen in the Cis-Indus region, at every stage it was difficult to give a connected and coherent picture of their movements, and the procedure of their

---

[1] Zahiruddin Muhammad Babur, *Baburnama*, Tr. A. S. Beveridge, Delhi, 1970, p. 46; Zain Khan, *Tabqat-i-Baburi*, Tr. S.H. Askari, Delhi, 1982, p. 39; William Erskine, History of India, Vol. I, Delhi, 1973, p. 425.
[2] District Gazetteer (Ludhiana District), XV, A, 1504, p. 63;Ibbetson, *op. cit*, Vol. III, p. 225.
[3] *A Glossary of Tribes as Castes of the Punjab and the North-West Frontier Province*, op. cit., Vol. II, p. 1.
[4] ibid., p. 1.
[5] ibid., p. 2.
[6] ibid., p. 11.
[7] ibid., p. 12.
[8] Abul Fazl, *Akbarnama*, Tr. Beveridge, Vol. III, Delhi, 1972, p. 800; Abul Fazl, *Ain-i-Akbari*, Tr. H. Blochman, Vol. I, Delhi, 1977, p. 368.
[9] *A Glossary of Tribes as Castes of the Punjab and the North-West Frontier Province*, op. cit., Vol. II, p. 13.
[10] Abul Fazl, *Ain-i-Akbari*, Tr. H. Blochman, Vol. I, p. 532.
[11] Babur, *Baburnama*, pp. 367, 376.
[12] Abul Fazl, *Akbarnama*, Tr. Beveridge, Vol. III, p. 1174.
[13] H. W. Bellow, *The Races of Afghanistan*, Thacker and Co. Calcutta, 1880, p. 65; *A Glossary of Tribes as Castes of the Punjab and the North-West Frontier Province*, op. cit., Vol. II, p. 24.

final settlements in different parts of India. Here only a try has been made to develop a workable picture for migration of Afghans and their settlements in northern India before the arrival of Mughal emperors and during his reign (up to 1707 A. D.).[1]

Babur's relationship began with the year A.D. 1505 of Afghans when he established himself as the ruler of Kabul. The people of Kabul were different, and the population is made up of many Afghan and non-Afghan tribes. The Afghan races had their own tradition. Due to being the ruler of Kabul, Babur tried to get a cold and calculated policy towards the main Afghans. Initially, he tried to get rid of the action proceedings. He did a more diplomatic policy of compromise and control.[2]

Strengthening his knot with the Afghan chiefs, Babur decided to enter into a matrimonial alliance with them. In 1519 A.D., Bibi Mubarika, the daughter of Malik Shah Mansur was affianced to him.[3] A large number of Afghans were taken in the majestic service. It is related to Bibi Mubarika's brother Mir Jamal accompanied him, on his Indian campaign and got high honours under him, under his son Humayun and his grandson Akbar.[4]

During the invasion of the north-west frontier, Babur wrote the names of Afghans in his army in the rebel areas. These Afghan chiefs mostly related to the Yusufzai and Dilzak tribes. Babur mostly searched for his advice on the viability of his campaigns. He consulted a Dilzak headman while planning a campaign against the Yusufzais.[5] Diplomatic work was also employed by trusted Dilzak Afghans in order to obtain the request of the Afghan chief of Bajaur fort.[6]

When Babur turned towards Hindustan he found that the Afghans already encroached in different areas. That was prevalent from the situation of the Afghan ruling elite, and also with the fact that it was going through a difficult time of stress and strain.[7]

Before the defeat, the royal power could be implemented, Ibrahim Khan Lodi sent an army, which ousted Daulat Khan Lodi from Lahore and occupied it in 1523 A.D.

---

[1] Rita Joshi, *The Afghan Nobility and the Mughals (1526-1707)*, New Delhi, Vikas, 1985, p. 20.
[2] Rita Joshi, *The Afghan Nobility and the Mughals (1526-1707)*, op. cit., p. 32.
[3] Babur, *Baburnama*, p. 375.
[4] Gulbadan Begum, Humayunnama, Tr. A.S. Beveridge, London, 1902, Appendix A; p. 267.
[5] Babur, *Baburnama*, p. 367.
[6] ibid., p. 367.
[7] Rita Joshi, *The Afghan Nobility and the Mughals (1526-1707)*, p. 34.

It was a fair opportunity for Babur to march towards Hindustan to recover Lahore and win the friendship of Daulat Khan Lodi permanently.[1]

Babur crossed the Indus for the fifth and the last time in 1525 A.D. Malik Hati Ghakkar met him on the banks of Indus and was with him in Bhira. He also provided the Mughals with equipment for the convenience.[2]

After the battle of Panipat, Babur continued inviting Afghan nobles and recruited them in the Mughal nobility. He shaped his policy with two objectives in mind- to eliminate the Afghan power around Delhi and Agra, and to prevent the Afghan nobles from joining Rana Sanga. After the victory of the fort of the Agra, Babur again apologized to a large number of Afghan nobles, restored them their property and belongings, donated them good Parganas in the hope that they would now give him their full support and would be loyal to him.[3]

Because of his generous behavior towards the Afghan nobles, a large number of them like Shaikh Ghuran, a Sheikhzada of Koel, came from his iqta in Miyan Doab (Sarkar Meerut) and two or three thousand walkers connected to Babur.[4] Like this, Ali Khan Farmuli, who seems to have fought under Sultan Ibrahim Lodi in the battle of Panipat, and ran away to Mewar, also came and join with Babur.[5] Shortly afterward, when Prince Humayun was sent to deal with Sultan Muhammad Nuhani and his Afghan colleagues, a large number of Afghan nobles were deserted by the Nuhani leader and associated with the royal post. After the defeat of Sultan Muhammad Nuhani, Miyan Bayazid Farmuli, Masnad-i-Ali Firoz Khan Sarang Khani, Qazi and Mahmood Khan Nuhani were admitted in imperial services and were given suitable assignments.[6]

Between two historic and decisive battles of Panipat and Khanwa the political situation of Northern India was very flexible that the Afghan nobles found themselves in critical condition. Rana Sanga's expansionist rebels forced the Afghan nobles to open

---

[1] ibid., pp. 36-37.
[2] J.G. Delmerick, History of Ghakkars, J.R.A.S.B., 1871, pp. 86-87.
[3] Babur, *Baburnama*, pp. 477-78; Radhey Shyam, *Babur*, Janaki Prakashan , Patna, 1978, pp. 317-319.
[4] Abul Fazl, *Akbarnama*, Vol. I, p. 253; Badauni, *Muntakhab-ut-Tawarikh*, Tr. and edited by G.S.A. Ranking, Delhi, 1973, p. 444.
[5] Babur, *Baburnama*, pp. 526-27; Zain Khan, *Tabqat-i-Baburi*, p. 114.
[6] Babur, *Baburnama*, p. 527;Badauni, *Muntakhab-ut-Tawarikh*, p. 444.

agreements with Babur and to join the Mughals. The fort of Tahangarh[1] held by Alam Khan, the control of Nizam was on the fort of Bayana,[2] Tatar Khan Sarang Khani the *muqta* of sarkar Gwalior,[3] to control of Muhammad Zaitun was on the fort of Dholpur,[4] all of them either joined Babur's service or fled from their forts. Before the battle of Khanwa, Husain Nuhani of Rapri,[5] Alam Khan Lodi of Kalpi,[6] and Habit Khan Gurgandaz joined Babur and accompanied him in his campaigns.[7]

After the battle of Khanwa, Afghan nobles feared that Babur had not come here only to rob. Stubbornly, his lust was to overthrow the Afghan power, to establish his solid control on the pressure and power of the Afghan forces, completely irritated, unfollowed and rebellious Afghan nobles. Babur's wish was to stay permanently in Hindustan had a serious effect on the mind of the Afghans.[8]

While showing his political superiority his policy was to calm the Afghans. He provoked loyalty from them, by favours them, who was giving him with loyalty. Hence, Shaikh Ghuran, who was the most loyal companion of the Mughals, the title Fath Khan was given to him and was appointed the chief mediator between the Emperor and the Afghan chiefs who wished to offer submission.[9] Many of the Afghans fought on the Mughal side in the battle of Khanwa.

The Afghans were not forced to adhere to the courtesy of the Mughal court. Babban who violated the court's courtesy by sitting in the royal presence, while all other grandees supported, was not asked to stand up.[10] Besides, Babur was generous even to the insurgent Afghan side.[11]

---

[1] Babur, *Baburnama*, p. 539; Zain Khan, *Tabqat-i-Baburi*, p. 168.
[2] Zain Khan, *Tabqat-i-Baburi*, pp. 151-153, 169; Babur, *Baburnama*, pp. 539-40.

[3] Babur, *Baburnama*, pp. 539-40;Abul Fazl, *Akbarnama*, Vol. I, p. 257.
[4] Babur, *Baburnama*, p. 540;Abul Fazl, *Akbarnama*, Vol. I, p. 257
[5] Babur, *Baburnama*, p. 530.
[6] Babur, *Baburnama*, p. 544;Badauni, *Muntakhab-ut-Tawarikh*, p. 446.

[7] Babur, *Baburnama*, p. 557.
[8] Rita Joshi, *The Afghan Nobility and the Mughals (1526-1707)*, p. 43.
[9] I.H. Siddiqui, *Babur's Relations with the members of Afghan nobility in India*, Islamic Culture, Vol. II, No. 4, 1978, p. 251.
[10] Babur, *Baburnama*, p. 446; Ferishta, *Tarikh-i-Ferishta*, Vol. II, p. 43.
[11] Babur, *Baburnama*, pp. 540-41.

Constantly, Babur granted jagirs to his nobles. He provided to the Afghans profitable jagirs,[1] especially in the eastern areas where he was very generous towards the Sur and Lohani Afghans.

Yet, after the battle of Khanwa and Ghagra, the Afghan nobles lost their reputation and their jagirs were taken from them and granted to the Mughal nobles. In 1529-30 they were again granted jagirs at that time their status grew to the state of Babur. The majority of Afghan nobles were recipients of such favours.[2]

Badauni writes, "The amirs of India, notwithstanding his (Babur's) conciliatory behaviour and efforts to improve their fortunes did not yield obedience to him and behaved like unruly savages."[3]

In the first ten years of Humayun's reign there is no idea about the exact position of the Afghan nobles in the nobility. Humayun ordered the Afghan nobles to maintain their jagirs or assignments, which they had got from his father. Gulbadan Begum states that Humayun was happy to order, "Let each keep the office, and service, and lands and residence which he has, and let him serve in the old way."[4]

Abul Fazl writes that in the early years of Humayun's reign, the fort of Chunar took by Sher Khan Sur and sent his son Abdul Rashid to the Mughal Emperor. Abul Rashid stayed for some time at the Mughal court.[5]

Yet, Humayun sent Dilawar Khan as Mughal ambassador to the court of Sultan Mahmood in 1539; he was the ruler of Bengal.[6] When there is campaigning against Sher Khan, he appointed Khan Khanan, Dilawar Khan, Yusuf Khan as his governor of Monghyr, ordered him to keep the opposition of Sher Khan.[7] Later, the Mughals losing

---

[1] Rita Joshi, *The Afghan Nobility and the Mughals (1526-1707)*, Appendix-B (Grant of Jagirs to Afghan nobles under Babur), pp. 208-209.
[2] Nurul Hasan, *New Light in the Relations of the Early Mughal Rulers with their Nobility*, Proceeding Indian History Congress, 1944, pp. 387-97.
[3] Badauni, *Muntakhab-ut-Tawarikh*, Vol. I, p. 337.
[4] Gulbadan Begum, *Humayunnama*, p. 110; Nizamuddin Ahmad, *Tabaqat-i-Akbari*, Tr.B.De. Vol. II, Calcutta, 1936, p. 44.
[5] Abul Fazl, *Akbarnama*, Vol. II, p. 288.
[6] Abbas Khan Sarwani, *Tarikh-i-SherShahi*, Tr. Brahmadeva Prasad Ambasthya, Bihar Educational Service, Patna, 1974, p. 2.
[7] Abbas Khan Sarwani, *Tarikh-i-SherShahi*, Tr. Brahmadeva Prasad Ambasthya, op. cit., p. 2.

Bengal, Khan Khanan, and Yusuf Khail was immersed in oblivion. After the battle of Chausa, the army of Sher Khan captured him.[1]

Humayun accepted invitation letters from India;[2] he was completely dependent on his own resources because he was still skeptical about the behaviour of the Afghans.

In the beginning of Humayun's reign A.D. 1556, he swore not to be punished for the Afghans, and they should not be made prisoners.[3] The prisoners did not just leave, but if any Mughal officer strayed from this liberal policy, he was severely punished. There is an example, when Mughal officer Haider Muhammad involved in killing and looting the family of Ghazi Khan, the Afghan chief of Bayana, who had submitted peacefully, Humayun punished him and also confiscated his property.[4]

The defeat of Chausa and Kannauj were yet to remember Humayun, and the high-flying intentions of the Mughal Emperor and his imperialistic designs used to create suspicions in the Afghan chiefs. Abul Fazl, the court historian of Akbar wrote that if Sher Shah and Islam Shah, who had great qualities to serve the Mughals with loyalty, they have to win an honourable position for themselves.[5]

To sum up, briefly, the position of the Afghans fluctuated during the early Mughal period. In the second phase of Humayun's reign in Hindustan (1555-1556 A.D.) the Afghan nobles were a part of the Mughal nobility and did not play any significant role. The attitude of the Mughal ruling family towards them, it was neither aversion nor enemy, nor was very friendly and cordial. Circumstances, the profits and the needs of the situation were predominantly employed by the Emperor towards his Afghan nobles. Babur mentioned in his *Baburnama*, his kindness towards the Afghan nobles. But his experiences with the Afghan nobles broke his faith in them and he never trusts the Afghans. After the commencement of a few years of Humayun's reign there is the establishment of the second Afghan Empire, whose leader was Sher Shah Sur created the powerful Afghan nobility. The reason the Afghans lost Hindustan because they were suffering from mutual jealousies and rivalries. They lacked intelligence. The Afghans were generally uncontrolled, rebellious, rude, uncultured, pastoral, quarrelsome, disturbed, proud and haughty. Diplomacy was used by Babur to win Afghan's co-operation, he bestowed upon them jagirs and marks of honours.

---

[1] ibid., p. 273.
[2] Abul Fazl, *Akbarnama*, Vol. I, p. 614; Ferishta, *Tarikh-i-Ferishta*, Vol. II, p. 172.
[3] Abul Fazl, *Akbarnama*, Vol. I, p. 624.
[4] ibid., p. 683.
[5] Abul Fazl, *Akbarnama*, Vol. I, p. 618.

Daud Ibrahim
Research scholar
Department of History AMU, Aligarh

Gulbadan Banu Begum[1]: the author of *Humayun-Nama*

Abstract

Akbar ordered to many people to collect material for Akbar-Nama who remembered anything about Humayun and Babur and must scripted it. Accordingly, Tazkirat ul-Waaqia'at by Mehtar Jauhar Aftabchi and tazkira i-Humayun wa-Akbar by Bayzid Bayat were still available. and Gulbadan's work on Humayun-Nama was according to this order. Gulbadan has described many things in Humayun-Nama about Babur and Humayun's life which were not available in any books and it played very important role for the work of Akbar-Nama by Abul Fazal. In this research paper I will through some lights into the life of Gulbadan and will show the importance of Humayun-Nama.

Gulbadan Bano Begum was daughter of Zahiruddin Muhammad Babur. Dildar Begum[2] was her mother. After 19 years of capturing of Kabul by Babur, Gulbadan was born in 1522/23 AD.[3] Babur left his family in Kabul while he was in campaign for *Hindustan*. After three years Gulbadan with royal ladies (Haram) reached Agra to accompany Babur and celebrate his victory in 1529 AD. Gulbadan was alone and without her father for 3 years.[4] Gulbadan was 2 years old when Humayun's mother Maham Begum took her custody for her education and caring.[5] It is known from

[1] Princess rose body
[2] According to the Islamic law, they had a place among the main four wives. From this, Mirza Hindal was also born, which was adopted by Maham Begum IN 1519. For more details, see, Gulbadan Banu Begum, *Humayun-Nama*, edit. A.S. Bevridge, Royal Asiatic Society, London, 1902,pp.225-26
[3]Rumer godden, *Gulbadan*, The Vikins Press, New York,1981,p.9
[4] Gulbadan Banu Begum, *Humayun-Nama*, trans. Athar Abbas Rizvi*, Mughalkaleen Bharat (Babur)*, Rajkamal, New Delhi,p.59
[5]Bevridge, Humayun-Nama,p.8

Humayun-Nama that the main cause for her custody was the demise of Maham Begum's three sons and one daughter at very early stage of their lives.[1]

When was Gulbadan married ? It is not clear & known. Through *Humayun-Nama* we got to know that when Humayun got defeated in battle of Chausa (1539 AD) and went to Agra then Gulbadan appeared in his service where she might had married.[2] Khijr Khwaja khan mughul[3] was her husband who was Amir ul Umra of Humayun. After Babur's death[4] Humayun took care of his mothers, brothers, and sisters. He had more affection towards Gulbadan. After his defeat in the battle of Chausa, he returned and showed his affection in these words, "Gulbadan, I missed you a lot. Sometimes, I feel very bad and remorse for you that why you are not in my company but when situation got out of control sometimes, I thanked god that you are not with me."[5]

Humayun had a lot of affection for women-folk who were in his *Haram* especially for Gulbadan. Gulbadan gave one example of this in *Humayun-Nama*. When Maham Begum died, he (Humayun) personally paid visit to her. Before this, any meeting between Humayun and Gulbadan used to be held in Maham Begum's house.[6]

Gulbadan got a lot of honoure and praise even after the death of Humayun and during the reign of Akbar too. In 1575 AD Akbar gave permission to Gulbadan to go for *Haj*. In her group, besides her, there were Salima Sultan Begum[7], Sultanam[1], Haji, and

---

[1] Gulbadan Banu Begum, *Humayun-Nama*, trans. Athar Abbas Rizvi*, Mughalkaleen Bharat (Humayun)*, Rajkamal, New Delhi,p.22; Gulbadan Banu Begum, *Humayun-Nama*, hindi trans. BrajRatanDas, Nagri Pracharni Sabha, Kaashi,2008 sanvat/1951AD,p.12

[2] Ibid,p.23

[3] He was son of Mirza Haidar Dughlat's sister. For more details see, Rumer godden, *Gulbadan*, p.79

[4] Gulbadan gave a very interesting details about the donations and gifts given after Babur's death. She writes that Quran Khwani was organized on the death anniversary of Babur at her Baba hazrat Badshah and Mohammad Ali appointed mutwalli (care taker of tomb). Sixty Hafiz (who memorized the whole Quran) with melodious recitation and Qazi (who recites the Qran with meaning) were appointed. Five lacks financial grant were allocated to fulfill the expenditure incurred by these Ulema and Hafiz. This entire amountwere taken from Sikri (Fatehpur) and Bayana as a tax. My guardian (Maham Begum) arranged two times meals. In the morning, two bull, two sheep, and five goats and in the evening five goats were slaughtered. She lived two and half year and continued to arranged and distribute the meal while she was living.; *Mughalkaleen Bharat (Humayun)*, p.503-04

[5]Athar Abbas Rizvi*, Mughalkaleen Bharat (Humayun)*, p.527 ; Rumer godden, *Gulbadan*, p.79

[6] Ibid, p.504

[7] Wife of Akbar, see, Bevridge, Humayun-Nama,p.276-80

Gulzar begum[2], two niece of Gulbadan- Umme Kulsum and Salima Khanam accompanied her.[3] This kafila (campaign) started from Fatehpur in 1575 and Akbar himself sea-offed them. Many difficulties were faced by them while they were in the *Haj* pilgrimage and this is described in *Tazkira i Humayun wa-Akbar*.[4] In 1582, *Kafila* returned. In 1603 AD she died due to fever. In her last rite, Hamida Bnu Begum and Rukayya Begum[5] were present.

HumayunNama

One copy of *Humayun-Nama* is still available, present in British museum even this copy is not complete. Colonel Hamilton who went to Europe from India took thousands of books with himself, *Humayun-Nama* is one of that. In later period, this book (*Huayun-Nama*) was sold to British museum by Hamilton's widow. Annette S. Beveridge had translated *Humayun-Nama* into English and it published from Royal Asiatic Society in 1902. Credit of Hindi translation of *Humayun-Nama* goes to Braj Ratan Das, which was published in 1980 from Kashi Nagri Pracharni Sabha. Later in 1961, Athar Abbas Rizvi translated the hindi translation that is considered an important translation.

Humayun-Nama of Gulbadan can be divided into two parts- part one talks about Babur and part two talks about Humayun. She gave some rare and interesting information about Babur. For example, after capturing Delhi, he donated a lot of wealth which were captured during war. Babur sent one *Muhar* (the seal) to his obedient servant who used to live in Kabul at that time, while he got the information about gift of one *Muhar*, he felt very bad but when he saw the size of *Muhar*, he jumped with joy. This event was beautifully narrated by Gulbadan.[6] It is Gulbadan who has written about the death of Babur which was due to poison given by the mother of Ibrahim Lodi.[7]

---

[1] Widow of Mirza Askari
[2] Daughters of Kamran
[3] Athar Abbas Rizvi, *Mughalkaleen Bharat (Humayun)*, p.25
[4] Athar Abbas Rizvi, *Mughalkaleen Bharat (Babur)*, p.60
[5] Daughter of Mirza Hindal and first wife of Akbar. She died at the age of eighty four.; Bevridge, Humayun-Nama,pp.274-75
[6] *Humayun-Nama*, hindi trans. BrajRatanDas, p.12; Athar Abbas Rizvi, *Mughalkaleen Bharat (Babur)*, p.60
[7] Ibid,p.61

Gulbadan's work is mainly the history of Humayun. She has briefly written about the campaign of Humayun and his policies but she gave detail information about the *Haram,* the activities inside the *Haram* and life style of begums. Humayun love and affection for his family was immense and nowhere is it better found than in Humayun-Nama.[1] Humayun offered kingship to a slave who saved his life while he was in the battle of Chausa. And it is beautifully discussed by Gulbadan.[2] She got the information of Humayun's departure from Hindustan and his staying in Iran and many important events related to Humayun in Iran, she got all these information from Hamida Banu Begum. For that she was grateful to Hamida Banu Begum.

We see, *Humayu-Nama* was not only the source and inspiration for Akbar-Nama but it also gave many interesting information which were rare and exceptional in nature. By studying *Humayu-Nama*, we got a lot of information about Babur and Humayun.

[1] Athar Abbas Rizvi*, Mughalkaleen Bharat (Humayun)*, p.27
[2] Ibid,p.528

Ms Jinat Rehana
Research Scholar,
Dept. of Arabic, Persian, Urdu and Islamic studies.
Visva-Bharati, Santiniketan.

Social condition of women during Mughal India

India have very rich culture of religion, civilization and ethics, but the country have unity in diversity in all the way. The dimensions have wide variety of its range. Women education, both among Hindus and Muslims were not encouraged during medieval times. The stick rule Pardah and seclusion made their education a matter of great difficult.[1] During the period the followed in vedic age gradual deterioration of their position, but they still retained a large major of freedom in the disposal fortune.[2]

The Mughal emperors who were themselves men of literary tastes, took King Interest in education of their children including their daughters, for the princess of the royal.[3] Strict veiling of women was the common practice among the Muslims. The adoption of the letter custom by The Hindu women under the stress of circumstances brought about their social political and intellectual stagnation and their position of girls, wives, and widows was reduced that of dependence and subordinates.[4] Majumdar and Rasid in their works have not been isolated in stands of etc. in prevalence ancient India. Dr. Altekar, he subsequent to the advent of Muslims rule in India. Pardah was strictly observed in their native lands.[5] Emperor Akbar himself had valueless formal educations; he was very much interested in educational process as a whole, and also that after Royal Princess and ladies. He made proper arrangement empowering education to the ladies of the imperial seraglio. It is said, that he said apart Some chambers at his Fatehpur Sikri place in order to established a girls school for them and also appointed

[1] S.M Jaffar, *some culture aspects of Muslim rule in India during the period*,(QTD)
[2] *The spirit of India civilization* P.157.
[3] Yusuf Husain, *Glimpses of medieval Indian culture*, P.92
[4] Rashid, A, *society and culture in medieval India*, 1969. PP 141-42
[5] Ibid P. 206; *The position of women in Hindu law*, P. 170

some mistress to work in it.[1] Whenever the royal ladies moved outside of their Palaces, they put on usually quite veils which cover their faces, and the seldom travelled on foot.[2] They mostly travelled in covered Palanquins with servants and Eunuchs Surrounding them all sides. At the entrance of residence male Palanquin, bearers where replaced by females to carry the palanquins farther inside.[3] The royal ladies also travel in cover howdahs on Elephant backs, chaudoles sometime in carriages covered on all sides to maintain *Pardah.*[4] When a royal lady rode and Elephant the animal was make to entertained near the palace gate and the Mahout covered his face with a cloth so that he was unable to see the princess[5] when she entered into the covered howdas. Whether the ladies travel in palanquins or chaudoles or howdas or carriages proper care was taken to hide them from[6] the few people outside and they became almost in accessible to the side of man.[7] It was the usual custom for husband or some other male relations to accompany woman when going out of doors. Muslims women covered themselves from head to foot apart from that they have a sheet or dupatta to cover their heads. The birth of daughter was considered inauspicious. Family not welcome or accepted them happily but indecisive of disappointment. She was not as welcome as a boy, even in the royal family the difference was clear and well-marked only women rejoiced and feasted on the birth of a daughter while the whole Court took part in the celebrations if a prince was born..

A wife who unfortunately happen to give birth to birds in succession was despised and even sometimes divorced the deployable custom of infanticide was luckily confined only to a very minor section of the less cultured Rajput families.[8] The Quran, no doubt, permits a Muslim to marry four wives at a time but monogamy seems

---

[1] E.B Havell, *A hand book to qra and Taj* (London:1904). P.116

[2] Badaoni, 11, pP.391-92; Tr 11 404-06

[3] De-Pleate, *observed the mahumentan women do not come out into public unless their poor immodest; the veil their heads debate* P.81

[4] Bernier, P.371, *peter mundy vol*, II pp 190-91

[5] De-pleate P. 81; Della Valle, P.24.

[6] Mandelslo, P.66; *Terry in early Tranelism India*, P.404.

[7] Manucci, Storia--, Vol, II, pP. 333-34.

[8] Saying of Khan-i-Azam Mirza Aziz Koka vide I.N., P.230.

to have been the rule among the lower stratum of society in both the communities during the Mughal period. Inspite of the decision of the ulema in the Ibadat- khana- that a man might marry any number of wives by Mutah, but only for Nikah.[1] Akbar had issued definite orders that a man of ordinary means should not passed more than wife unless the first proud to be barren. He considered it highly injurious to a man's health to keep more than one wife.[2] Polygamy was the privilege of the rich Muslims. Each of home kept three of four wives at a time. Mirza Aziz Koka's well-known prove red deserves mention. He used to say that "A man should marry four wives – " A Persian to have somebody to talk to, a khurasani for his house work , a Hindu woman of Mavarunnahar to have someone to whip as a warring for other three.''[3] The co-wives rivaled each other and used old eves to excel on another thereby win the love of their husband. Each of them received fixed monthly allowances in addition to cloths, Jewelry and the householdnecessities. Polygamy naturally brought many evils in its train. A single husband could he hardly be expected to satisfy his several wives who were the most expensive clothes are the daintiest food and enjoyed all worldly pleasure.[4] Domestic unhappiness immortality, in some cases at least was the natural consequence. As a general rule, a girl of either community was brought up under class parental supervision. Higher education was denied to middle class and ordinary ladies and learning was restricted to primary subjects .Their training was confined to home and domestic affairs, such as needle work, embroidery, dressing the victuals, cooking , extra life-long celibacy for girls and socio-religious circumstance of the time ,parents tried to marry of their daughters as early as possible the custom in this days did not allowed girls to remain in their parent's home for more then 6-8 years after their birth. They were married even before the age puberty usually when 6-7 years old.[5] The rigidity of custom coupled with the celebration of the marriage at that every tender age, left no room what so ever for lighter the bride or the bridegroom to have time to think of a mate at her all his own choice . The custom left it solely to the discretion of parents or all the nearest relatives

---

[1] A,N,I, (1873) P.327(QTD).

[2] Saying of Khan-i-Azam Mirza Aziz Koka vide I.N.P- 230

[3] A , N , I (1873) P.327, (QTD).

[4] Altekar, P.49. For dowry refer to purchase India, P.191.Saletore, oP. cit II, pP. 190-91.

[5] Dasgupta , I.C , Aspects of Bengali Society P.3 as quoted in Misra Rekha women in Mughal India P.131

and friends to arrange the match seldom was their wish expressed by any female relation of the bridegroom to see the bright before the marriage.[1] The marriage had to be settled on hearsay repast with an advantage to the bride's parents who had on opportunity to see the bay and satisfy themselves about him, if they so desired dowry was demanded and sometime parents disregarded the suitability of the match and cared primarily for a rich dowry. It seems that the "Evils of the Dowry system prevailed with greater vigor in Bengal. There was also a curious custom of giving away a younger sister of the bride to the groom as a part of the dowry. In same casts and localities the bridegroom had to pay money to the bride's guardians." Money played an important part when marriage was arranged between persons of unequal ages or social status. Sometimes for the sake of wealth a young man would marry a women a older than himself. The evil grew so much that Akbar issued orders that of a women. "Happened to be older by 12 years then her husband the marriage should be considered as illegal and annealed." In some cases betrothals were fixed, as we see even today among the rural folk before the actual birth of their children if dearth or sex disapproved not. "Akbar tried in vain to bring home to his people that the consent of the bride and bridegroom as well as permission of the parents was essential before the confirmation of the engagement."[2] There seem to have greater liberty for girls belonging to high class Rajput families to choose their husband. Hamida Banu expressed the feeling that she wanted to be the wife of someone who "shall be a man whose collar my hand can touch and not one whose skirt it does not reach."

From the few instances discussed hear, it can be clearly seen that all Mughal ladies were not devoid of love, but love touched the lives of very few women. There were so many wives and concubines for one man and it was not possible for only man to give attention to all of them. Usually the ones they loved most all their love and attention. Sometime the wives got their husband's attention because the husband felt that it was the duty to do so. The Mughal emperor and princess did have some special women the loved and cared for but they also had a number of their women like concubines, dancing girls and slave girls whom they could use for their pleasure as they liked. Many Mughal princesses were never got marriage probably because no man was considered worthy

[1] According to the traveler, they considered pregnancy to be a very clear proof of the blessing of Goddess Lakshmi Bartolomeo, pP.253-5

[2] Qazwini, Pad Shah Nama, fd 48b

enough to marry them and also may be to limit the Contenders for the throne. Pelsaert says " These rich women were indeed, the most expensive cloth…, and enjoy all the pleasures except one and for that one they give saying they would willingly give everything in exchange for a bagger's poverty."[1] Under this circumstances ordinary Indian girl had no choice in the selection of her husband married the mother-in-law controlled over her and commands might be carried out. If she failed, to come up to her standard she might be divorced in a Muslim family her position was no better than that of an ordinary maid. She had no placed and every member of her husband's family by rendering every possible domestic services. Bartoloneo notice with appreciation, the great respect paid to pregnant women: not only her husband and relations, but all the inhabitants of the place belonging to her cast played for her health and safely. But for a certain number of days after delivery she was not considered fit to be touched by anyone except the mid-wife who attended to her needs, her food. According to Manucci would be left at a distance and would approach her last he or she should be defined the position of a woman with regard to her husband was that of a dependent.[2] As a result many love affairs between Eunuchs, and harem women came to be established. K.S.Lal. States that: some Eunuchs were born inter- sexual with characteristic of neither sex fully develop due to hormonal genetic disturbance. Some others were hermaphrodite who combine characteristics of both sexes..... but such causes are rare..... The vast majority of Eunuchs were strongmen who were subjected to castration. Some Eunuchs were very handsome. Thomas Row mention an affair between are gentlewoman of Normalls and Eunuchs.[3] Manucci and Bernier speak of the love escapates of Sharjahan's daughters Jahanara and Roshanera.[4] Jahangir write in the Tuzuk: " it is a maxim of Hindus that no good deed can be performed by men social without the partnership or presence of wife home they have stayed the half of man." some of the husbands however, it is to be regretted treated their wives very harshly. Such men, however suffered from same material defect, such was Khwaja Muzzam, maternal uncle

[1] Pelsaert, P. 66.

[2] According to the traveler, they considered pregnancy to be every clear proof of the blessing of Goddess Lakshmi Bartolomeo, pP. 253-54.

[3] Mannucci, storia… , vol.2, P.353.

[4] The Mughal harem, P.188.

of Akbar."[1] According to the traveler, sometimes husbands would burn themselves with their wives out of there love. Divorce and remarriages common among Muslims were prohibited to Hindu women widow remarriage was allowed by Muhammadan law and was practiced by the rich and the poor alike. However, it seems that many widows, particularly those belonging to a respectable family preferred not to marry again due to the impact of Hindu ideas.[2] Sometimes Brahmans left large amounts of money for the maintenance of their Widows. Record told us that the period of Mughal kings who would travel some stages to receive their mothers.[3] They would perform Kornish, Sijda, Taslim, when entering their presence. Jahangir writes :" I want to meet my mother Dhar (near Lahore) and performed Karnish, Sijda, Taslim with all obedience and then took have of heart."[4] On his birth day, the Mughal emperor accompanied by Princess and noble would necessarily pay a visit to his mother to receive her felicitation, and present her with rare gifts; sometime the weighing ceremony took place in her Palace.[5] So far, as property rights were concerned Muslims ladies wear Much Better Off than there Hindu sister. Muslim ladies was entitled to definite share in the inheritance with an absolute right to disposed it of unlike Her Hindu sisters she retained this right even after marriage another method adopted to safeguard the interest of Muslim ladies after marriage was Mohar of all settlement where is the Hindu lady had no right to the property of her husband parents

. About the immovable property Orame, rights:" no property in land at admits of disputes concerning them. The slavery to which the rights of parents and husband the subject the female abolishes at once all fruits of dowries, divorce, jointures and settlements.[6] Stavorinus writes:" Moors and Bengalese take great delight in having women dance before them who are kept for that purpose and are educated from their infancy in the pursuit of this function[7]." They were extremely supple and were adopts in

---

[1] Roe, vol.I, 190

[2] Tavernear III, P.181

[3] TUZUK, Lowe, P.62

[4] Muhammad is reported to have said, women under Islam P.13.

[5] TUZUK, Lowe, P.62 Also see Macauliffe I, P.96

[6] Orme's fragments, P.438

[7] Manucci.. Storiea, II P.337.

the art of dancing. Muslim women usually liked to take up this profession and some Hindu women were employed as musicians,"[1] prostitution and some Hindu women were employed as musician. Prostitution was regarded as a disgrace though some of the meaner short adopted it and lived in separate quarters, usually outside of the city.[4] In fact there was a separate cast that followed this profession. The could be recognized by the "To facts of task of silk on their shoes or slippers, all other wearing plain. The more educated among them adopted teaching as a regular profession. Manucci writes: "among them (Royal Household) there are matron who teach reading writing two princesses. The Mughal ladies apparently led very lonely lives in their harems through they had several people in the form of relatives, servants, attendance and guard, slaves around them most of the times. But to feel their mental emptiness, they found many ways means to entertain themselves. Chess or Shatranj one of the most popular indoor games one with Mughals. Painting of those times reveal , The women's interests towards it. Apart from Abul Fazal, Badauni and even Manucci in his accounts talk about the popularity of this game among the Mughals. Manucci mention Chess combat which lasted for three days and was played between Jahangir's Courtier Khan-i- Khanan and Shah-shafi of persia. Aramjan Begum one of the Jahangir's wives was a well-known chess player.[2]

Another popular games of Mughal was Chopper both men and women interest in it and this game has excited in our country since ancient times on the same board. Three types of games were played under three different names-Chauper, Chausar,and Pachisi with certain differences. Emperors Akbar and princess zeb -un-nisa is said to have been fond of the game of Chaupar.[3] Babar nama mentioned that playing cards(ganjifa) was popular pastime of the Mughals.[4] Akbar, Shahjahan among with the Mughal ladies played this game past time. Chandal mondal was game invented by Emperor Akbar. Game of dice(gambly) was a favourite pastime of all classes of people.[5]

---

[1] For details refer to P.N Chopra, " Experiments in social reforms in Medieval India, Ramakrishna cultural heritage of India, vol. II. PP. 165-66.

[2] Manucci.. Storia, II PP.330-31.

[3] AAIN-I – Akbari (tr) , vol-I, PP. 316-19.

[4] Rekha Misra , women in Mughal India pP.85-86.

[5] Tapan Kumar Roy Chowdhury, Bengal under Akbar and Jahangir (Calcutta 1953), pP.193-203.

Ankh michauly is and Indianised from of the Game hide and Seek. In Fatehpur sikri there was a section of the living quarters known to have been built for the purpose of this game.[1]

Dancing, singing, and other sources of entertainment inside the harem during the Mughals. Jahangir and his women are great singer for their times.[2] Manucchi tell us that Jahanara Begum was much fond of singing, dancing and other forms of entertainment. Mughal ladies past their time in reading books like Sheikh sadi shirazi's Gulistaan and Bostan. Some mughal ladies like Gulbadan Begum, Salima Sultan Begum, Nurjahan, Jahanara and Zeb -un- nisha composed poetry and other works of literary value. Noor Jahan's mother Asmat Banu Begum invented perfew from rose petals and named it Itr - I -Jahangiri. Contain royal ladies Noorjahan and zeb -un -nisha were even skilled at the use of arms and certainly use this special skill as an engaging past time. Mughal ladies spent a lot of their money in getting torches lighted in hundreds and thousands.[3] Though Islam puts a strict ban to use of intoxicant but Mughal emperor and the royal ladies drunk wine and consumed intoxicnts quite frequently. Apart from various types of wines different kinds of intoxicants were used during the Mughal days. Some of them ware opium (Afyun or Afin) bhang, Choras, ma' jun, ganja, hashis etc. The Mughal ladies also smoked water pipe aur Pukkar as known from contemporary paintings.

Manucci farther adds;" Many a time she did not me the favour of ordering some bottles of it to be send to my house insigne of her gratitude for my curing people in her harem."[4] Mughal ladies like NurJahan Begum and Zeb –un- Nisha- Begum were skilled in the use of arms. Aasaish Banu Begum daughter of Murad Boks and grand daughter of ShahJahan to have been a good hunter and day perfect shot. Gulbadan Begam maintains some women who were able to shoot with the bow and arrow, played Polo etc.[5] Ishq -baazi (pigeon -flying), Animal fights were greatly enjoyed by the Mughals. Fights were arranged between tiger, elephants and other ferocious animals, emperors like Akbar, Jahangir and ShahJahan were much fond of these short of

[1] Md. Ashraf Husain , A guide to Fathepur Sikri pP.16-17.
[2] Pelsaert,Remonstramtie, tr, moreland & Gyel, P.65.
[3] Manucci.. Storia ; vol-II P.325-34
[4] Manucci.. Storia ; vol-I. P. 211.
[5] Humayunnama (tr,) pP. 120-121.

entertainment combats like boxing, wrestling were also announced between men.[1] Some other forms of outdoor sports and amusements were archery, Mock fights blind man's buff, Javelin- throwing, ball-throwing, climbing trees, etc. There were a large number of Persian and Turani boxers at Akbar's court in all these, the Mughal ladies participated as spectators.[2] The Mughals also adopted celebrated certain Persian festivals which became very popular among them, like Ab -I - Pashan (memory of rain), Nouroz (the Persian new year's day) etc. Mina Bazaar(Khushru) a special kind of fair which was held usually lasted for eight days. was held once a month and also it was held as a part of the Nauroz celebration."[3] Marriages of Emperor and other members of the Mughal royal family used to be celebrated in extreme grandeur and a amidst gaiety and merry making.[4] In such occasion the royal ladies had and important to play. The Royal marriages were usually arranged by the emperor, even in the case of love matches. But the entire responsibility of arranging the feasts and festivities depended on important royal ladies of the Mughal harem.[5] Marriages were celebrated lavishly .The Emperor's birthday was another extremely joyous occasion of the Mughal court. Coronation festivals was a another grand festive occasion at the Mughal court was when a new king came to the throne.

Inspite of Purdah which of obstructed high class ladies from participating in the social life of the nation, quite a large number of talented women made different spheres during the continue of Mughal rule in India.[6] The women of richer classes were well educated and many of them were not only patron of the learned but themselves were poetesses of distinction authorized of scholarly works. Gulbadan Begam the author of the Humayun Nama, and jahanara, the biographer of Shibyah and Munisul Arwah, hold on enviable position among the literary figures of that age. Jan Begum the daughter of khan -i-khanan, is said to have writter a commentary on the Quaran. Mirabai, Salima Sultana, niece of emperor Humayun, Nur-jahan, siti -un-nisa, the tutors of jahanara and

---

[1] A.L.Srivastava , Akbar the great vol – III (Agru : 1972) pP.211-212.

[2] Akbar Nama (pr) vol – II P.13 ; (tr) vol . II pP. 23-24.

[3] TOD, The Anals and Antiquities of Rajasthan , vol. I , P. 401. Lahori , Badshah Nama , vol . I Pt. II , PP. 266-68.

[4] Nol . Mathur , Red Fort – and Mughal life (New Delhi : 1964)PP. 42-43.

[5] Qazwini , Pad Shah Nama , fol. 486.

[6] Travels in India in the century , p. 281.

renounced as " The princes of poet" and zeb -un –nisa, the eldest daughter of Aurangzeb, were poetesses distinction. The authorship of Diwan -i-Makhfi is as ascribed to her.[1] In the administrative sphere, they did not lag behind. Some of the greatest women administrator of all age belong to this period. Muham Anaga (doing the Akbar) control the affairs of the state for 4 years(1560-64), Chand Bibi's name shines brilliantly in the annals of Ahmednagar, and Makhduma - o- Jahan ruled the deccan very ably as a regent on behalf of Nizam Shah of the Bahmani family.[2] Sahibji the daughter of Ali Mardan, was a wonderfully clever, and able lady. She was the actual governor of Kabul during her husband's viceroyalty.[3] She displayed her grate administrative qualities after the death of her husband by ruling over the turbulent Afghan without allowing any serious opposition,[4] Nurjahan," The light of the world" was real power behind Jahangiri thrown. so supreme was her sway over the emperor, who had for all practical purpose Sold the empire for "A Battle of wine and piece of meat." That even the proudest peers of the realm paid their homage to her, knowing full well that word from her would make or mar their career.[5] "when impower she ruled everything when out of power she obstained religiously from all active life." Such was her nature. Chand Bibi, a famous Muslim heroine personally defended the fort of Ahmednagar against the mighty forces of Akbar. Nurjahan gave ample prove of her martial capabilities in leading an attack against Muhabat khan.[6] Search examples can be multiplied. But these are enough to show that medieval Indian ladies could defend themselves and their country.[7]

Now, I tried to analyze the social end with women during Mughal period. The vail, Purdah and religion- three path way came together and bounded the people in a particular Domain. The main resources of these analyze the data during the Mughal periods are: 1) the religious books (Holy Quaran and Hadis), 2) biography of renounce personalities (Like, Babar Namah, Humayun Nama, etc.), 3)The description given by

[1] Mannucci..Storia , II PP . 330-31.
[2] According to Abul Fazal , She distinguished herself by her courage, counsel and magnificence A..N , II PP. 209 and 214; tr, Ii, PP. 224 and 230.
[3] Smith, Akbar the great Mogul , PP. 69-70.
[4] Sharma G.N, Mewar and the Mughal Emperors , p. 50
[5] Queen Dowager of Bijupur , sister of Burhan – ul- Mulk of Ahmadnagar Ferishta, III, p. 312
[6] Outlines of Islamic culture by A.M.A Shustery , vol. Ii appendix A,P. 771.
[7] Studies in Mughal India , PP.114-117.

traveler and messenger who were came from different parts of the world, and 4) Writings Of renounced historians, critics and related available data from the archives.

Like all other different religion Islam also interpreted its rigidity and made women as either kept in over protection or they are force to act as subordinate or slave during the Mughal periods. Though rich and higher class women in the society can exempted for access education but still it was high priced. Maulovies, the Kurueys, the Moulanas, and the shaikul- Hadish came for royal ladies in Mughal harem. They helped the royal women to learn more Islamic religion rather than Islamic knowledge and theology. Minimum learning of Quaran and Hadish were considered enough for a normal girl in the society. Dowry and its counterpart "Denmohor' spreads every spheres of the society and those have money they were became decided factor. Marriage for women was severe important things for every religion of the Mughal society. Apart from that marriage of king's girl or children became a nightmare for their parent as birth of a girl considered as an auspicious for their parents. Society or soçial structure were very rigid or Conservative during that era and women were suffered in both personal and social spheres. In personal sphere, they were dominated by their father, mother, brother and community people in some extend. On other hand, if we looked in their social sphere, they always forced to obey their husbands order or permission to do anything. They have no choice and freedom to do their favorable and pleasurable any activities if they want to do so, they were punished accordingly Sharriyat law. Though same emperor gave liberty for their adorable lady to perform themselves as they want. This thing took places as Babar for his daughter, Humayun for his son's midwives, Akbar for Jodhabai, Jahangir for Nur Jahan, Shah Jahan for Mumtaz Mahal and his two daughters jahanara and Roshanara, etc. Both Hindu and Muslims women wear bounded within certain domain by their religion, husbands and their son. Different traveler those who came in India during the Mughal period , they all were male and they analyzed this patriarchal society with a lot of mystic symbolization or sometimes they were bounded by their patronized authority –The Emperor.

These traveler always maintained good relation with the emperor and the executive of the dynasty and they described the matter through the eyes of them. Language in some extended created a barrier to got proper imformation at that time. Common people in the society considered these travelers as the representative of the emperor or as an outsider. They were not able to came in front of them to share their

experiences. So whatever we got from their writing (except the description of the Royal Society) were not too much reliable. The same things are extended within the writings of biography. Though in biography, some where some times we got reliable information about the social and cultural life of the royal ladies and their love domain.

prostitution played an important role to describe the rich cultural heritage of the Mughals as well as their cruelty, charm and ignorance of those highly learned girls in singing & dancing spaces. Different Gharan's and traditions and Indian Classical Music touched their maximum optimum level. These girls were very influential and they also recruited as personal body- guard of the emperor. khajas, concubines, and beloved wife of the king can explore various different leisure and entertainment as they want. Widows, middle class families, migrated families and orphan daughters were on the same boat in the society-- Widows never got the permission of remarriage usually i.e. or they were not got any kind of job in the society. Hindu widows have the option to became Sati's but Muslim women have no rights in property, no rights to participate in any pleasurable activities and entertainment festivals, and cultural events. They were considered as "loss property", till in the first half of 19th century that I can see in the writing of Chitra Dev in her 'Oborodh Basini ', Fojilutinnisha chaudhury and Begam Rokeya in their Jenana Mehfil, Korim -un- Nisha, Selina Hasan and Soffia khatuns in their writing in Oborodh Basini and Antohpurerkotha". common people of the society during that time were characteristically Monogamous in both the religion but Royal families and Emperor usually got married in many times. Marriage become a political decision in many times. Mughals penetration mostly in the western part, southern part through marriages. Emperor wives Were became rival of each other and they tried to control the king in mostly decision making and external affairs. Many wives were also a great Shooter and some of them where political ambitious and they became the " Crown behind the thrown" by their beauty, charm and expertized coordination of events. They engaged the king in either different cocktails or mocktails or with the expert concubines, and took away the king from the capital through organized various mock war and huntings. These wives are the causes of detoriation of the Mughal Empire in India. Secret Murders, war for beauty and attached 'others' were became a general stylization of many Mughal's king.

Though some Mughal princess were never got married but they enjoy all the pleasure and sometimes they were became very rich by adopting the profession of

Merchant. Royal emperor's mother always received kurnis, sijda and taslim but all were not very fortunate .Common old lady of the society are became victimized by their home and they were acted as fairytells spoke person for their grand son and daughter. Sometimes they even not food and other necessary daily equipment for their living. Widows and divorced women were also on this same platform. Casticism, untouchability, deprivation and marginalization of the particular groups became a weapons against the Mughal Empire. Common people also bounded by the emperor and Emperor bounded by the religion and fairy lady.

Girls were generally educated in their home. The condition of girls education were same as the first half of 18th century. Girls were considered as untouchable by the sun and they were either over-protected or totally neglected in their own household or by their family. Cooking, training of home making engaged them and few extend of mathematics were the subject for them. Parents expected from their daughters became a Hindu or Muslim with their mastery in their compulsory domestic activities like caring the husbands, their child and cooked the food for them. In history, those women learned different things except above mentioned were only possible if their beloved husband permitted.

The purificatory rites of a Hindu begin before his birth. According Hindu law, a person should perform most important six ceremonies, like, Jatakarma (birth ceremony)Namakarma(name- giving ceremony), chuda-karma(hair -cutting ceremony), upanayana (initiation) and vivaha(marriage),and certain obituary rites are observed by the majority of the Hindus. I found that, these rites differes in various parts of this country, but the fundamental principles being the same in everywhere. So, I, conclude that these rites and ceremonies must have been observed in much the same manner in Mughal times as they are today. Of the numerous ceremonies and rituals which now attend a Muhammadan's birth, only Aqiqah has been enjoyed upon by Prophet Muhammad. The other important rituals, such as the naming ceremony, Bismillah(initiation) sunnat (circumcision), etc. owe their origin either to the' traditions' or other Mohammadan works on ethics. Many more have been added, especially in India, through the influence of local custom, prejudices, and superstitions. These ceremonies varies from country to country and in India from province to provinces, but there is general agreement in the number of the main observances everywhere.

The manner in which the Mughal women spent their lives, their places of residence, their food and clothes, purdah and religion, pleasure and past -times, learning and education and even their love and resentments, have always remained matters of interest to many. The Mughal women were no ordinary women. They were royal women. And therefore, their social life was certainly very much different from that of the ordinary women of the medieval times.

Syed Hasan Sardar
Ph.D Research Scholar
JNU New Delhi

Allama Shibli Nomani: An Architect of Modern Islamic Education

Abstract

The Islamic system of education went through a number of phases, from emergence to exaltation to decrease. However, no foreign element, as Britons did, has devastated Islamic scholastic and academic methodology. Thus, Muslims living in this time had an immense need to restore Islamic science and intellectual studies to their valuable heritage, while Muslims were centrepiece for colonial powers who wanted their political and intellectual identity to disappear. Scholars like Shibli at that time played a catalytic role in restoring the science and intellectual genius of Muslim society, as well as the socio-political and economic system. The paper provides a summary of the Shibli's period and its attempts to modernise Islamic curricula.

Keywords

Islamic Curriculum, Socio-Political Impacts, Sir Syed Ahmad Khan, Shibli Nomani, Aligarh University, Risala al Nadwa, Persian and Urdu Poetry

Allama Shibli Nomani (1857-1914), was a prolific writer, scholar, historiographer, poet, traveller and education reformist of Indian subcontinent. He taught Persian and Arabic languages at Mohammadan Anglo-Oriental College in Aligarh. He met Professor Arnold and other Western Scholars during his teaching years at Aligarh. He is influenced and learnt Western ideas and thoughts. Later, he got an opportunity to travel to other countries of his time like Syria, Egypt and Turkey along with Professor Arnold, through this he got practical and direct experience of their societies and later gave modern tinge to his ideas and thoughts. He met with renowned scholar of the Islamic world like *Sheikh Mohammed Abduh* in Cairo. These shaped his future course in the field of Islamic education. His well-known scholarship over historical and philosophical sources in

Arabic, Persian and Urdu placed him prominently among other scholars of the modern Islamic world.

Shibli's birth is indeed marked by turbulence in the Islamic world in general and Indian Subcontinent in particular. The Islamic world is amid of attacks from the British post 1857 Sepoy Mutiny in Indian Subcontinent. The Ottoman Caliphate is on decline and finally defeated by the Western alliances in the first half of the nineteenth century. During this deluge to the modern Islamic world, *Shibli's* writings were like lighthouse to Islamic world.

Through his writings, he made three attempts to revive the dead spirit and enthusiasm of the Islamic world.

Firstly, introduction of the legendary Islamic Scholars and Philosophers ranging from *Imam Abu Hanifa, al-Ghazali, Omar Khayyam* to *Maulana Jalaluddin Rumi.*

Secondly, beginning a series named "The Islamic Hero" with Sir Syed Ahmed Khan's consultation and co-operation that starts with *al-Mamoon* 's biographical work followed by *al-Farooq.*

And, thirdly, reconceptualisation of Madrasa education according to the socio-political needs of the modern world.

While the first two movements were restricted and based solely on literate people, *Shibli* decided to go ahead because he spent most of his life among traditionalist seminaries, scholars and clerics, followed by almost 16 years of teaching experience at Aligarh Muslim University, a prestigious modern and advanced educational centre that provided him with a suitable environment for improving his critical thinking and analytical skills to explore the subject in all its socio-political, historical, and economic aspects. Therefore, he also met Professor Arnold, a famous orientalist and *Allama Iqbal's* teacher. *Shibli* taught him Arabic in exchange for studying French, and it was Arnold's company that brought Shibli into contact with the remarkable Orientalist literature. Shibli observed the efforts of Western scholars in encouraging the expansion of oriental literature when compared to Islamic scholars where the efforts are nil. As a result, he concentrated on creating a framework for reviving Muslims' rational thinking as well as a forum for comparing traditional wisdom to modern knowledge. He thus began the popular journal "*Risala al-Nadwa*", whose primary objective was to restore Muslim's stranded geniuses and to compare traditional and modern narrative and intellectual

sciences. This first issue of "*Risala al-Nadwa*" was published in August 1904, with the assistance of *Maulana Azad, Maulana Sulaiman Nadwi* and *Habib ul Rehman Sherwani.*[1]

Shibli describes the early achievements of "*Risala al-Nadwa"* in the following words:

"*Al Nadwa's* greatest advantage is that it introduced a revolutionary change in the minds of revered Uluma. Inevitably, they were forced to read these articles no matter how much pain they went through to pour an eye on its content. This journal opens up new subjects, modern forms to reserve in Islamic studies, those who liked it started writing for the journal, and its opponent began to follow its trend as well."[2]

The central idea of *Shibli's* reform of education was to bridge the gap between the education Madrasa and modern institutions but the traditionalist clerics and scholars virulently opposed that idea on a large scale. As he expresses in following words:

"Today, the entire Muslim community has split into two groups the traditionalist scholars think that they are engaged in celestial affairs because they believe there is nothing left in this world for them. On the other hand, the modern literates they could not be ideal in religion as they are occupied in earthly education. In the meantime, the both of them are not adherents of *Sirat-e Mustaqeem* that has been explored by Islam."[3]

Allama Shibli had a dream to establish an institution able to fill this intellectual vacuum in the society because all the old and conventional institutions were confined to theological and traditional educational curricula that could not quench the thirst of modern enlightened minds. Indeed, it was *Nadwat al-Ulama*, a Madrasa in Lucknow, which could turn his dream into reality and as a founding member of concerned institute. *Shibli* played a great role to prepare its educational model and curricula as he indicates in his article *Dar al-Uloom Nadwa Ki Ek Aur Khususiyat* (One more attribute of *Dar al-Uloom Nadwa*).

[1]Page 440, Hayat-e-Shibli, Syed Sulaiman Nadvi, Published by Dar ul Musannefin Azamgarh 1993

[2]: Page 441, Hayat e Shibli, Syed Sulaiman Nadvi, Published by Dar ul Musannefin Azamgarh 1993

[3]: Page 11, Shibli Nomani, Prof Akhtarul Wasey and Farhatullah Khan, Al-Blagh Publication, New Delhi 2009

"*Dar al-Uloom* 's primary aim is to create such religious scholars or clerics who are capable of maintaining the values of Arabic and religious studies and encouraging people to study modern education. Then he cited a couplet of great Iranian poet *Sheikh Saadi:*

Dar Kafi Jam-e Shariyat Dar Kafi Sandan-e Ishq

Har Hawasnaki Nadand Jam-o Sindan Bakhtan[1]"

In one hand, the cup of Shariya, in another the anvil of love

Everyone, does not know how to stake a cup against an anvil

Shibli joined Madrasa *Nadwat ul-Ulama* as a president in the following year in 1905. He was most aware of the idea of Madrasa that was built and created during the Muslim rule by thousands of scholars and scientists, and he could be considered the last glimmer of that glory. *Shibli* had a keen eye on all the contemporary academic institutions and their curriculum ranging from Western universities including Oxford and Cambridge University to *Jamia al-Misriya* (Egypt University) and Aligarh Muslim University. He had studied their syllabus and compared it to the educational programmes of the Madrasa. Then he proposed an advanced curriculum for *Dar ul-Uloom Nadwat ul-Ulama* which could equip it with modern languages like English, Hindi and Sanskrit. On the other hand, he sought a solution to the phobia of the subcontinent's Muslim society with English education. He explains in following words: -

“The Arabic scholars, in fact, are preventing themselves from learning English and English but why? They do not believe that English studies are abandoned in Islam despite they think that the English Studies and Skills are restricted to vulgar and common knowledge only, and this dogma has spread on a large scale even in *Nadwa* as well, we have been trying to wipe out this confusion, but no one accepts the change.”[2]

Shibli Nomani faced extreme criticism in the Muslim community over his modernisation efforts against traditionalism and intellectual immutability. He wanted to create a new enlightened and civilised society that could thrive in the Indian subcontinent's pluralistic

[1]: Page 142, Maqalat e Shibli Volume 8, Edited by Masood Ali Nadvi, Volume 8, Published in Matba e Maarif Azamgarh 1937

[2]Page 146, Maqalat e Shibli, Volume 8, Edited by Masood Ali Nadvi, Volume 8, Published in Matba e Maarif Azamgarh 1937

and multi-ethnic community which was impossible with this obsolete system of customary education. In fact, he was a prudent agitator, walking on two-edged sword with bare foot. On the one hand, he was aiming for reformation of conventional Islamic education on the other hand; he wanted to establish a sustainable pluralistic society with equal involvement of both man and woman. Ultimately, he persuaded women to leave their homes and to study equal to men. *Shibli* expresses the same idea in one of his speeches in the following words: -

"Women should obtain as much education as men, I have to disagree with the concept of dividing the academic curriculum on the basis of gender, in my opinion men and women should receive the same syllabus, I stand firmly for women's rights and today, when women work at home as maids, this practise should be stopped in the main time I strongly support the system of veil."[1]

Although *Shibli* also has a multidisciplinary personality like educator, historian, biographer, lawyer, scholar, philosopher, and cleric. His natural product was his poetry and that is why his poetic position reflects a batter of his individual orientation as opposed to other positions. His poetry is in fact an album of Islamic thought that preserves the glorified history of the Muslim world, lamentation over the humiliation and bitter-fate of contemporary Muslims. In case of addressing socio-political issues, awakening to modern education and social reformation, *Shibli* is equal to *Altaf Hussain Hali* and *Allama Iqbal*. He raised his voice against intellectual stagnation, backwardness, and disadvantages of outdated Arabic syllabus and promoted the modern science, philosophy and technical skills as essential part of the education system. His *Mathnawi*, a particular genre of Urdu poetry, *Subh-e Ummid* suffices to clarify the concerned points: -

Ghaflat ne Dobo diya tha Hamko

Taqleed ne Kho diya tha Hamko

Negligence has drowned us

The imitation has vanished us

Daulat se haath Dho chuke the

[1]: Page 13, Shibli Nomani, Prof Akhtarul Wasey and Farhatullah Khan, Al-Blagh Publication, New Delhi 2009

Ham Ilm-o Hunar bhi Kho Chuke the[1]

We had lost the wealth, knowledge and skills

Har Ilm-o Hunar se be khabar ho

Sana't main jo tum shikasta Par ho[2]

You are unaware of all knowledge and skills

You are like a broken wing in art and craft

-

Then in the following couplets he sees an opportunity at Aligarh Muslim University:

Alqissa yeh bat ki thi Tasleem

Yani ke Uloom No ki Taleem

Finally, the matter was settled on the curriculum of modern sciences

Tadbeer Shifa jo hai to ye hai

Is Dukh kid Dawa jo hai to ye hai[3]

This is the only idea to heal, definitely (the modern education) is only remedy for this pain.

Sikhein who Matalib no Aiin

Europe main jo ho rahe hain Talqeen

We need to learn those new concepts that are inculcated in Europe today.

Kepler ki who Noqta Aafrini

Newton ke Masail e Yaqini[4]

We need to look at Kepler's creativity and the accuracy of Newton's questions.

Shibli expressed same views in his Persian poetry as well: -

Hamin yak harf az University Mudda'a Bashad

[1]: Page 3, Masnavi Subh e Ummid, Kulliyat e Shibli, Published in Matba e Maarif Azamgarh
[2]: Page 9, Masnavi Subh e Ummid, Kulliyat e Shibli, Published in Matba e Maarif Azamgarh
[3]: Page 12, Masnavi Subh e Ummid, Kulliyat e Shibli, Published in Matba e Maarif Azamgarh
[4]: Page 13, Masnavi Subh e Ummid, Kulliyat e Shibli, Published in Matba e Maarif Azamgarh

Ke in sar Rishta e Taleem e maa dar dast Bashad

Only this one word is required from the University that this educational system should be in hand.

Uloom o Btazeh ra ba Shar'e o Hikmat ba ham Amezim

Ilaahi, ba Riyaz o Tabi'e Ashnaa Bashad[1]

We must blend modern science with poetry and wisdom.

Oh, my God, one must be conscious of mathematics and nature

Unfortunately, his contemporary *ulama* or clerics and other intellectual personalities virulently opposed his reformist initiatives. Those who preferred to cling to the conventional structure did not tolerate any changes in the status-quo. Neither they were prepared to deal with the socio-political problems of that time nor cared about the community's future. Even they compelled Shibli to resign from the headship of *Madrasa Nadwat al-Ulama*. The great Urdu critic *Aale Ahmad Suroor* describes the situation in the following terms: -

"*Shibli* was disappointed with the new-generation. He felt ulama needed to be modernist and open-minded to better lead the society. It wasn't a bad idea, but the narrow sight Ulama also opposed *Shibli* to remain in *Nadwat ul-Ulama,* also his near friend *Mullah Sadr Yar Jang* couldn't bear little change in the syllabus, and he used to stop *Shibli* at every move of reform. The traditionalist clergy were also against him."[2]

Similarly, a leading and influential critic from *Allama Nomani's* contemporaries, *Maulana Abdul Halim Sharar,* describes this rivalry in the following words:-

"A strong force was working against *Shibli* in *Nadwa,* they are in two classes, one of them strictly following the conventional pattern that never permitted them to exercise their creative skills in current affairs, they stick to their claims, and they are not satisfied with a little change and reformation in the Madrasa curriculum, and the second group are neither scholars nor intellectuals, but they want the popularity among local authorities of

[1]: Page 90, Nazm Muslim University Musalmano ki Khwab e Tabeer, Kulliyat e ShiblI, Maarif Press Azamgarh

[2]: Page 81, Mazmoom Meri Nazr Main Aal Ahmad Suror, Tanqeed Kiya Hai, Maktaba e Jamiya Limited Aligarh 1972

British Government. They actually want the government's token of gratitude by making a large queue of turban holders their followers."[1]

But those who were concerned with the future of society became *Allama Shibli's* companion such as *Maulana Azad*. He was a prominent associate of him. He met Shibli in 1905 in Mumbai, and *Shibli* took him to *Madrasa Nadwa*, where *Maulana Azad* used his scholastic and scientific debate and also where he met *Maulana Hamid Uddin*, a leading expert on Quranic exegesis. *Sulaiman Nadvi* says that this company left a big impact on *Maulana Azad*'s life which gave inspiration to him to start his journal *Al Hilal*. As noted earlier, Azad is a founding member of *Risalat al-Nadwa*, served as the first co-editor of the journal, and his article entitled *'Musalmano ka Zakhira-e Uloom wa* Europe (The Scientific Treasure of Muslims and Europe) was published in the first issue of *Risala*.

In 1913, Shibli resigned from *Nadwat ul-Ulama* and then travelled to Mumbai, Hyderabad and Azamgarh. In Azamgarh, he laid the foundation stone of the last part of his dream, a library known as *Dar al-Musannefin* (The House of Writers). He had shown his immense vision in a report that he drafted for Delhi Session in March 1910. *Shibli* writes:

"As a college, Madrasa and a university play a key role in a community's development; a large library is also a critical necessity in a society. If one wishes to keep alive the Muslims' scientific and intellectual heritage then a large library should be constructed which has a vast collection of books from both science and scholastic streams. This library should be built in the name of whole community. Then everyone, particularly writers, researchers and authors from all over the subcontinent could freely access it."[2]

Finally, Shibli revealed this proposal through the *Al-Hilal* newspaper on 26 February 1914. *Shibli* endowed his bungalow for this library splitting library functionality into two parts on *Maulana Azad's* advice. The "Division A" was responsible for educating the students according to their interest in unique skills. The responsibility for maintaining books and manuscripts was with "Division B".

[1] : Page 199, Shibli Muaserin ki Nazar Main, Dr. Ahmad Zafar Siddiqui, Uttar Pradesh Urdu Academy Lucknow, 2005

[2]: Page 688, Hayat e Shibli, Syed Sulaiman Nadvi, Published by Dar ul Musannefin Azamgarh 1993

In his life full of roller-coaster ride, *Shibli* successfully achieved his targets. He not only initiated reforms that equipped the Islamic society to face all the social, political, religious, or economic challenges. He left a glorious legacy in terms of institutions, academic curriculum, Islamic seminaries, libraries and research institute. Around a century ago the seeds he planted still bear the fruit. This is a moral responsibility to restore his drams.

Bibliography

1- Nomani, Shibli. Kulliyat e Shibli, Published by Matba e Maarif, Azamgarh
2- Nadvi, Ali, Masood. Maqalat e Shibli, Published by Matba e Maarif Azamgarh 1937
3- Nadvi, Syed, Sulaiman. Hayat e Shibli, Published by Dar ul Musannefin, Azamgarh, 1993
4- Siddiqui, Zafar, Ahmad. Shibli Muaserin ki Nazar Main, Uttar Pradesh Urdu Academy, Lucknow 2005
5- Suror, Aal, Ahmad, Tanqeed Kiya Hai, Published by Maktaba e Jamiya, Aligarh, 1972
6- Wasey, Akhtarul and Khan Fathullah, Shibli Nomani, Al-Blagh Publication, New Delhi 2009

Nafisa Amin

Research Scholar

Department of Arabic, Persian, Urdu & Islamic Studies,

Bhasha Bhavana, Visva Bharati.

Blind Owl of Sadeq Hedayat: A Critical Study

Abstract:*The Blind Owl is a masterpiece of literature in Persian language written by a great fiction writer Sadeq Hedayat. It is a haunting tale of loss and spiritual degradation as it covers a life from the beginning of affection of a boy till destination of his suicide. Through this article we will try to find out how it depicts the concern society and even what the impact is actually over there.*

Keywords:*The Blind Owl, Affection, Literature, Suicide, Society*

The Blind Owl (1936) is Sadeq Hedayat's magnum opus and a major literary work of 20th century Iran, a prominent Modernist narrative in contemporary Iranian literature. Written in Persian, it tells the story of an unnamed pen case painter, the narrator, who sees in his macabre, feverish nightmares that "the presence of death annihilates all that is imaginary.[1]

The Blind Owl is a not an easy book to read. A hallucinogenic, opium-soaked account of a lonely pen case illustrator's decent into madness, it is disorienting. Unpleasant. Consumed with death, decay, sexual obsession and frustration. After finishing the last page, it sits heavy in the gut. And then, as you start to unwind the experience, it takes on an eerie, impressive, surreal quality—no less dark—but unlikely to easily slip from the imagination once wedged there.

The Blind Owl was written during the oppressive latter years of Reza Shah's rule (1925–1941). It was originally published in a limited edition in Bombay, during Hedayat's two-year-long stay there in 1937, stamped with "Not for sale or publication in Iran." It first appeared in Tehran in 1941 (as a serial in the daily Iran), after Reza Shah's abdication, and had an immediate and forceful effect. It was later banned, reportedly because it led readers towards suicide.[2]

---

[1] Sadeq Hedayat, The Blind Owl, Bashiri Working Papers on Central Asia and Iran, 2013, P. 55

[2] Farahbakhsh, Alireza; Haghshenas, Saleh (2014-12-23). "Exploring Bergsonian time in Sadeq Hedayat's The Blind Owl". Journal of European Studies. 45 (2): 93–105.

It is believed that much of the novel had already been completed by 1930 while Hedayat was still a student in Paris. Being inspired by European ideologies, the author challenges the traditions and as a result, the work is the representation of modern literature in Iran.[1]

One of the most revered names in Iranian literature, Sadeq Hedayat left behind an oeuvre that is mesmerising, petrifying and puzzling. Dubbed the father of 'psycho-fiction', or the Iranian Franz Kafka, he is best known for his haunting The Blind Owl, a novel telling of death, loss and psychosis. We bring you Dr. Homa Katouzian's introduction to Sadeq Hedayat's The Blind Owl, his dramatic life and other works.

Sadeq Hedayat was born on 17 February 1903 and died on 9 April 1951. He was descended from Rezaqoli Khan Hedayat, a notable 19th century poet, historian of Persian literature and author of Majma' al-Fosaha, Riyaz al-'Arefin and Rawza al-Safa-ye Naseri. Many members of his extended family were important state officials, political leaders and army generals, both in the 19th and 20th centuries.

Hedayat is the author of The Blind Owl, the most famous Persian novel both in Iran and in Europe and America. Many of his short stories are in a critical realist style and are regarded as some of the best written in 20th century Iran. But most original contribution was the use of modernist, more often surrealist, techniques in Persian fiction. Thus, he was not only a great writer, but also the founder of modernism in Persian fiction.[2]

In the early 1930s, Hedayat drifted between clerical jobs. In 1936 he went to Bombay at the invitation of Sheen Partaw, who was then an Iranian diplomat in that city. Predictably, he had run afoul of the official censors, and in 1935 was made to give a pledge not to publish again. That was why when he later issued the first, limited edition of The Blind Owl in Bombay, he wrote on the title page that it was not for publication in Iran, predicting the possibility of a copy finding its way to Iran and falling into the hands of the censors.

During the year in Bombay, he learnt the ancient Iranian language Pahlavi among the Parsee Zoroastrian community, wrote a number of short stories and published The Blind Owl in 50 duplicated copies, most of which he distributed among friends outside Iran.

Hedayat would have had a lasting and prominent position in the annals of Persian literature on account of what I have so far mentioned. What has given him his unique place, nevertheless, is his psycho-fiction, of which The Blind Owl is the best and purest example. This work and the short story 'Three Drops of Blood' are modernist in style,

---

[1] Coulter, Yasamine C. "A Comparative Post-Colonial Approach to Hedayat's The Blind Owl." CLCWeb: Comparative Literature and Culture 2.3 (2000)

[2] https://therumpus.net/2010/10/why-i-love-sadegh-hedayats-the-blind-owl/ (21-07-2020)

using techniques of French symbolism and surrealism in literature, of surrealism in modern European art and of expressionism in the contemporary European films, including the deliberate confusion of time and space.

Translation of The Blind Owl:

The Blind Owl was translated into French by Roger Lescot during World War II, apparently with Hedayat's knowledge and approval, and published as La Chouette Aveugle (1953), and later by Pasteur Vallery Radot, a member of the French Academy. The book was well received in the French literary circles.In Germany, two translations appeared in the early 1960s. The first, entitled Die Blinde Eule, was translated by Heshmat Moayyed, Otto H. Hegel and Ulrich Riemerschmidt directly from the Persian; the second, in East Germany, was translated by Gerd Henniger from the French version. The Blind Owl.jpg In Turkey, The Blind Owl was translated from Persian to Turkish in 1977 by the very famous Turkish poet Behçet Necatigil, under the title "Kör Baykuş".

The Blind Owl was translated into English by D. P. Costello (1957), by Iraj Bashiri (1974, revised in 1984 and again in 2013), and by Naveed Noori (2011).

In Poland The Blind Owl was translated from the Persian original by late specialist in Iranian studies, Barbara Majewska, Ph.D. It appeared under the same-meaning title "Ślepa sowa" twice. First in the respectable literary quarterly Literatura na Świecie (No 10(90), Warszawa, October 1978, pp. 4–116); then as a separate book (Warszawa, 1979).

In Urdu the novel has been translated by Ajmal Kamal with the original name Boof-e-Kor. Many of Hedayat's short stories have also been translated into Urdu, mostly by Bazl-e-Haq Mahmood, who published one volume of his short stories as Sag-e-Awara (Sag-e Velgard).

In India, two translations appeared in the Malayalam language. The first, entitled Kurudan Moonga, was translated by the famous novelist late Vilasini. The second, entitled Kurudan Kooman was translated by S. A. [Qudsi] and published by Mathrubhumi Books in 2005; second edition has been published by DC Books in 2011.

Film on The Blind Owl:

The novel was made into a film in 1974 (Boof-e-koor AKA The Blind Owl available on YouTube), directed by Kimuras Derambakhsh, starring Parvez Fanizadeh, Farshid Farshood and Parvin Soleimani.[1] It was also made into the 1987 film The Blind Owl directed by Raúl Ruiz.[2]

It was adapted into a 2018 feature film, The Blind Owl: Boofe Koor by Iranian Canadian Mazak Tayebi.[3]

---

[1] https://www.imdb.com/title/tt0343502/ (21-07-2020)

[2] https://www.imdb.com/title/tt0092755/?ref_=nm_flmg_wr_8(16-06-2020)

[3] https://www.imdb.com/title/tt3455206/ (23-07-2020)

Initially "The Blind Owl" banned in Iran, The Blind Owl follows the nightmarish visions of its narrator. Following this logic, the narrative is hallucinatory, surreal and fractured. The opening line of the novel gives the reader a sense of the tone that can be expected:

"There are sores which slowly erode the mind in solitude like a kind of canker."

Solitary, misanthropic and mad, the narrator is certainly not about to tell a pleasant story. The Blind Owl, non-linear in its construction, sees the narrator with the body of his dead wife. In his madness, it's not immediately clear to him (or us) how he got into this situation. This section also sees some fine, evocative writing – which could be taken as a comment on how Iranian society dealt with gender relations at the time. Certainly, Hedayat was highly critical of the repression that he saw in Iran at the time he was writing. When we are first introduced to the woman, he describes her thusly:

"To me she was a woman and at the same time had within her something that transcended humanity. When I looked at her face, I experienced a kind of vertigo which made me forget the faces of all other people. Gazing at her, I began totremble all over and my knees felt weak. In the depths of her immense eyes I beheld in one moment all the wretchedness of my life. Her eyes were wet and shining like two huge black diamonds suffused with tears. In her eyes, her black eyes, I found the everlasting night of impenetrable darkness for which I had been seeking and I sank into an awful, enchanted blackness of that abyss. It was as though she was drawing some faculty out of my being. The ground rocked feet and if I had fallen, I should have experienced an ineffable delight." [1]

Symbolism of Woman in The Blind Owl:

He expresses the intolerable perplexity of woman as a focus of appearance and reality. But this distrust of women is not misogyny. It is a result of profound pondering of problems of human nature and being. Hedayat's association of women with death, his inability to deal with realism through the dreadfulness of the tragic, and a paranoid attitude accompanying his inability to tolerate and accept his own mortal reality, indicates a form of dissociation from reality which serves as a clue to his existence problem.

In "the Blind Owl" the write fails to establish existential authenticity and freedom. This is because his view of self, others and the world in general, in his struggle through re-birth, is dominated by his rejection of his female elements of being and knowing. Such rejection is mainly due to his own schizoid problem, but it is also magnified by the prevailing attitudes toward women in his native country.[2]

This passage was interesting for what it contained and what came after it. As it opens, I was given the dizzying sensation of someone truly in love, beholden to the

[1]) https://solarbridge.wordpress.com/2010/08/28/the-blind-owl-sadeq-hedayat/ (23-07-2020)
[2] http://www.iranchamber.com/literature/articles/women_hedayat_blind_owl.php (12-07-2020)

person they are looking at. As it progresses, though, we clearly get an insight into the damaged psyche of the narrator. The imagery and choice of words implies less love and devotion than it does a dangerous obsession and gives further insights to his world view. We learn that, actually, the woman is dead and, as he puts things she "had surrendered her body to me. She had given me her body and her soul." The darkness of the imagery is continued:

"Her fragile, short-lived spirit, which had no affinity with the world of earthly creatures, had silently departed from under the black, pleated dress, from the body which had tormented it, and had gone wandering in the world of shadows and I felt as though it had taken my spirit with it. But her body was lying there, inanimate and still. Her soft, relaxed muscles, her veins and sinews and bones were awaiting burial, a dainty meal for the worms and rats of the grave.

In this threadbare, wretched, cheerless room which itself was like a tomb, in the darkness of the everlasting night which had enveloped me and which had penetrated the very fabric of the walls, I had before me a long, dark, cold, endless night in the company of a corpse, of her corpse. I felt that ever since the world had been the world, so long as I had lived, a corpse, cold, inanimate and still, had been with me in dark room."[1]

This continues the dark, deathly imagery. Not particularly comfortable reading but unquestionably effective.

For all that these parts of the novel are serious, it does actually have a strand of humour running through it. Inky-black humour to be sure, but humour nonetheless. His attempts to bury the body and the "trial by cobra" described half-way through the book though in keeping with the tone of the novel, are not, I think, infused with the same seriousness.

Conclusion:

The author is intelligent enough when he writes about his own feelings as he gives much detail about it and in some instances, he also respects the events for letting reader go deeply in to the novel and as the reader are with them, but it seems he does not succeed when he tried for executing the freedom as human being and faith in existence. So we can say this novel is completely impacted by Iran and his trip to India and France.

[1] ibid

Tarique Jameel Ansari
Research Scholar
Department of Museology AMU, Aligarh

History of Aligarh Heritage - 2

MUZAMMIL MANZIL

ABSTRACT

Muzammil Manzil is one of the oldest heritages building of Aligarh city. It was built by Nawab Sir Muhammad Muzammilullah Khan, Khan Bahadur. He was a noted Zamindar and politician from United Province of British India. He was former Vice Chancellor of Aligarh Muslim University.

Nawab Muzammilullah khan Sherwani was one of the trustees of Muhammadan Anglo-Oriental College, Aligarh in 1886 and a fellow of Allahabad University. He was one of the Old Party leaders of All India Muslim League and staunch opponent of Young Party faction. He was one of the signatories to the 1906 Muslim Memorial and was involved in 1909 agitation for separate electorates for Muslims and was among the member of all-India delegation of Muslims led by Sir Aga Khan III to meet with Viceroy Lord Minto in order to demand a separate Legislative Council for Muslims. He held his estate in Bhikampur in Aligarh district[1].

[1] ALIGARH GAZETTEER

He was nominated member of United Province Legislative Council for the years 1916-19. Also, a member of Viceroy's Council of State and twice home member of United Province government.

He served as Secretary of the Zamindars' Association, United Provinces and was also made Special magistrate by the government. He also served as president of UP Muslim Defence Association in 1917[1].

He was made Khan Bahadur in 1904 and given personal title of the Nawab in 1910. He was appointed an Officer of the Order of the British Empire in the 1919 New Year Honours, and invested as a Knight Commander of the Order of the Indian Empire in the 1924 New Year Honours.he died in 1935.

Midhatullah Khan Sherwani

The President of India, in his capacity as the visitor of the Aligarh Muslim University, has nominated Mr Midhatullah Khan Sherwani, former officer of Indian Revenue Service (IRS) to the University's Executive Council for a period of three years with immediate effect.

[1] Landlord of Muzammil Manzil

Mr.Midhatullah Khan Sherwani is the son of Nawab Rahmatullah Khan who served the University as a Pro-Chancellor.Mr.Midhatullah Khan Sherwani's family has a long association with AMU. His grandfather NawabMuzammilUllah Khan Sherwani had also enjoyed the distinction of being appointed University's second Vice-Chancellor in 1923. NawabMuzammilUllah Khan Sherwani was a close associate of Sir Syed Ahmad Khan, founder of the University. Muzammil hostel in ViquarulMulk Hall is named after him.

Nawab Midhatullah khan sherwani is the present owner of the historical building known as MUZAMMIL MANZIL.MuzammilManzil built in1904 and it was completed 1908.it is the residential building of his family.

In 1904 than it starts from that time labour charges are 5 Ana/day. used in building material baked brick and lime. brick came from his own factory at Bhikhampur. Wall height of the building 30 fit. And more than 27 inch's wide of every wall.

Now at this time 5 member live there. NawabMidhatullah khan sherwani himself and his wife Samansherwani and 3 kids. Flowing their names-

1) Lamiasherwani

2) Nailasherwani

3) Wasifullah khan sherwani

On the other hand, they have an unique collection of books on his library. Collection of the library is 2170 books at present[1].

In 2002 built a school on the premise on the kothi, MuzammilManzil.the name of the school is Blossom school. Now at the time more the 700 student enrolled at present[1].

[1] Field survey of Muzammil Manzil building

Bilal Ahmad Shiekh
Research Scholar
Department of Persian
School of Arts, Languages and literature
University of Kashmir

MAJMA-UL-BAHRAIN: A VOICE OF HINDU MUSLIM UNITY

ABSTRACT:

Dara Shikoh the crowned prince and son of Mughal emperor Shah Jahan was an incredible scholar of seventeenth century who raised the voice of Hindu Muslim unity through his scholarly works in Persian language. He created a great image in literary world by his comparative study of Islamic mysticism and classical Hindu philosophy. He researched Hindu spirituality and Islamic mysticism and highlighted the commonness among these two religions. He always preached the religious tolerance, which leads to religious concord and universal brotherhood among commonalty. As a voice of Hindu Muslim unity Dara Shikoh wrote "Mujma-ul-Bahrain" which means "mingling of two oceans".it highlights the common concepts, regarding monotheism and spirituality among these two religions, so that a healthier atmosphere could be produced for Hindu Muslim unity in India. Presently the people who live in country like India need to follow the teachings of Dara Shikoh for the peace and prosperity of their nation.

Key Words: Majma-ul-Bahrain, Islam, Mysticism, Spirituality, Hindu Philosophy, Monotheism, Discourse.

INTRODUCTION:

Dara Shikoh, the author of "Majma-ul-Bahrain" is the eldest son of Mughal emperor Shah Jahan and was a great scholar of his age. He from his childhood

[1] Survey at library of Muzammil Manzil

was interested in studies, especially Sufism, comparative religions, poetry etc. he not only studied ancient Indian religious literature like Vedas and Upanishads bur also had a good knowledge of Jewish and Christian religious literature.

Dara Shikoh disciple of Qadari sect of Islamic mysticism studied the Sufistic literature of all other sects and has gathered in himself a lot of knowledge regarding spirituality and monotheism. But it was not all for him and it cannot crunch his thrust of knowledge. He started studying Hindu philosophy and searched monotheism in it. At last he concluded that both the religions lead to one God. Majma-ul-Bahrain was result of this deep analysis of Hindu and Muslim spirituality.

Majma-ul-Bahrain or the "mingling of two oceans" authored by Prince Dara Shikoh Qadari was completed in year 1065 A.H, when he was forty two year old. This is known from the last sentence of this book where Dara thanks almighty on its completion and writes the date of its completion. This book on comparative religions was unique of its kind and was work of utmost interest to the reader of comparative religions. It is also a pioneering attempt to build on the similarities between certain strands of Hindu monotheistic thought and Islamic mysticism. This book was translated in different languages like Hindi and English, its Hindi version is called "Samundar Sungam" and English version called "mingling of two oceans".

Dara Shikoh divided Majma-ul-Bahrain into twenty two sections and in every section he seeks to draw out the commonness between Islam and Hinduism. Dara while introducing this book writes, "according to his own inspiration and taste, for the members of his family", and further says," I have nothing to do with the common folk of both the communities."

He starts this marvelous work with the beautiful of almighty, says;

بنام آنکہ او نامی ندارد

بہر نامی کہ خوانی سر بر آرد

After praising Almighty Dara quotes the verse from Hakim Sanai's "Hadikat-ul-Hakikat" as;

کفر و اسلیم دو رہش پویان

وحدۃ لاشریک را گویان

It states that Islam and infidelity both are two ways galloping towards Almighty who shares no kinship and He is unique in relations.

Dara Shikoh in this piece of work express his sentiments freely, "Mysticism is equality", he says, "It is abandonment of religious obligations". Dara while expressing his attitude quotes Khawaja Ahrar, who said, "If I know that an infidel, immersed in sin, is in a way singing the note of monotheism, I go to him, hear him and am grateful to him." He clearly says that my work which is based on my own research and inspiration is distasteful to certain worthless fellows, I entertain no fear on that account and Allah is sufficient for me in this regard. There is a lot of differences between these two religions which cannot be denied but there are certain identical enunciations also present in these two religions which are defined by Prince Dara Shikoh in this worthy book.

Dara Shikoh discussed deeply twenty two similar subjects of Islam and Hindu philosophy in "Majma-ul-Bahrain". Some among them may be discussed here so that we can know how he raised the voice for Hindu Muslim unity in India.

1. **Discourse on the soul (*Ruh*):-** The soul is of two types, common soul and soul of souls, which are called *atma* and *paramatma* respectively in the phraseology of the Indian divines. And the self that was determined in Eternity past is known as *Ruh-i-Azam* and is said to possess uniform identity with the omniscient Being. Now the soul in which all the souls are included is known as *paramatma* or *Abul-Arwah*. In this description of soul Dara Shikoh tries to define that the concept of soul is identical in Islam and Hind philosophy. There is only the difference of words. This concept brings commonness among these two communities.
2. **Discourses on the four worlds:-** according to certain Sufi's the worlds are four in number like, *Nasut* (the Human world), *Malkut* (the Invisible world), *Jabarut* (the Highest world) and *Lahut* (the Divine world); but some other add(the world of Similitude) (*Alam-i-mithal*) to them. According to Indian divines, the world's here are also four in number namely, *Jagart*, *Sapan*, *Sakhupat* and *Turya*. *Jagart* is identical with Nasut, which is the world of manifestation and wakefulness. Sapan is identical with Malkut, which is identical with *Jabrut*, in which the traces of both of the world's disappear. *Turya* is identical with Lahut, which is Pure Existence, encircling, including and covering all the worlds. Dara Shikoh through this concept of sameness in Hindu Muslim thought regarding these four worlds tries to convenience the people of both the communities that the commonness among these concepts gives the massage of unity. And it must be accepted and followed.
3. **Discourse on the senses: -** corresponding to these five elements, there are five senses called *Pang Indri* in Indian language. They are,(1) *Shamma* (smelling), (2) *Dhaika* (testing), (3) *Basira* (seeing), (4) *Sami'a*

(hearing) and (5) *Lamisa* (touching), which are called *gahrain* (nose), *rasna* (tongue),*chach* (eye), *sarutar* (ear) and *tvak* (skin) respectively, in the Indian language , and their qualities of perception and named *gandh* (smell), *ras* (taste), *rup* (color), *sabd* (sound) and *spare* (touch). It states that the concept of senses in both the communities is identical and common. So there is no difference here and unity clearly prevails in this concept.

4. **Discourse of *Mukt* (salvation):-** Mukt means the annihilation and disappearance of determination, in the self of the lord, as it appears from the holy verse, "And best of all is Allah's goodly pleasure that is the grand achievement". Mukt is of three kinds, first, *Jiwan Mukt* or salvation in life. According to the Indian philosophy, Jiwan Mukt consists in one's attainment of salvation and freedom, by being endowed with the wealth of knowing and understanding the truth. In simple words *Jiwan Mukt* is that freedom of human beings which is attained through the knowledge and understanding of truth that is the Holy God. Second is *Sarab Mukt*, or the liberation from every kind of bondage, consists in absorption in His Self. This salvation is universally true in the case of all living beings and after the destruction of the whole universe; it will attain the salvation by annihilation in the Self of the Lord. Thirdly, *Sarbada Mukt*, or later salvation, consisting in becoming an Arif (knower of God) and in attaining salvation, in every stage of "Progress" (sair) whether the progress be made in the day or the night. And finally and certainly, there is a handsome reward for the arifs namely (Firdous-i-ala) grand paradise and that will stay in it for ever. So Dara Shikoh in this chapter of his book speaks that Mukt (salvation) is identical among these two religions authenticated by the Holy verses of *Kuran* and *Vedic* and *Upnashadic* literature.
5. **Discourse on the Resurrection (*kiyamat*):-** The Indian monotheists have held that, after a very long stay in Heaven or Hell, the *mahapali*, or the Great Resurrection, will take place, which is also authenticated by the Holy verses of Kuran. Kuran says that the last day of this world will destroy the Universe. So it is believed by both the communities that at the end of this Universe, the Doomsday will come and everything will be destroyed and vanished; only the Lord of this Universe will remain as He is. Dara Shikoh's explaining states that both the communities have common faith regarding the last day of Universe. And the commonness among these faiths shows the path of Hindu Muslim unity in India.
6. **Discourse on the Devotional exercises (*Ashghal*):-** Dara Shikoh while describing this subject writes that according to the Indian monotheists,

there are several devotional exercises, yet they regard *ajpa* as the best of all. This exercise originates in all living beings, both in sleep and wakefulness, without any will or control. This concept according to Dara Shikoh is also mentioned in Holy Karan, "And there is not a single thing but glorifies Him in His praise, but you do not understand their glorification". Dara in reference with the Sufi's says that while you enhail breath, Hu appearing and Allah while exhaling. It means that you utter these words when you are unconscious, doing nothing, in sleep or elsewhere. Dara makes a ground for Hindu Muslim unity by describing that both the religions believe that all living beings do these devotional exercises unconsciously. Faithful beings believe in unity and unity is propagated by Dara Shikoh while explaining this subject.

7. **Discourse on sound (*awaz*):-** this subject described by Dara Shikoh is common in the belief of Hindu and Muslim community. Sound emanates from the same breath of the merciful which came out with the word *Kun*, (or, be) at the time of creation of the universe. The Indian divines call that sound *sarasti*. The Muslim believe that the eternal sound is *Ism-a-Azam* and it is the source of all sound and Hindus call it *Anahut*, which has been in eternity past, is so at present, and will be so in future. Dara Shikoh as a propagator of unity among these two communities describes the uniqueness of thought on this subject so that an atmosphere of unity may be created in India.
8. **Discourse on the skies (Asmanha):-** Dara Shikoh while trying to show the similarities in Muslim and Hindu religions, define the discourse on the skies. He says that according to the Indians, the skies, which are called *Gagan*, are eight in number. Among these, seven are the stations of seven planets namely Saturn, Jupiter, Mars, Sun, Venus, Mercury and the moon. In the Indian language, they are called seven *nichattars*, which are *sanichar*, *birahspat*, *mangal*, *sura*j, *sukur*, *budh* and *chandermas*. The eighth is known as "the spare of fixed stars" (falak-i-thawabit), while the Muhammadan religious doctors (ahl-i-shar) designate it *Kursi* in their own phraseology. Kuran explains, "His *Kursi* (throne) extends over the heavens and the earth.
9. **Discourse on the Division of the earth (kismet-i-zamin):-** Dara Shikoh discussed this subject to make clear his statement that there is only the difference of words in Muslim and Hindu thought. In this chapter says that the learned men have divided the inhabited globe into seven parts known as "seven spheres" (Haft Ikleem), which the Indians name *Sapatidip*. They do not consider the seven spheres as the layers of an inion; rather they conceive them as the steps of a ladder. And the seven

mountains, which the Indians call sapat *kulachal*, are regarded by them as surrounding every sphere. Accordingly Kuran says, "And the mountains are projection thereon" i.e., on the earth. As per Indian thought, round each of seven mountains there are seven seas, which are surrounding each mountain. They are called *Sapat Samundar*. The seas are seven in number is also mentioned in Kuran like, "And were every tree that is in the earth (made into) pens and the sea (to supply it with ink), with seven more seas to increase it, the words of Allah would not come to an end". He further discusses Heaven and Hell (Jannat and *Jahannam*), Hindu used (*sarag* and *narag*) terms for these, in this chapter of his book.

As discussed earlier that Dara Shikoh explained twenty two similar subjects of Islam and Hindu philosophy in order to make clear from his point of view that these two religions are going to same destinations. Due to the limitations of this paper I can't explain all of them here, which are as, discourse on the Elements, discourse on the attributes of God, the most High (sift-i- Allah tallah), discourse on the Air (bad), discourse on the Light (*Nur*), discourse on the vision of God (*Ruyat*), discourse on the names of God, the most High (*asmai Allah tallah*), discourse on the *Barhmand*, discourse on Directions, discourse on the world of *Barzakh* (i.e., interval between the death of a man and the Resurrection), discourse on Apostleship and Saint ship (*Nubuwwat wa wilayat*), discourse on the Day and Night (*Ruz wa Shab*), discourse on the on the infinity of the cycles.

Conclusion: - Dara Shikoh in his search of truth found some similarities in Hindu Muslim religious thought which can't be denied because of their authenticity. But it is obvious there are a lot of differences in these two religious thought which can't also be denied. His main focus to do this work was search of truth and unity of these communities. He, by his liberal religious attitude worked incredibly against worst, illogical and unethical religious intolerance and did a great job for unity and communal harmony among these two communities. In present scenario, india, which claims a secular country need to fallow the best policy of unity preached by this great scholar of 17th century for goodness of their country.

Bibliography:

1. Shakeel-Ur-Rehman, Mohammad Dara Shikoh (Aak Taruf), Urfi Publications, 2012.
2. Dara Shikoh, MMS Majma-ul-Bahrain, Acc. No.346, Farsi, Moulana Azad Lib. Aligarh, U P.

3. Dara Shikoh, Majma-ul-Behrain Edited and translated by M. Mahfouz-ul-Haq, Asiatic Society of Bengal, Calcutta, 1929.
4. K.R. Qanungo, Dara Shikoh: Biography, Calcutta 1935.
5. B.J. Hasrat, Dara Shikoh; Life and Works, Calcutta, 1935.
6. Sheikh Sana'i, Hadikat-ul Hakikat.
7. Syed Mohammad Islam Shah, Dara Shikoh Kay Mazhabi Akayad, Lahore, 1968.
8. Syed Sabah-u-Din Abdul Rehman, Bazm-i-Taymoriya, vol.2, Matbah Muarif, Azam Grah.
9. S. M. Jaffar, The Mughal Empire from Babar to Aurangzeb, Ess Ess Publications, Delhi-52

Research journals & Papers:

1. Shahid Latif & Abdul Qadir Mushtaq, Dara Shikoh: Mystical and Philosophical Discourse, International Journal of History and Research (IJHR) ISSN 2249-6963, vol.3, Issue 2 June 2013.
2. International Journal of History and Research. ISSN 2249-6963, Vol 2.